Registered No. L. 5340

جلد ۳۴

ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ

عدد ۲، ۳، ۴، ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/-	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۳/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۱/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-		
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-		
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۳	دین حق	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۳	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	ایک اہم استفتا	-/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	/۳/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
تفہیمات	۳/۸	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
حقیقت توحید	۱/۲	جماعت اسلامی کی دعوت، بغاوٴ بگاڑ فی -/۹/-	
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-	حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
اسلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
دین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵۔ الف ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور (پاکستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پانچ دن کم بیس مہینے کی جبری غیر حاضری کے بعد میں اور میرے دونوں رفیق ۲۸ مئی سنہ ۵۰ء کو پھر اسی زندگی کی طرف واپس آگئے جس سے ۴ اکتوبر سنہ ۴۸ء کو ہمیں خارج کیا گیا تھا۔ اس مدت میں جن وجوہ سے ہم قید رکھے گئے اور اس سے پہلے ہم کو قید کرنے کے لئے جس جس طرح زمین ہموار کی گئی تھی، اس کے متعلق اب کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ ساری باتیں ان صفحات میں بیان ہو چکی ہیں۔ اور ویسے بھی ترجمان القرآن کے ناظرین اس کے محتاج نہیں ہیں کہ انہیں اس معاملہ کچھ بتایا جائے، کیونکہ اس ملک میں ان سے زیادہ میرے جرم کا جاننے والا اور کوئی نہیں ہے۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ پچھلے ۱۷-۱۸ سال سے میں کیا کچھ کرتا رہا ہوں۔ اسی طرح مولانا امین احسن صاحب اور میاں طفیل محمد صاحب کے جرائم بھی سب سے بڑھ کر انہی کے مشاہدے میں آتے رہے ہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ہماری گرفتاری کی خبر پاتے ہی سارا معاملہ خود سمجھ لیا ہوگا۔ شاید ان میں سے کسی کو بھی پہلی مرتبہ یہ سن کر حیرت نہ ہوئی ہوگی کہ ہم پکڑے گئے، بلکہ اگر وہ کبھی حیران ہوئے ہوں گے تو اس بات پر کہ آخر شیطان اتنی مدت تک ہم جیسے قصورواروں کو برداشت کیسے کرتا رہا۔

اس موقع پر اپنی ذات کے متعلق میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی ۴۷ سال کی عمر کا تقریباً دو تہائی حصہ مطالعہ و تحقیق اور غور و فکر میں صرف کیا ہے۔ اس تیس سال کی مدت میں پڑھ کر، سن کر، سوچ کر، سمجھ کر اور مشاہدہ و تجربہ کر کے میرے ذہن کا ایک خاص سانچہ بن چکا ہے، میری زندگی کا ایک نصب العین قرار پا چکا ہے، میری فکر کا ایک خاص انداز اور سوچنے کا ایک خاص طرز قائم ہو چکا ہے۔ میں کچھ رائیں رکھتا ہوں جن کی پشت پر برسوں کے مطالعہ سے فراہم کئے ہوئے دلائل ہیں۔ میں نے کچھ چیزوں کو حق پایا ہے اور ان پر میں پورے قلبی و دماغی اطمینان کے ساتھ ایمان لایا ہوں۔ اور کچھ چیزوں کو میں نے باطل پایا ہے اور ان کو

قلب و دماغ کے متفقہ فیصلہ کے ساتھ رد کرچکا ہوں۔ میرے ذہن اور ضمیر کے یہ فیصلے میری ذات کی حد تک بھی محدود نہیں رہے ہیں بلکہ میں برسوں سے ان کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ ہزاروں آدمیوں کو میں نے اس نصب العین کی طرف کھینچا ہے جسے میں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ ہزاروں کو اس حق کا قائل کیا ہے جس حق کا میں خود قائل ہوا تھا۔ ہزاروں کا رشتہ اس باطل سے کٹوایا ہے جس سے میں نے خود اپنا رشتہ کاٹا تھا۔ اور ہزاروں بندگانِ خدا کی زندگیوں کو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی اُس جدوجہد میں مبتلا کر دیا ہے جس میں میں خود مبتلا ہوں۔ اب اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ میرے ذہن اور خیالات اور مقصدِ زندگی، ہر چیز کو محض طاقت کی دھونس اور جیل کی دلیل سے بدلا جا سکے گا تو میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا صحیح مقام ایوانِ حکومت نہیں بلکہ شفاخانہ امراضِ دماغی ہے۔ اور اگر اس نے یہ توقع قائم کی تھی کہ اس دباؤ میں آکر میں اپنا ضمیر اُس کے ہاتھ رہن رکھ دوں گا اور آئندہ سے راشن کتے برتے خیالات ظاہر کرنے لگوں گا، تو میں اس کو مطلع کرتا ہوں کہ اس نے میری سیرت کو اپنی سیرت پر قیاس کرنے میں غلطی کی ہے۔ میرا دل صداقت کے لئے تو ہر وقت کھلا ہوا ہے اور میری ہر رائے کو علمی و عقلی دلائل سے بدلا جا سکتا ہے لیکن میرا ایمان و ضمیر کوئی قابلِ بیع و رہن چیز نہیں ہے۔ اس کی کوشش پہلے بھی جس نے کی ہے ناکام ہوا ہے اور آئندہ بھی جو کرے گا انشاء اللہ منہ کی کھائے گا۔

ممکن ہے اس کارروائی کا فیصلہ کرتے وقت یہ مقصد بھی پیشِ نظر رہا ہو کہ اس طرح اُس کام کو روکا جائے جو میں اور میرے ساتھی کر رہے تھے۔ اگر میرا یہ قیاس درست ہے تو میں کہوں گا کہ اس مقصد کے لئے ہماری گرفتاری کا فیصلہ کرنے والے خود ایک غلط فہمی میں گرفتار تھے اور مجھے امید ہے کہ اب ان کی غلط فہمی دور ہو گئی ہوگی۔ انہوں نے شاید یہ سمجھا تھا کہ جماعت اسلامی چند مٹھی بھر سر پھروں کی ایک جماعت ہے جو اتفاقاً جمع ہو گئی ہے اور اس کا سارا کام بس دو تین آدمیوں کے بل پر چل رہا ہے، اُن کو میدان سے ہٹا دیا جائے گا تو جماعت ختم اور اس کی دعوت نسیاً منسیاً ہو جائے گی۔ اس غلط گمان کی بنا پر انہوں نے ایک غلط قدم اُٹھا دیا اور ٹھوکر کھائی۔ اب اگر انہوں نے خود اپنے اقدام کے نتائج کا جائزہ لیکر دیکھا ہوگا تو ان پر منکشف ہو چکا ہوگا کہ اس حرکت سے جو فوائد وہ اٹھانا چاہتے تھے ان میں سے کوئی فائدہ بھی نہیں حاصل نہیں ہو سکا ہے اور جن

نقصانات سے وہ بچنا چاہتے تھے وہ سب مع شے زائد ان کو پہنچ گئے ہیں۔ اگرچہ میں اِن حضرات کی عقل و دانش کے بارے میں کچھ بہت زیادہ خوش گمان نہیں ہوں۔ تاہم میں توقع رکھتا ہوں کہ اس تجربے کے بعد وہ جماعت اسلامی اور اس کی تحریک کو، اور اُن بنیادوں کو جن پر یہ تحریک قائم ہے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں گے اور آئندہ کوئی قدم ناکافی معلومات اور سرسری اندازوں کی بنا پر نہ اٹھائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی تحریک کوئی وقتی اور ہنگامی چیز نہیں ہے جو محض کسی ایک شخص کی پکار پر یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی ہو۔ اس طرح کی ایک سطحی رائے قائم کر کے جو معاملہ بھی اس کے ساتھ کیا جائے گا وہ مفید نتیجہ پیدا نہ کرے گا۔ صحیح معاملہ، یا کم از کم معقول معاملہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پس منظر کو اور اس کی اصلیت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

دراصل اس ملک میں دو مستقل مدارس فکر پائے جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے پیچھے ایک لمبی تاریخ ہے۔ ہر ایک کو بہت سے اخلاقی، ذہنی اور تمدنی اسباب نے پرورش کیا ہے۔ ہر ایک کی جڑیں ہماری سوسائٹی میں دُور دُور تک پھیلی اور گہری جمی ہوئی ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ دوسرے کو پھونک مار کر اُڑا دے۔

ایک مدرسۂ فکر وہ ہے جو مغرب کے سیاسی، علمی، اخلاقی اور معاشی غلبہ سے ہمارے اندر پیدا ہوا ہے۔ اس میں مختلف رجحانات کے لوگ موجود ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو عقیدہ و عمل دونوں میں اسلام سے منحرف ہو چکے ہیں اور اس بات کو نہیں چھپاتے کہ انہیں اسلام کی پیروی منظور نہیں ہے۔ کچھ وہ ہیں جن کا انحراف تو قریب قریب اسی درجے کا ہے مگر سر دست منافقت اور مکاری کے ساتھ وہ اسلام کے ترجمان اور علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو اسلام کو بالکل چھوڑ دینا تو نہیں چاہتے مگر پورے اور اصلی اسلام کو قبول کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں بلکہ اپنے مذاق و رجحان کے مطابق ایک نیا اسلام بنانا چاہتے ہیں جس میں اصلی اسلام کی صرف وہ چیزیں باقی رہ سکتی ہیں جو ان کو پسند ہوں۔ ان مختلف رجحانات کے لوگوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان کی نگاہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر معیار حق وہ افکار، اقدار اور اطوار ہیں جو مغربی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر انہوں نے اختیار کئے ہیں اور خدا و رسول کی ہدایت ان کے لئے حجت نہیں ہے کہ جو کچھ اُس سے ثابت ہو وہ اس کے آگے سر جھکا دیں۔ اس مدرسۂ فکر کے لوگ اگرچہ تھوڑے ہیں، اور ہمارے عوام کے دل و دماغ

ان کے ساتھ نہیں ہیں، لیکن زمام کار اس وقت انہی کے ہاتھ میں ہے کیونکہ انگریزی اقتدار کے دور میں آگے بڑھنے کے جتنے مواقع بھی ملے زیادہ تر انہی کو ملے اور چلتے وقت انگریز نے اپنی میراث بھی اپنے اس خلف الصدق گروہ کو سونپی۔

دوسرا مدرسۂ فکر وہ ہے جو اسلام کی اندرونی قوت حیات کے نتیجے میں ہمارے اندر پایا جاتا ہے۔ اس میں بھی اگرچہ مختلف رجحانات کے لوگ موجود ہیں جن کے درمیان جزئیات و فروع اور مذاقِ طبیعت کے لحاظ سے بہت کچھ اختلافات ہیں، مگر قدرِ مشترک ان سب کے درمیان یہ ہے کہ وہ اسلام ہی کو اپنے لئے نظامِ زندگی کی حیثیت سے پسند کرتے ہیں اور تمام معاملاتِ زندگی میں اس ہدایت کو حجت مانتے ہیں جو خدا و رسول سے ثابت ہو۔ یہ مدرسۂ فکر انگریزی اقتدار کے پورے دور میں مغلوب و مقہور رہا، نشوونما کے ذرائع سے محروم رہا، ہر شعبۂ زندگی میں زمامِ کار سے بے دخل رہا، اور اب بھی کم و بیش اس کا یہی حال ہے۔ لیکن اسلام کے وہ تمام اخلاقی و روحانی، ذہنی و فکری، اور تہذیبی و تمدنی اثرات، جن کی بدولت پچھلی تیرہ صدیوں میں ہر قسم کے مخالف حالات میں اسلام زندہ رہا ہے، اس مدرسۂ فکر کی پشت پر موجود ہیں۔ خود اس ملک کے اندر گذشتہ تین صدیوں سے تجدید و احیاءِ اسلام کی جو تحریکیں پے در پے اٹھتی رہی ہیں وہ سب اپنے طاقت ور اثرات کے ساتھ اس مدرسۂ فکر کی بنیاد مضبوط کر رہی ہیں۔ قوم کے متوسط اور اہل دماغ طبقے کی اکثریت اس کے ساتھ ہے۔ قوم کے عوام اپنی جہالت و بے شعوری کے باوجود اس کے نصب العین سے متفق اور اس کے رجحانات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اور اس پورے مدرسۂ فکر میں یہ جذبہ مشترک ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کی گاڑی اس رُخ پر نہ جائے جدھر اسلام سے انحراف اور اسلام میں تحریف کرنے والے لوگ اسے لے جانا چاہتے ہیں، بلکہ اس کی سمتِ سفر خالص اسلام کی طرف موڑ دی جائے۔

جماعت اسلامی اسی دوسرے مدرسۂ فکر کی ایک شاخ ہے۔ اس کی دعوت کی تفصیلات اور اس کے طریق کار سے، یا اس کے کارکنوں سے اس زمرے کے لوگوں کو تھوڑے یا بہت اختلافات ہو سکتے ہیں اور ہیں، لیکن اس کا مقام ہے اسی زمرہ میں۔ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے وہ ان لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے دل کی آواز ہے جو اس ملک میں اسلام کا احیاء چاہتے ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہی ہے وہ اس مجموعی کوشش کا ایک جزء ہے جو یہاں تجدید اسلام کے لئے ہو رہی ہے۔ وہ کوئی درخت سے ٹوٹا ہوا پتہ نہیں ہے کہ آپ جب چاہیں اسے ایک پھونک مار کر اڑا دیں۔ وہ ایک بڑے درخت کی شاخ ہے جو اپنے تنے کے ساتھ وابستہ ہے اور زمین میں اپنی گہری اتری ہوئی

جڑوں کے ذریعہ سے غذا اور نشوونما پا رہی ہے۔ اس طرح کی ایک تحریک کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس کے دو چار یا دس پانچ یا سب کارکنوں کو قید کر کے اس کا خاتمہ کیا جاسکے گا محض ایک خام خیالی ہے۔

عموماً اصحابِ اقتدار اپنی مرضی کے خلاف کسی تحریک کو بڑھتے دیکھ کر اس کے خلاف جبر کے ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آتے ہیں لیکن دراصل یہ ایک طرح کا جُوا ہے جو یہ لوگ کھیلتے ہیں۔ جبر لازماً ایک ہی نتیجہ پیدا نہیں کیا کرتا کہ آپ اطمینان سے آنکھیں بند کر کے اسے استعمال کر بیٹھیں اور خود بخود آپ کا مطلوب نتیجہ برآمد ہو جائے اس سے تو تین مختلف طریقے برآمد ہونے کے یکساں امکانات ہیں۔ ایک ممکن نتیجہ یہ ہے کہ تحریک کے کارفرما اور کارکن دب جائیں یا بک جائیں۔ حکومت کے قمار باز اسی نتیجہ کی امید پر یہ بازی کھیلتے ہیں۔ دوسرا ممکن نتیجہ یہ ہے کہ جابرانہ مزاحمت سے تحریک اور زیادہ زور پکڑ جائے اور آزمائش کی بھٹی اس کے کارکنوں کی قابلیتوں کو اور زیادہ نکھار دے۔ اسی امید پر ایک تحریک جبر کا خیر مقدم کرتی ہے اور بسا اوقات اس کو خود دعوت دینے لگتی ہے۔ تیسرا ممکن نتیجہ یہ ہے کہ تحریک غلط راستے پر پڑ جائے، اس کے لیڈر اور کارکن اپنے ذہن کا توازن کھو بیٹھیں، یا ذمہ دار لیڈروں کے ہٹ جانے کے بعد تحریک سرپھرے لوگوں کے ہاتھوں میں آجائے، یا آئینی و جمہوری طرز کی جدوجہد کا راستہ بند پا کر وہ خفیہ تحریکوں کا راستہ اختیار کرے۔ یہ نتیجہ کسی کے حق میں بھی اچھا نہیں ہے، نہ حکومت کے لئے، نہ ملک کے لئے، نہ خود تحریک کے لئے۔ دنیا میں بارہا جبر کے استعمال سے یہ نتیجہ رونما ہو چکا ہے۔ اس کی بدولت اچھی اچھی مفید تحریکیں جُز نقصان رہ بن گئی ہیں۔ اس نے ملکوں اور قوموں کی قسمتیں بگاڑ دی ہیں۔ اس کا زندہ نمونہ ہمارے سامنے روس موجود ہے جہاں زاروں کے جبر نے اصلاح کے جمہوری و آئینی طریقوں کا راستہ روک کر اصلاح طلب لوگوں کو خفیہ تحریکات کے راستے پر ڈال دیا اور اس کی بدولت پوری قوم کا مزاج ایسا بگڑ گیا کہ آج ساری دنیا اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ حکومتیں اس امید پر جبر کے ہتھیار استعمال کرتی ہیں کہ یہ نتیجہ رونما نہ ہوگا۔ مگر اس کے رونما نہ ہو سکنے کی ضمانت کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔

الحمدللہ کہ ہم اپنے معاملہ میں پہلے نتیجہ کا کوئی خوف نہیں رکھتے، اور خدا کے فضل سے دوسرے نتیجے کی امید رکھتے ہیں۔ لیکن تیسرے نتیجے کا امکان، چاہے وہ کتنا ہی بعید ہو، ایک قابلِ حذر چیز ہے۔ اس وجہ سے میں نے

اپنی گرفتاری سے پہلے بھی یہ کہا تھا اور اب اظہارِ خیال کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر کہتا ہوں کہ حکومت کو اس قماربازی سے باز رہنا چاہیے اور سیدھی طرح کام کرنے والوں کے ساتھ سیدھی طرح ہی معاملہ کرنا چاہیے۔ ملک کی اور خود حکومت کی اپنی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ یہاں ہر خیال کے لوگوں کیلئے رائے عام سے اپیل کرنے کا موقع کھلا رہے اور صرف رائے عام کی تبدیلی نظامِ حکومت کی تبدیلی کیلئے کافی ہو۔ بخلاف اس کے ایسے حالات پیدا کر دینا جن میں ایک مدرسۂ فکر غالب آ کر دوسرے مدارسِ فکر کا گلا گھونٹ دے اور نظامِ حکومت کی تبدیلی کیلئے رائے عام کو تیار کرنے کے بجائے دوسرے طریقوں کا استعمال ناگزیر ہو جائے، کبھی کسی ملک کے حق میں بھی مفید ثابت نہیں ہوا ہے اور ہمارے اس ملک کے حق میں بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ایسے حالات پیدا کرتے ہیں وہ ملک کے حق میں بھی کانٹے بوتے ہیں اور خود اپنے حق میں بھی۔ ہم نے اب تک جو کام کیا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں وہ سراسر آئینی ہے، پر امن ہے اور علانیہ ہے۔ جو اصلاح ہمارے پیش نظر ہے اس کیلئے ہم نے اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہ اختیار کیا ہے نہ آئندہ کریں گے کہ اپنے خیالات عوام الناس کے سامنے پیش کریں اور جو لوگ ہمارے ہم خیال بن جائیں ان کو منظم کریں۔ ملک کے نظامِ زندگی میں تغیر پیدا کرنے کی صحیح صورت ہمارے نزدیک صرف یہی ہے اسی کی کوشش ہم کرتے رہے ہیں اور آگے کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ ہم سے اختلاف رکھتے ہیں خواہ وہ برسرِ اقتدار ہوں یا نہ ہوں، ان کیلئے سیدھا اور صاف طریق کار یہ ہے کہ وہ دلائل سے ہمارا مقابلہ کریں اور جس طرح رائے عام سے ہم اپیل کر رہے ہیں وہ بھی کریں۔ ہم اس کیلئے تیار ہیں اور انہیں بھی اس کیلئے تیار ہونا چاہیے کہ باشندگانِ ملک کی اکثریت اس کھلے مقابلے میں جس مدرسۂ فکر کو پسند کرے وہ زمامِ کار پر قابض ہو اور دوسرے مدارسِ فکر عوام کی پسندیدگی حاصل کرنے کیلئے کوشش کرتے رہیں۔ اس سیدھے طریقے کو چھوڑ کر جو لوگ دوسروں کا راستہ روکنے کیلئے جبر و ظلم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اور حکومت کے وسائل و ذرائع اور اختیارات اس غرض کیلئے استعمال کرتے ہیں کہ رائے عام پر ان کا دائمی قبضہ قائم رہے اور دوسروں کو اسے ہموار کرنے کا موقع مل ہی نہ سکے، وہ نادان اور ناعاقبت اندیش ہیں۔ ان کا یہ طریقہ نہ صرف حکمت و مصلحت کے خلاف ہے، بلکہ دیانت و امانت کے خلاف بھی ہے، کیونکہ پبلک نے حکومت کے اختیارات اس کام کے لئے انکے حوالہ نہیں کئے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو یہ طریقہ اخلاقی بزدلی اور ذہنی کمزوری کی کھلی علامت ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے دلائل اور عملی کام کے زور سے رائے عام کو جیتنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے اوچھے ہتھیاروں سے کام لے رہے ہیں۔

جماعت اسلامی نے ہماری گرفتاری کے بعد اور ہماری قید کے دوران میں جو رویہ اختیار کیا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس جماعت کا مزاج اب پختہ ہو چکا ہے اور اس کے کارکنوں میں بالعموم وہ اخلاقی و ذہنی اوصاف پیدا ہو چکے ہیں جو اس کام کے لئے مطلوب ہیں۔ انہوں نے بغیر کسی اشتعال اور بغیر کسی بزدلی اور مرعوبیت کے اپنا کام اسی طرح جاری رکھا جس طرح وہ پہلے سے کر رہے تھے، بلکہ اپنے مقصد کے لئے ان کی جدوجہد پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ یہ ہمارے اصلی طریق کار کے عین مطابق تھا اور حکومت کی زیادتی کا صحیح جواب بھی یہی ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ رہنماؤں کی گرفتاری جماعتوں پر نہایت برا اثر ڈالتی ہے۔ کسی کے کارکنوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ کسی کے کارکن مشتعل ہو کر غلط کارروائیاں شروع کر دیتے ہیں۔ کسی کے کارکن اپنا اصل کام چھوڑ کر اپنے رہنماؤں کو چھڑانے میں ساری قوتیں صرف کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے مقصد کے بجائے اس مقصد کو پورا کرتے ہیں جس کے لئے حکومت نے ان کے رہنماؤں کو گرفتار کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ جماعت اسلامی اس قسم کے تمام برے اثرات سے محفوظ رہی، بلکہ نقصان اٹھانے کے بجائے اس نے اپنے رہنماؤں کی قید سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کے سینکڑوں کارکن پہلے سے زیادہ سرگرم اور مستعد ہو گئے۔ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ہماری ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر محسوس کیا اور اسے سنبھالا۔ انہوں نے جماعت کی دعوت کو ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچا دیا۔ انہوں نے اندرون ملک کے دیہات تک کو اپنے مدعا سے روشناس کرا دیا۔ انہوں نے ہماری رہائی کے لئے بھی اگر کوئی کوشش کی تو اس طرح کی کہ ساتھ ساتھ ہماری دعوت کی اشاعت بھی ہوتی چلی گئی۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس آزمائش کے مرحلے سے جماعت پوری طرح کامیاب ہو کر نکلی ہے۔ اس پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور رفقاء جماعت کو صمیم قلب سے مبارکباد دیتے ہیں۔

چند کلمات اس رسالہ کے متعلق بھی مجھے عرض کرنے ہیں۔

میری مصروفیتیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں اور قوت کار کم ہو رہی ہے۔ میں ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ میرے لئے زیادہ دیر تک اس رسالے کو تنہا چلانا مشکل ہے۔ تمنا تھی کہ میرے نوجوان رفیقوں میں سے کوئی اس بوجھ کو سنبھالنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ اب جیل سے باہر آ کر معلوم ہوا کہ میری غیر حاضری میں نعیم صاحب نے بہت خوبی کے ساتھ میری جانشینی کا حق ادا کیا ہے۔ یہ بہا بار جانے کے بعد میرے کندھے اتنے ہوتے ہوئے کہ پھر اٹھانے کیلئے تیار نہیں ہیں

(بقیہ بر صفحہ ۲۹۲)

ہوا کا رُخ

(مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

(غیر مطبوعہ مضامین کے سلسلے کی ایک کڑی)

عورتوں کی آزادی اور حقوق سے متعلق ہمارے لیڈروں کے نظریات

ہوا کے رُخ کا اندازہ کرنے کے لئے ہم پہلے پاکستان کے بعض چوٹی کے لیڈروں اور بعض لیڈر خواتین کی تقریروں اور بیانات کے اقتباسات درج کرتے ہیں تاکہ خود ان کے الفاظ سے واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ یہ حضرات اس ملک کی خواتین کو کس راستہ پر لے جانا چاہتے ہیں اور ان کی اجتماعی و سیاسی زندگی سے متعلق ان کے ذہنوں میں وہ کیا منصوبے ہیں جو انہوں نے اپنے زعم کے مطابق عین اسلام سے اخذ کیے ہیں۔

۲۴ جنوری ۱۹۴۹ء کو یونیورسٹی ہال لاہور میں مغربی پنجاب زنانہ مسلم لیگ اور پاکستان زنانہ رضاکار سروس کے زیر اہتمام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے جناب لیاقت علی خاں صاحب وزیر اعظم پاکستان نے فرمایا:-

"عورتوں پر — بالخصوص پڑھی لکھی اور پردے کی قید سے آزاد عورتوں پر — ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ انہیں پاکستان کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی خاطر ہر قربانی کے لئے تیار رہنا چاہیئے اور اپنی تعلیم اور آزادی سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی مثال قائم کرنی چاہیئے کہ دنیا دیکھ لے کہ ایک چاردیواری میں مقید رہنے والی عورت اور اُس عورت میں کیا فرق ہوتا ہے جو اپنی تعلیم کی مدد سے اپنے ملک اور اپنی قوم کو مضبوط بنانے کی جدوجہد کرتی ہے۔ .... جب میں اپنے ہاں کی عورتوں کو بھی مردوں کے ساتھ پاکستان کے استحکام کے لئے کوشاں دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ یہ بات بڑی ہی

ترجمان القرآن

فہرستِ مضامین

جلد ۳۴ | شعبان، رمضان، شوال، ذی القعدہ ۱۳۶۹ھ مطابق جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۵۰ء | عدد ۲، ۳، ۴، ۵

سید ابوالخیر مودودی نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا۔

مسرت بخش ہے کہ ہماری بہنوں کی ایک کثیر تعداد نیشنل گارڈز میں بھرتی ہو چکی ہے۔۔۔۔ جو لوگ عورتوں کو فوجی تربیت دیئے جانے کی مخالفت کرتے ہیں اور پرانی بوسیدہ صورتِ حال ہی کو جاری رکھنا چاہتے ہیں انہیں ذرا سرحد کے پار ان ہزار ہا چھنی ہوئی عورتوں کے حال پر نظر کرنی چاہیئے جو پاکستان کی راہ تک رہی ہیں۔ اگر وہ بدقسمت عورتیں اسلحہ کے استعمال سے واقف ہوتیں تو وہ چھینے جانے کے بجائے اپنے ناموس کی حفاظت میں کٹ مری ہوتیں[1]"

عورتوں کی آزادی کے بارہ میں جناب لیاقت علی خاں صاحب نے فرمایا:۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں عورتوں کے لئے مکمل آزادی کے معاملہ میں آپ سے متفق ہوں۔ مرد عورتوں کو آزادی دیئے جانے کے خلاف نہیں ہیں جو بعض مرد اس کے بظاہر مخالف معلوم ہوتے ہیں انہیں دراصل کچھ منفرد[2] غلط مثالوں نے مذبذب بنا دیا ہے۔ آپ لوگوں کو آزادی صحیح طور پر استعمال کرنا چاہیئے۔"

خواتین کے سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے وزیراعظم صاحب نے فرمایا:۔

---

[1] کس قدر صحیح فرمایا وزیراعظم صاحب نے۔ پچھلی جنگِ عظیم میں روس، فرانس، اٹلی، جرمنی، پولینڈ، جاپان وغیرہ ملکوں میں اتنی لڑائیاں ہوئیں مگر کسی عورت کو کوئی شخص ہاتھ نہ لگا سکا۔ اس لئے کہ پردے کی لعنت وہاں نہ تھی اور عورتیں اسلحہ کے استعمال سے واقف تھیں۔ خود ہمارے اسی برعظیم میں دیکھ لیجئے۔ عورتیں صرف مسلمانوں ہی کی چھینی گئیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کی عورتوں کے چھینے جانے کا ایک واقعہ بھی پیش نہ آیا۔ اس لئے کہ پردے کی لعنت تو ہم پر مسلط تھی۔

[2] منفرد غلط مثالوں سے وزیراعظم صاحب کا اشارہ غالباً آزادی کے سوءِ استعمال کے ان شاذ و نادر واقعات کی طرف ہے جو بے پردہ سوسائٹی میں کہیں ہزاروں لاکھوں میں کبھی سوءِ اتفاق سے پیش آ جایا کرتے ہیں مثلاً انگلستان کی سرکاری رپورٹ متعلق بکثرت ولادت بابت [illegible] میں درج ہے کہ اس سال ہر آٹھ بچوں میں صرف ایک بچہ حرامی پیدا ہوا۔ (یہ صرف ان ناجائز ولادتوں کی تعداد ہے جو غیر شادی شدہ عورتوں کے بطن سے ہوئی ہیں اور جن کا حکومت کو علم ہو سکا ہے) وزیراعظم صاحب کا منشا یہ ہے کہ اس طرح کے منفرد واقعات نے بعض مردوں کو بظاہر شبہ میں ڈال دیا ہے ورنہ عورتوں کی مکمل آزادی سے کس بدبخت کو اختلاف ہو سکتا ہے اور اس کی برکات میں کون کافر شک لا سکتا ہے!

"اپنے سپاس نامہ میں آپ لوگوں نے کہا ہے کہ عورتوں کو مرکزی اور صوبائی میں معقول نمائندگی دی جائے۔ ہر چند میں آپ کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس صوبہ کے دستوری جمعیتوں کی موجودگی میں آپ کو سردست اس سے الگ ہی رہنا چاہیئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں تک ممکن ہوگا عورتوں کو حکومت کے ہر محکمہ میں پوری نمائندگی دی جائے گی"

تقریر کے آخر میں وزیر اعظم صاحب نے ٹیپ کا بند یہ ارشاد فرمایا:۔

"پاکستان اس غرض کے لئے حاصل کیا گیا ہے تاکہ دنیا کو اسلامی اصولوں پر قائم شدہ ریاست کا نمونہ دکھایا جا سکے"۔ (سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء)

ہمارے وزیر خزانہ ملک غلام محمد صاحب جو ماشاء اللہ پاکستانی کابینہ کے دماغ سمجھے جاتے ہیں اور اپنی مذہبی بصیرت پر انہیں خود بھی بڑا اعتماد ہے اور بہت سے دوسرے حضرات کو بھی اس باب میں ان سے بڑی خوش گمانی ہے۔ وہ عمر بھر کے غور و مطالعہ کے بعد عورتوں کے معاملہ میں جس نتیجہ تک پہنچے ہیں اس کا اظہار کراچی میں بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس کے آخری اجلاس میں ۱۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کو انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں فرمایا:۔

"مجھے افسوس ہے کہ ہماری اس کانفرنس میں کہیں سے کوئی عورت نمائندہ بن کر نہیں آئی[1]۔ مجھے پوری پوری امید ہے کہ طہران میں منعقد ہونے والی کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں کچھ نہ کچھ عورتیں بھی نمائندہ حیثیت سے ضرور شریک ہوں گی۔ اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت میں نے اس لئے محسوس کی کہ جب تک کسی ملک کی اقتصادی تعمیر میں عورتیں بھی پورا پورا حصہ نہ لیں اسکی اقتصادی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ تمام مذاہب میں سے اسلام ہی تو تھا جس نے سب سے پہلے عورت کو سیاسیات و اقتصادیات میں عزت و احترام کا وہ مقام عطا کیا جو اس سے پہلے اسکو حاصل نہیں تھا۔ پس اسلامی ممالک کو چاہیئے کہ اپنے ہاں کی تمام تحریکوں میں عورتوں کو صف اول میں جگہ دے کر ان کے ساتھ انصاف کریں۔

---

[1] اس دینی شعور اور نکتہ رسی کی داد دیجئے کہ پوری کانفرنس میں اسلامی نقطۂ نظر سے جس ایک چیز کی کمی رہ گئی تھی اسکو ہمارے وزیر مال نے کس طرح تاڑ لیا!

اس کے بغیر اقتصادی بحالی ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہوگی۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جہالت اور تحکمانہ ملائیت نے مسلمان عورتوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اب ہمیں ان کو اقتصادی بند ھنوں سے بھی آزاد کرانا ہے اور (مردوں کے مقابل میں) احترام اور برابری کا وہ مقام بھی ان کو دلانا ہے جو اسلام کا تقاضا ہے[1]۔"

"آخر میں نہایت ادب کے ساتھ میں یہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ عمر بھر کے غور و مطالعہ[2] کے بعد اب یہ میرا ایمان ہو چکا ہے کہ اسلام کوئی جامد شے نہیں ہے۔ اسلام ایک زبردست طاقت اور ایک زندگی بخش قوت ہے۔۔۔۔۔ مستقبل کی تعمیر میں اس کا بہت اہم حصہ ہوگا۔ اس کی تعمیر کی ابتداء ہو چکی ہے[3]۔ اب ہم میں سے ہر ایک کو اپنا اپنا جائزہ برابر لیتے رہنا چاہیئے کہ جس کام کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے اس کے لئے آپ اپنے کو کس حد تک تیار کر رہے ہیں۔ ہمیں ان خیالات اور جہالتوں سے لڑنا ہے جو صدیوں سے ہم پر مسلط ہیں۔ مگر مجھے اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ اگر ہم نے اسلام کی صحیح روح کو پیش نظر رکھکر کام کیا تو ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کے رہیں گے۔" (پاکستان ٹائمز لاہور ۲۵ دسمبر ۴۹ء)

بیگمات کے افکار و نظریات | اب بعض بیگمات کی تقریروں اور بیانات کے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے جو اس ملک کی خواتین کی لیڈر ہیں (جنکو ارباب اقتدار کی جانب سے اس لیڈری کے منصب پر مامور کیا گیا ہے) اور جو مسلمان عورتوں کیلئے نمونہ اور مثال کی حیثیت سے بیشتر سرکاری خرچ پر اس ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دورہ کرتی لئے پھرائی جا رہی ہیں کہ یہ ہماری ماؤں اور بہنوں کو دکھائیں اور بتائیں کہ ان کو کس نمونہ کی تقلید کرنی چاہیئے اور کیا بننا چاہیئے۔

اس زمرہ صالحات و طیبات کی گل سر سبد محترمہ بیگم لیاقت علیخاں ہیں۔ انہوں نے ۲۰ جنوری ۴۹ء کو جہلم میں کالا رفیوجی کیمپ میں جموں و کشمیر کے پناہ گزینوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا:۔

"اب وہ وقت نہیں رہا کہ مسلمان عورتیں گھروں کی چار دیواری میں بند بیٹھی رہیں۔ اب انہیں اس

[1] دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست ہونے کی وجہ سے اس ملک کی رہنمائی کا جو مقام پاکستان کو حاصل ہے اس کے پیش نظر یہ پروگرام گویا تمام دنیا کی قوموں کے جادہ بردار ہے

[2] اگر چہ وزیر اعظم صاحب پاکستان کی تصریح نہیں فرمائی کہ عمر بھر کس چیز کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ تک پہنچے ہیں مگر سیاق کلام دلیل ہے کہ وہ ظاہر یہ کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے ساری زندگی اسلام کے مطالعہ میں بسر فرمائی ہے۔ نہ یہ ہے کہ اس کے بعد اسلام کے متعلق کوئی بات فرمانے اور مجلس کا ان کی ترجمانی کرنے کے حق سے کس کی مجال ہے جو انہیں روک سکے۔

[3] غالباً آزادئ نسواں کے پروگرام کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ اب تک ہماری اس سب سے بڑی اسلامی حکومت نے ہمارے پیمانہ پر جس تعمیر کا آغاز کیا ہے اس میں صنف نازک کے نمایاں طور پر باہر آنے کی چیز آ رہی ہے اور اس کا چیز کی شہادت آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی رپورٹ سے بھی مل رہی ہے۔

خوابِ غفلت سے بیدار ہونا ہوگا اور گھروں سے نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ قوم کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لینا ہوگا"[1]

مردوں کو مخاطب کرکے بیگم صاحبہ نے ارشاد فرمایا کہ "وہ اپنی عورتوں کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ وہ انہیں اسباب کا موقعہ دیں کہ وہ ان فنون کو سیکھ سکیں جن کی اہلیت ان کے اندر پائی جاتی ہو"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور مورخہ ۲۹ جنوری ۱۹۴۸ء)

انہی بیگم صاحبہ نے ۲۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو لندن میں غیر ملکی اخبار نویس حضرات کے سامنے پاکستانی عورتوں کی رفتارِ ترقی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اگرچہ (پاکستان کی) شہری عورتیں پردہ بھی کرتی ہیں اور نقاب بھی اوڑھتی ہیں تاہم اسّی فیصدی عورتیں جو دیہات میں رہتی ہیں وہ ایسا نہیں کرتی ہیں۔ نیز پردہ نشین عورتیں بھی اپنے مردوں پر ویسی ہی حاوی اور اپنے گھر کے معاملات میں ویسی ہی بااختیار ہیں جیسے کہ بے پردہ عورتیں"

آپ نے فرمایا کہ مغرب میں بھی تو عورتوں کے مردانہ کارروائیوں اور مصروفیتوں میں حصہ لینے کا خیال ابھی نیا نیا ہی پیدا ہوا ہے[2]۔ بہرحال پردہ دیر سویر ختم ہو کے رہیگا۔ لڑکیوں کی نئی پود جن کی تربیت لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط درسگاہوں میں ہوئی ہے وہ پردہ میں نہیں جائے گی"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور، مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۴۸ء)

کل پاکستان زنانہ ایسوسی ایشن کا ذکر اکثر اخباروں میں آتا رہتا ہے اور ناظرین ایک حد تک اس سے واقف

ل جموں اور کشمیر کی پناہ گزیں عورتوں کے سامنے، جن کے پاس نہ مکانوں کی چار دیواری ہے نہ ستر پوشی کا کوئی سامان موجود ہے، بیگم صاحبہ کی یہ تقریر ممکن ہے بعض لوگوں کو بے محل معلوم ہو، مگر مقصد کا سچا عشق محل اور بے محل کی حدود کی پروا کب کرتا ہے!

۲ بیگم صاحبہ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ملک کی شہری عورتوں کے چہرہ پر یہ نقاب کے داغ دھبے کہیں کہیں جو نظر آجاتے ہیں ان کے سبب سے ہمیں ملامت کرنے میں جلدی نہ کیجئے۔ ابھی ہماری اسلامی ریاست کو وجود میں آتے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ ہماری خامیوں کا محاسبہ شروع کر دیا جائے۔ آخر مغرب کی عورتوں نے بھی تو اپنی موجودہ منزل تک پہنچنے میں کافی وقت لگائے۔ ہماری اسلامی حکومت پر بھی کچھ دن گزرنے دیجئے پھر اگر مخلوط درسگاہوں کی بدولت جاہلیت قدیمہ کا ایک نشان بھی باقی رہ جائے تو کہئے۔

ہوں گے۔ یہ عورتوں کی ایک نیم سرکاری انجمن ہے جس کی سرپرست ہز ایکسی لینسی بیگم خواجہ ناظم الدین اور مس فاطمہ جناح ہیں۔ بیگم لیاقت علی خان اسکی صدر ہیں۔ اسکی شاخیں پاکستان کے ضلع ضلع میں قائم ہو چکی ہیں۔ ہر جگہ اس کی کرتا دھرتا سرکاری حکام کی بیگمات ہیں۔ حکومت پاکستان نے اس انجمن کو باضابطہ طور پر تسلیم کر کے یہ اعلان کر دیا ہے کہ جن معاملات کا تعلق عورتوں سے ہو گا ان معاملات میں حکومت اس انجمن سے مشورہ کئے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔ حکومت جس شفقت کے ساتھ اس کی سرپرستی کر رہی ہے اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اسکی کانفرنسیں بالعموم گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوا کرتی ہیں۔[1] اسکی جنرل سکرٹری بیگم جی۔ اے۔ خان نے اسکی اغراض و مقاصد سے متعلق نمائندہ پریس کو جو بیان دیا ہے وہ ملاحظہ ہو:-

"یہ ایسوسی ایشن پختہ عزم رکھتی ہے کہ پاکستان کی عورتوں کو تہذیبی اعتبار سے دوسرے ملکوں کی عورتوں کی سطح پر کھڑا کرے۔ چنانچہ ایسوسی ایشن عنقریب اپنے نمائندوں کو دوسرے ملکوں میں اس غرض سے بھیج رہی ہے تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئیں کہ وہاں کی ایسی تنظیمیں کس طرح کام کرتی ہیں........ زینت خورشید جو ایسوسی ایشن کی رکن ہیں مذکورہ بالا مقصد کو پیش نظر رکھکر ہالینڈ جا رہی ہیں۔ جوں ہی ہمارے ارکان کی تعداد ۲۵ ہزار تک پہنچ گئی ہم اقوام متحدہ کی سماجی اور اقتصادی کونسل سے الحاق کی درخواست کر دیں گی۔"

(پاکستان ٹائمز، لاہور مورخہ ۲۵ / جون ۱۹۴۹ء)

یہ انجمن جس قسم کی ثقافتی و تہذیبی ترقی اس ملک کی خواتین میں پیدا کرنی چاہتی ہے اس کا اندازہ بیگم طیب جی کی مندرجہ ذیل تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے اس انجمن کے ایک جلاس میں ثقافتی ترقی کے ریزولیشن پر فرمائی:-

"ایک عام شکایت جو ان دنوں میں نے بہت سنی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں (پاکستان میں) عمدہ قسم کے گانوں کی کلی فقدان ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں گانے بجانے کے تمام استاد اور معلمین مسلمان ہی رہے ہیں تو یہ موجودہ صورت حال بہت ہی ستم ظریفانہ معلوم ہوتی ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں گانا بجانا لڑکیوں کی تربیت کا ایک لازمی جزو تھا اور معمولی گانا بجانا نہیں بلکہ نہایت

[1] ملاحظہ ہو سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۲۷ / مارچ ۱۹۴۹ء اور پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۹ / اکتوبر ۱۹۴۹ء ص ۵۰۔

اونچے قسم کا ۔ یہ بڑے ہی افسوس کی بات ہے اور درحقیقت یہ ایک بہت بڑا خسارہ ہے

کہ ہمارے زمانہ کی لڑکیاں معیاری اور پکے گانوں کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں ۔ ان کی بڑی

سے بڑی امنگ بس فلمی گیتوں کے سیکھنے تک محدود ہے ۔ یہ گانے بھی اگرچہ اپنے عام انداز

میں اچھے ہوتے ہیں مگر یہ گانوں کو حقیقی حسن صوت کے امتیاز کے قابل نہیں چھوڑتے ۔

(دی سیکنڈ ایر شائع کردہ پاکستان پبلیکیشن ص ۲۷۴)

اس ثقافتی ترقی کو شگفتہ بروئے کار لانے کے لئے ایک باضابطہ ادارہ بھی قائم ہو چکا ہے جس کو انسداد دینداری

ہمارے وزیر خزانہ ملک غلام محمد صاحب نے اپنی سرپرستی سے مشرف فرمایا ہے ۔ اس ادارہ کا اعلان ملاحظہ ہو:-

پاکستان اکاڈمی آف آرٹ

پاکستان میں ناچ سکھانے کی اسکیم

راولپنڈی ۱۲ ر دسمبر مشہور پاکستانی رقاصہ[1] آزودی رحمان بیگم نزہت محمود نے بیان کیا کہ آیندہ سال

کے شروع میں پاکستان میں جسم بنانے (   ) اور جسمانی حرکات میں تناسب

و ہم آہنگی پیدا کرنے کا پہلا ادارہ قائم ہو جائے گا ۔ اس کا صدر مرکز کراچی اور ذیلی مراکز مغربی اور مشرقی

پاکستان کے اہم شہروں میں ہوں گے ۔ اس ادارہ کا مقصد پاکستانی عورتوں اور بچوں میں تال، سر،

صحت اور جسمانی انضباط کا شعور پیدا کرنا ہے ۔

بیگم محمود نے کہا کہ وہ اپنی اس اسکیم کے سلسلہ میں مسٹر غلام محمد صاحب وزیر خزانہ پاکستان اور بیگم

لیاقت علی خاں سے ملاقات کر چکی ہیں ۔ ان دونوں صاحبوں نے اس کام میں پوری مدد دینے کا وعدہ

کیا ہے[2] ۔ میرے پیش نظر سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ رقص کو جو کار بر شاہان مغلیہ کی سرپرستی ہیں

---

[1] یہ نامہ نگار کی کوتاہی ہے کہ اس نے بیگم صاحب کو محض پاکستانی رقاصہ لکھا ہے ۔ ورنہ وہ اپنے حیثیات و حیات کے لحاظ سے تو اسلامی رقاصہ کے لقب کی مستحق ہیں اور ویسے بھی اب اس مملکت اسلامیہ میں کوئی شے غیر اسلامی کب رہ گئی ہے !

[2] بیگم صاحبہ نے کراچی کے اکابر و اکابرات سے ملنے ہی میں معلوم ہوتا ہے کوتاہی کی ورنہ ہتی وہ کیا خصوصیت ہے وہاں کے ابرار و صالحین میں سے کوئی بھی اس خالص دینی و اسلامی خدمت میں شرکت و تعاون سے پیچھے رہنے والا نہیں ہے ۔

اپنے کمال[1] کو پہنچ گیا تھا اور اب پاکستان میں رو بہ تنزل ہے پھر سے زندہ کیا جائے۔ اور بین الاقوامی نمائش فنون میں جو سال ۱۹۵۱ء میں لندن میں منعقد ہو رہی ہے پاکستان کو دنیا کے تہذیبی نقشہ پر جگہ دلائی جائے۔

اس عظیم الشان کام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پہلا قدم یہ ہوگا کہ آذوری راولپنڈی میں ۱۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کو رقص و مجسمہ بنانے کے فن کی نمائش کریگی۔

اپنے اس ادارہ کے مقاصد کی تفصیل کرتے ہوئے آپ نے بیان کیا کہ ان کے پیش نظر پاکستانی خواتین کو صرف ناچ گانے کے فن ہی میں یکتائے روزگار بنانا نہیں ہے بلکہ ان کی شخصیتوں کو تہذیب کے رنگ میں رنگ دینا اور ان کو اس خاص سانچہ میں ڈھال دینا بھی ہے جو قدرت نے ان کو عنایت کیا ہے۔ اس سے میرا مقصود ان کو معاشرہ میں اپنی اصلی جگہ حاصل کرنے اور آئندہ تعمیر ملت[2] کے کاموں میں اپنا پورا حصہ ادا کرنے کے قابل بنانا ہے۔

آپ نے کہا کہ اس ادارہ کا دائرہ عمل صرف ناچ اور گانا سکھانے ہی تک محدود نہیں ہوگا بلکہ یہ بہت سے دوسرے فنون۔ مثلاً مصوری وغیرہ سکھانے کا بندوبست بھی کرے گا۔

رقص کتھک ناچ کا ذکر کرتے ہوئے آذوری نے بڑے دعوے سے کہا کہ کتھک ناچ مسلمانوں کا ناچ[3] ہے۔ یہ اپنی موجودہ طرز اور موجودہ کمال کو اکابر شاہانِ مغلیہ کی سرپرستی میں پہنچا۔ پاکستانی رقاصہ

---

[1] تاریخ کا جو سرسری سا مطالعہ ہمارا ہے اسکی بنا پر یہ عرض ہے کہ یہ فن شریف مغل سلاطین کے اس دور میں اپنے کمال پر پہنچا تھا جو خود ان سلاطین کے زوال کا دور آخر تھا اور بیگم صاحبہ ہمارے دور طفولیت ہی میں اس کمال کی متمنی ہیں عجب ابتدائی نقطے پر جا ہے تو دیکھئے اسکی انتہا کیا ہو!

[2] اس مقام سے سرسری نہ گزر جائیے بلکہ یہاں اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ ہمارے معماران ملت کے نزدیک "تعمیر ملت" کی اصطلاح کا اصل مفہوم کیا ہے اور ملت اسلامیہ کی تعمیر درحقیقت کن اجزا سے ہوتی ہے

[3] یہ بھی بیگم صاحبہ کی عنایت ہے کہ انہوں نے اسے صرف مسلمانوں کا ناچ قرار دیا ورنہ انہیں تو اسے خالص اسلامی ناچ کہنا چاہیئے تھا۔

(آذوری) نے ہندوستان کے اس دعوے کی کہ کتھک ناچ ان کی چیز ہے پر زور تردید کی اور اس بات کو بہت زور دے کر کہا کہ اس ناچ کو بھی ہندوستان والوں سے پھر حاصل کرنا[1] ہے۔" (سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، مورخہ ۳ نومبر ۱۹۴۹ء)

ان بیگم صاحبہ کے متعلق ایک اور اعلان بھی قابل ملاحظہ ہے جو ۶ فروری ۱۹۵۰ء کے "احسان" لاہور میں شائع ہوا ہے:-

"کراچی ۴ فروری۔ ملک میں آرٹ کو ترقی دینے کے لئے عنقریب "اکاڈمی آف آرٹ" کا قیام عمل میں آجائے گا۔ مادام آذوری جو مشہور آرٹسٹ ہیں انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کو بتایا ہے کہ ملک کو زیادہ آرٹ آشنا بنانے کے لئے تحریک جاری کی جائے گی تاکہ پاکستان آرٹ کے لحاظ سے بھی دنیا کے ممالک میں اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے۔ آپ نے کہا کہ دنیا کی کوئی قوم آرٹ کے بغیر ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتی ...... آپ نے مزید کہا کہ توقع ہے کہ پاکستان کے وزیر خزانہ اس نئی اکاڈمی کے صدر ہوں گے۔ مادام آذوری نے کہا کہ دنیا کے تمام ممالک میں آرٹ کی ترقی کے لئے ان کے اپنے قومی تھیٹر ہیں لیکن پاکستان میں کوئی تھیٹر نہیں۔ پاکستان کو ان تھیٹروں کی بہت ضرورت ہے۔"

ان اعلانات میں بار بار آرٹ کا لفظ جو استعمال ہوا ہے اس سے ناظرین کو کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ اس طائفہ کی اصطلاح میں آرٹ سے مراد ناچ گانا ہے۔ نیز ان اعلانات میں جس آرٹ اکاڈمی کے قیام کی بشارت دی گئی ہے اس کے باضابطہ قیام کا اشتہار بھی آذوری صاحبہ کے رقص کی تصویر کے ساتھ ۹ فروری ۱۹۵۰ء کے ڈان۔ کراچی میں شائع ہو چکا ہے اور اس اشتہار پر "زیر سرپرستی آنریبل مسٹر غلام محمد وزیر مال" کے الفاظ بھی اہل پاکستان کی آنکھیں روشن کرنے کے لئے ثبت ہیں۔ یہاں پھر ایک مرتبہ پلٹ کر مسٹر غلام محمد کی اس تقریر کو

[1] پاکستان کے تمام مسلمانوں کو آذوری صاحبہ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے ایک ایسے عظیم الشان قومی نقصان پر ہم کو متنبہ کیا ہے جس کی طرف اس سے پہلے کسی کی بھی توجہ نہیں گئی۔ واگہ کے اُس پار کے نقصانات کا جب بھی ذکر آیا تو کسی نے ہزاروں بہوؤں بیٹیوں کی بے حرمتی کا ماتم کیا، کسی نے مساجد اور مزارات کا ماتم کیا، کسی نے ایک آہ سرد کے ساتھ دینی مدارس اور اسلامی کتب خانوں کو یاد کیا لیکن اسے اسلامی بے حسی کہئے یا دینی بے خبری کہ ہمارے بڑوں اور چھوٹوں میں سے کسی کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہمارا خالص قومی و اسلامی ناچ "کتھک" بھی واگہ کے اس پار ہی رہ گیا اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ظالم ہندو

وہ اسے اپنائے لیے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ان کا ناچ ہے۔ اللہ کرے بیگم آذوری کامیاب ہوں! اگر اس ورثہ ہی کو ہم واپس نہ لے سکے تو پاکستان بننے سے حاصل کیا؟!

پڑھ ڈالئے جو انہوں نے اسلامی اقتصادی کانفرنس میں کی تھی۔ یہ ہے عمر بھر کے مطالعۂ اسلام کا نچوڑ:

زنانہ نیشنل گارڈز

پاکستان زنانہ نیشنل گارڈز کو جو اہمیت دی جا رہی ہے اور اس کی پریڈوں اور سلامیوں سے اس ملک کے ارباب اقتدار اور لیڈر صاحبان کو جس درجہ دلچسپی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ اس وقت دفاعی نقطۂ نظر سے اگر اہمیت ہمارے ملک میں اگر کسی چیز کو حاصل ہے تو اسی چیز کو حاصل ہے۔ ہمارے [illegible] دنیا کے ارکان [illegible] مصروفیت پر نگاہ [illegible] وہ کسی چیز کے لئے وقت نکال سکیں یا نہ نکال سکیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ زنانہ نیشنل گارڈز کی پریڈوں اور سلامیوں کو قضا ہونے دیں اور یہ پریڈیں اور سلامیاں جن اسلامی آداب و قواعد کے اہتمام کے ساتھ منعقد ہوتی ہیں اس کے متعلق چند رپورٹیں ملاحظہ ہوں:-

"قیام پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان زنانہ نیشنل گارڈ کی طرف سے ڈھاکہ اسپورٹس ایسوسی ایشن کے [illegible] میدان میں قواعد کھیل اور رسہ کشی کا مظاہرہ کیا گیا۔ صوبہ کے گورنر سر فریڈرک بورن نے زنانہ نیشنل گارڈز کی سلامی قبول کی اور انعامات تقسیم کئے۔ نیشنل گارڈز کی جماعت میں شہر کے بعض معزز حضرات کی بیگمات اور کالج کی طالبات شریک ہیں اور باوجود زمرہ کی مصروفیت کے یہ خواتین اس قومی ادارہ میں بہت دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے قیام کی پہلی سالگرہ کے موقع پر نہ صرف ڈھاکہ بلکہ دوسرے اضلاع کی خواتین بھی اسپورٹس میں شریک ہوئیں۔ پنجاب رجمنٹ کے بینڈ کے ہمراہ سفید وردیوں اور سبز پٹیوں میں ملبوس خواتین نے مارچ پاسٹ کی رسم ادا کی۔ اس کے بعد سوگن کی دوڑ، لانگ جمپ، لمبی چھلانگ، رسہ کشی اور دوسرے کھیلوں کے مظاہرے کئے گئے۔ اس موقع پر ہندوستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر مسٹر سنتوش کمار باسو، میجر جنرل ایوب خاں اور دوسرے اعلیٰ فوجی اور سول افسران بھی موجود تھے۔" (نوائے وقت ۱۷ مارچ ۴۹ء)

پچھلے دنوں اس زنانہ نیشنل گارڈ کے ایک دستہ کو "مکہ اور مدینہ" کی سند تصدیق بھی حاصل ہوگئی۔ سعودی عرب کے جو نمائندے بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے انہوں نے ایک "چاق چوبند" دستہ کی پریڈ دیکھی اور نہ صرف اس کی تحسین فرمائی بلکہ یہ امید ظاہر کی کہ سعودی عرب کی خواتین بھی اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کریں گی۔ پاکستان کے مسلمان جو مکہ اور مدینہ کے فتووں کو ہمیشہ آخری دینی سند کی حیثیت دیتے رہے ہیں علمبرداران

کتاب و سنت کے ان فتوے کے بعد بھلا اب کسی کو زنانہ نیشنل گارڈ کے کسی پہلو پر نکتہ چینی کے لئے کاہے کو لب ہلانے کی اجازت دیں گے اصل خبر بالفاظہا ملاحظہ ہو:-

"کراچی ۹ دسمبر آج کراچی میں پاکستان زنانہ نیشنل گارڈ کے ایک چاق و چوبند دستہ نے پریڈ کی بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس میں شریک ہونے والے سعودی عربیہ کے ارکان وفد اور وفد پاکستان میں سعودی عربیہ کے مدیر المہام نے پریڈ کی سلامی لی۔

سعودی عربیہ کے وفد کے لیڈر نے اس تقریب کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی خواتین قومی زندگی میں مردوں کے دوش بدوش جس طرح کام کر رہی ہیں ان شاء اللہ سعودی عرب کی عورتیں بھی اپنے فرائض اسی تندہی سے انجام دیں گی" رفتارِ وقت ۱۱ دسمبر ۱۹۴۹ء

اس زنانہ نیشنل گارڈ کی تمام تربیت مرد فوجی افسروں کے سپرد ہے اور وہ ان دستوں کی تربیت بے شرعی و اخلاقی ذمہ داریوں کے ساتھ کر رہے ہیں اور اس کے جو نتائج سامنے آرہے ہیں اس کے متعلق ایک واقف حال کی شہادت ملاحظہ ہو۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے اپنی ۲۳ اپریل ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں اپنے ایک مراسلہ نگار حقیقت پسند کا مندرجہ ذیل مراسلہ شائع کیا ہے:-

"جناب من!

پیشتر اس کے کہ آپ تنیوں اور پردے کی بحث ختم کریں، کیا آپ ایک حقیقت پسند شخص کو بھی اپنے احساسات پیش کرنے کا موقعہ دیں گے۔

فوج سے متعلق اپنے ۳۰ سالہ تجربہ کی بنا پر میرا یہ خیال ہے کہ فوج کے صرف وہ افسر عورتوں کے آوارہ پھرنے کے حق میں ہیں جو محض جنگی ضرورت کی پیداوار ہیں ...... یہ لوگ نوجوان ہیں اور عورتوں کی یہ آزادی اس لئے چاہتے ہیں تاکہ جہاں موقع میسر آئے یہ عورتیں ان کی تفریح کا سامان بن سکیں۔ ان کے ہاں کھانے کی میزوں پر سب سے زیادہ پردہ ہی بحث کا موضوع ہوتا ہے اور یہ لوگ تصویر کا دوسرا رخ کبھی دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

میں کیپٹن ظفر اللہ محمود کے ہم خیال دوسرے لوگوں کی توجہ انہی دنوں کی صرف اس خبر کی طرف

مبذول کرانا چاہتا ہوں جس میں ان زنانہ نیشنل گارڈوں کا ذکر تھا جن کا معاملہ نرسنگ اور دوسرے ڈاکٹری شعبوں میں بھرتی کے لئے زیر غور تھا اور اسی سلسلہ میں ان کے ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس ڈاکٹری معائنہ کا خوفناک نتیجہ بیان کرنے سے میں دانستہ احتراز کرتا ہوں۔ یہی ایک بات ہمارے سمجھدار دوستوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔[1] آخر اس کی وجہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ (حقیقت پسند) لاہور۔

اگر آپ یہ اندازہ کرنا چاہیں کہ دفاع ملکی اور ملکی ذخیرات کے خشک و بے مزہ اور کڑے کھیلے کاموں کو ہماری اس زنانہ نیشنل گارڈ نے کس قدر لذیذ اور پرکشش بنا دیا ہے تو اس کے لئے اس کی تسویں بٹالین کے اس تفریحی پروگرام کی روئداد ملاحظہ فرمائیے جو کنگ ہال میں زیر سرپرستی بیگم لیاقت علی خاں ۲۷، ۲۸، ۲۹ اگست کی تاریخوں میں منعقد ہوا۔ یہ روئداد ڈان میں اس کے نامہ نگار کے قلم سے شائع ہوئی ہے۔ نامہ نگار لکھتا ہے:۔

• پاکستان زنانہ نیشنل گارڈ کا تیسواں بریگیڈ گذشتہ تین روز سے ایک نایاب نظارہ جمال فراہم کر رہا ہے۔ لوگ جب کسی نیک مقصد میں مدد کے لئے خیراتی فنڈ کا کوئی تماشہ دیکھنے جاتے ہیں تو ٹکٹ خریدتے ہوئے عموماً وہ کسی اونچے معیار کی توقع نہیں رکھتے اس وجہ سے ان کے لئے یہ پرمسرت اور تعجب انگیز امر تھا جب انہوں نے دیکھا کہ موسیقی، رنگ اور رنگین ملبوسات کا ایک طوفان ان پر امنڈ پڑا......

تماشہ کی ابتداء سازندوں کے ایک طائفہ سے کی۔ نوخیز، خوش جمال اور خوش پوشاک لڑکیاں ستار، سارنگ، وائلن اور بانسری پورے کمال فن کے ساتھ بجا رہی تھیں۔ یہ انبوہ جمال و موسیقی دیکھنے والوں اور سننے والوں کے لئے جنت نگاہ و فردوس گوش تھا۔ پھر چھ ماہ وش لڑکیوں نے مغل ناچ شروع کیا۔ یہ ناچ حسن و شباب اور مسرت و انبساط کا پورا پورا مظاہرہ تھا۔ منی پوری ناچ تو کمال فن کا ایک نادر نمونہ تھا جو ایسے تفریحی تماشوں میں دیکھنے کا کم ہی اتفاق ہوتا ہے۔ مصری ناچ اپنی خصوصیات کے مطابق حرکاتی تیزی اور نغماتی ہم آہنگی کا ایک دلکش مرقع تھا۔ پھر پنجاب کا مشہور دیہاتی ناچ لڈی

[1] نامہ نگار صاحب کی یہ سادہ مزاجی قابل داد ہے کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ اس طرح کے خوفناک نتائج ان حضرات کی آنکھیں کھولنے والے ثابت ہوتے ہیں۔ یہی تو وہ چاہتے ہیں کہ یہ مبارک نتائج برآمد ہوں اور ان میں زیادہ سے زیادہ حصہ خود ان کا ہو۔

تو بس طوفان نغمہ و رنگ تھا۔ ستار پر مسز نذیر احمد کا نغمہ تنہائی اوداس پر رنگ برنگ روشنیوں کا بہا آواز کے جادو کو دوبالا کر رہا تھا۔ پردے کے پس منظر میں غالب کی غزل سے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے

ایسے دل آویز انداز میں گائی جا رہی تھی کہ دل کے تاروں کو مرتعش کیے دیتی تھی ....

رنگ و لباس اس تفریحی تماشہ کی دو بڑی خصوصیتیں تھیں۔ ان خصوصیتوں کا مظاہرہ سوزن کاری کی فیشن پریڈ کے ذریعہ کیا گیا۔ مسلمانوں کے مختلف قسم کے ملبوسات آب و تاب، ریشمی چمک اور جواہراتی دمک کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ دہلوی بیگمات اپنی ناممکن التقلید خصوصیات کے ساتھ، حیدرآبادی بیگم آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے پرشکوہ ملبوس میں، لکھنوی بیگم اپنے مخصوص ناز و ادا کے ساتھ جو واجد علی شاہی دربار کا طرۂ امتیاز تھا، رامپوری بیگم اپنے دل ربا انداز میں نئی پاکستانی خاتون قدِ کے لوچ کے ساتھ نئی تیزی اور نفاست لئے ہوئے میمن اور سورتی بیگمات اپنے دل آویز کاڑھے ہوئے ملبوسات کے ساتھ اسٹیج کے آر پار تھرک تھرک کر ایک ہوش ربا منظر پیش کر رہی تھیں۔

تماشہ کا اختتام درجن بھر عورتوں کی دل فریب قوالی سے کیا گیا۔ نصرت یہ کہ موسیقی اور نغمہ کسی بہتر سے بہتر قوالی کے معیار کا تھا بلکہ ان پُرفن عورتوں نے تو اپنے پُرسحر ناز و ادا سے قوالی میں کمال ہی کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کامیابی میں ان کے حسن و لباس کو بہت کچھ دخل تھا۔

نغمہ و رقص سے مرکب چار سین کا ایک پرمذاق ڈراما بھی پیش کیا گیا جس کا نام جیت تھا۔ یہ ایک مسلمان رئیس کے گھر کا نقشہ پیش کرتا تھا........ ہیروئن مسرت و انبساط کی تصویر تھی۔ مذاق اور شوخی و شرارت سے بھری ہوئی اداکاری اور فقرہ کاری کا مرقع۔ تینوں منگیتر نہایت زور آور نوجوان تھے لیکن جیتنے والا حمید کو فتح نصیب ہوئی تھا........

بیگم لیاقت علی خاں دلی مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے کمال مہربانی سے سرپرستی فرما کر اس تماشہ کو پیش کرنے کی ہمت افزائی فرمائی۔ یہ صرف انہی کی پرتجسس نگاہیں تھیں جنہوں نے بہت سے پوشیدہ جواہرات کو ڈھونڈ نکالا۔ آرٹ اور اس کے متعلقات سے ان کی دلچسپی نے ہماری معاشرہ

میں آرٹ اور موسیقی کو دوبارہ زندگی بخشی ہے

یہ تماشہ کہاں تک پسند کیا گیا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ تماشہ کے دوران میں قریب قریب ہر پیشکش پر ریلیف فنڈ کے لئے عطیات کے اعلان ہوتے رہے۔

(ڈان مورخہ ۳۰ اگست ۵۰ء)

یہ ہے ہماری اس زنانہ نیشنل گارڈ کی تصویر جس کو اس وقت پاکستان کی دفاعی تیاریوں میں ا۱ کی اہمیت حاصل ہے، یہ ہے ہماری وہ فوج ظفر موج جس کے لئے قرآن و حدیث سے دلیلیں فراہم کی گئی ہیں کہ مسلمان خواتین رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جنگی کاموں میں حصہ لیتی تھیں، یہ ہیں وہ طریقے جن میں ماہر ہو جانے کے بعد ہماری بہنیں اور بیٹیاں دشمنوں کے چھکے چھڑا دیں گی اور یہ ہیں وہ اسلامی طریقے جن سے ہماری قوم کا جذبہ انفاق فی سبیل اللہ ابھرتا ہے اور جن سے کام لے کر وہ اپنے جہاد کے لئے روپے فراہم کرتی ہے !!

زنانہ کالجوں کا رنگ ہمارے زنانہ کالجوں میں لڑکیوں کو جس طرح اسلامیت کے رنگ میں رنگا جا رہا ہے اس کے ثبوت میں صرف مس فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور کا حوالہ دے دینا شاید کافی ہوگا۔ اخباروں میں آئے دن اس کالج سے متعلق ایسی تصویریں چھپتی رہتی ہیں جن میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے وزراء یا حکام عالی مقام میں سے کوئی بزرگ نہایت شان سے براجمان ہیں اور ان کے ارد گرد کالج کی طالبات اور معلمات اس طرح جمع ہیں جس طرح شمع کے گرد پروانے جمع ہوں۔

لاہور کا اسلامیہ کالج فار ویمن ایک پردہ کالج ہونے کے لحاظ سے مشہور رہا ہے۔ اب ہمارے ارباب کار اس کو جو شکل دینے کی کوشش کر رہے ہیں اس کا اندازہ ذیل کے مراسلہ سے فرمایئے جو سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کی ۲۰ جنوری ۴۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ایک طالبہ کا باپ اخبار مذکور کے ایڈیٹر کو لکھتا ہے۔

"جناب من،

زنانہ اسلامیہ کالج لاہور خالصۃً باپردہ ادارہ رہا ہے اور اسی بنا پر اسے مسلمانوں سے عطیات اور امدادی خیراتی رقوم حاصل ہوتی رہی ہیں۔ مگر آج کل ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کالج میں ایسے مرد اور ان کے دوست احباب آتے ہیں جن کا اس ادارے سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ جب ایسے لوگ

کالج میں آتے ہیں۔ اور یہ وقتاً فوقتاً آتے ہی رہتے ہیں۔ تو لڑکیوں کو کھلم کھلا ننگے سر اور بے نقاب رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ میں ایک طالب کے والد کی حیثیت سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اب یہ کالج با پردہ نہیں رہا؟ تو پبلک کو اس سے آگاہ کیوں نہیں کیا گیا؟ [1]

(ایم، اے مجید قریشی۔ لاہور)

مخلوط کالجوں کا سوال لڑکوں اور لڑکیوں کے مخلوط کالجوں اور اسکولوں کے متعلق ہر معتدل مسلمان کو یہ گمان تھا کہ تہذیب شیطانی کی یہ لعنت کبریٰ پاکستان بننے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کی جائے گی لیکن اوپر بیگم لیاقت علی خان کا بیان آپ پڑھ چکے ہیں کہ آزادی نسواں اور پردہ شکنی کے لئے جو جہاد انہوں نے شروع کر رکھا ہے اس میں اپنی ساری کامیابی کا انحصار وہ انہی کالجوں پر سمجھتی ہیں۔ انہی کالجوں کے اندر، ان کے خیال میں اس فوج ظفر موج کے افسر اور کمانڈر تیار ہو رہے ہیں جو اس ملک میں اس خالص اسلامی تہذیب کو قائم کریں گے جس کے لئے بیگم صاحبہ میلاد کی مجلسوں میں والہانہ انداز میں تقریریں فرمایا کرتی ہیں اور جس کے قائم کرنے کے لئے ان کے محترم شوہر نے پاکستان دستور ساز اسمبلی میں مشہور قرارداد مقاصد پاس کرائی ہے۔

ان کالجوں میں پڑھنے والیوں اور پڑھنے والوں کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ ایک واقعہ یاد آگیا ہے جس کو ہم محض اس خیال سے یہاں ذکر کرتے ہیں کہ اس سے فی الجملہ اندازہ ہو سکے گا کہ موجودہ تعلیم کس قماش کے اشخاص تیار کرتی ہے اور کس ذہنیت اور کس مذاق کے لوگ ہیں جن کو اس نظامِ تعلیم میں یہ درجہ بخشا گیا ہے کہ وہ ہماری نوجوان نسل کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک مکتب میں بٹھا کر تعلیم دے رہے ہیں اور پھر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس سے اخلاق بگڑتے نہیں بلکہ بن رہے ہیں۔

غالباً اپریل ۴۸ء کا واقعہ ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور ان کے بعض رفقاء کو پاکستان کے ایک کالج میں تقریر کے لئے دعوت دی گئی جو لڑکوں اور لڑکیوں کا مخلوط کالج تھا۔ جہاں کی تقریر سننے کے لئے

---

[1] نامہ نگار صاحب سے گزارش ہے کہ جب پبلک اتنی اندھی ہو جائے کہ دن دہاڑے اور ڈنکے کی چوٹ جو کچھ کیا جا رہا ہے اسے نظر نہ آئے تو آخر اسے کیوں نہ بتایا جائے۔ وہ تو اپنے سامنے دنیا بیوقوفوں کی بستی ہے The world is full of fools کا قاعدہ کلیہ رکھ کر چل رہے ہیں۔ اور ان کا اب تک کا تجربہ اسی قاعدہ کی تصدیق کرتا ہے۔

ہال میں جس طرح لڑکے جمع ہوتے اسی طرح طالبات بھی جمع ہوئیں اور تہذیب جدید کے آداب کے مطابق لڑکیاں ہال کی اگلی بنچوں پر بیٹھیں اور ایک آدھ کے سوا سب بہنیں بے نقاب تھیں۔ جب حاضرین اور مہمان اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو کالج کے پرنسپل صاحب معزز مہمان کے خیر مقدم اور حاضرین سے ان کے تعارف کے لئے کھڑے ہوئے اور اپنی فصیح و بلیغ تقریر کا آغاز انہوں نے ایک مصرعہ سے فرمایا جس کو اپنے ادبی ذوق اور اخلاقی حس دونوں پر انتہائی ظلم کرکے میں محض اس لئے نقل کر رہا ہوں کہ ناظرین اس سے عبرت حاصل کر سکیں۔ مصرعہ یہ تھا۔

۶۔ خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

پرنسپل صاحب نے یہ مصرعہ اس بے تکلفی سے پڑھ دیا گویا خطبہ مسنونہ تلاوت فرما رہے ہیں اور دوسروں کا تو پتہ نہیں مگر میرا جو حال ہوا اس کا اندازہ اس سے فرمایئے کہ باوجودیکہ اب اس واقعہ پر ایک مدت گذر چکی ہے لیکن آج بھی اگر اس اجتماع اور اس مصرعہ کا خیال آجاتا ہے تو مجھے ایسی شرمندگی ہوتی ہے کہ گویا اس مصرعہ کے پڑھنے کا جرم پرنسپل صاحب سے نہیں بلکہ مجھ سے ہی صادر ہوا تھا۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے مقصود کسی خاص کالج اور اس کے پرنسپل صاحب کو زیر بحث لانا نہیں ہے بلکہ مقصود محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن مخلوط کالجوں کی نسبت بیگم لیاقت علی خاں صاحب اور ہمارے ارباب کار کو یہ گمان ہے کہ ان کے اندر اس ملک میں آئندہ قائم ہونے والی تہذیب کے نمونے ڈھالے جا رہے ہیں ان کے طلبہ اور طالبات تو الگ رہے ان کے پرنسپلوں کے مذاق سلیم کا یہ حال ہے کہ ان کی صحبت سے ثقہ اور سنجیدہ لوگوں کو پرہیز کرنا واجب ہے۔

ڈرامے اور مینا بازار آزادی نسواں اور پردہ شکنی کی اس تحریک ہی کو مقبول بنانے کے لئے ڈراموں، ناچ گانے کی مجلسوں اور مینا بازاروں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے جس کی ہر دلعزیزی اس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے کہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید پاکستان میں تہذیب و ثقافت نام ہی ان چند چیزوں کا رہ جائے گا۔ ڈراموں میں بیشتر زنانہ نیشنل گارڈز، کالجوں کی طالبات اور سرکاری اداروں کی پناہ گزیں لڑکیاں حصہ لیتی ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اس "آرٹ" کو فروغ دینے کے لئے ہمارے اندر سے ایک مستقل طبقہ اس تحریک کے کارکنوں کے

ہاتھ آگیا ہے جو عجب نہیں کہ بگڑتے بگڑتے ایک دن اسکو پیشہ بنا بیٹھے۔

مینا بازار پاکستان میں بیگم لیاقت علی خاں صاحب کی اولیات میں سے ہے۔ انہوں نے کراچی میں اس کا آغاز فرمایا اور اب یہ حال ہے کہ پاکستان میں قومی و ملی مقاصد کے لئے روپے اکٹھے کرنے کا اسکو واحد کامیاب ذریعہ خیال کیا جانے لگا ہے۔ پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں کراچی کے مینا بازار کی تقلید کی جا چکی ہے اور جو شہر باقی رہ گئے ہیں وہ بھی جلد از جلد اس اسوۂ حسنہ کی پیروی سے سعادت اندوز ہونے کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ مینا بازار بظاہر تو اس غرض کے لئے منعقد کیے جاتے ہیں کہ ان سے قومی اغراض کے لئے روپیہ اکٹھا کیا جائے لیکن درحقیقت ان کا مقصد عورتوں کو اس آزادی و بے قیدی کی چاٹ لگانا ہے جو اس ملک کے ارباب اقتدار یہاں پھیلانے کے دل سے خواہشمند ہیں[1]۔ چنانچہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہاں مینا بازار کی ایک خاص قسم رائج کی گئی ہے جو پردہ شکنی کی تحریک اور جنسی جذبات کو بھڑکانے میں خاص طور پر معین ہے اور چونکہ جنسی جذبہ کی زود اشتعالی اور اثر انگیزی معلوم ہے اور اس کے ذریعہ سے بڑی آسانی کے ساتھ عوام کی بھیڑیں اکٹھی کی جا سکتی ہیں اس لئے اس نسخہ کو پوری آزادی کے ساتھ استعمال کیا جا رہا ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ قوم کو اگر ایک آزاد اور طاقتور قوم کی حیثیت سے زندہ رکھنا ہے تو اسکو ایسی تربیت دینے کی ضرورت ہے کہ اس کے اعلیٰ قومی و مذہبی جذبات بیدار ہوں اور تمام پیش نظر مہمات میں وہی جذبات اس کی رہنمائی کریں۔ اگر ہر کام ناچ گانے کی محفلوں، ڈراموں اور مینا بازاروں ہی کے واسطہ سے لیا گیا تو کچھ عرصہ کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ایک جنسی جذبہ کے سوا اس قوم کے دوسرے سارے جذبات بالکل مردہ ہو جائیں گے یہاں تک کہ اگر آپ کوئی مسجد بنانے کے لئے بھی اس سے چندہ مانگیں گے تو اس وقت تک وہ آپ کو ایک حبہ نہیں دینے کی جب تک آپ پہلے اسکو مینا بازار کی سیر نہ کرائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں یہ ذوق روز بروز ترقی کرتا جا رہا ہے اور مینا بازاروں کی نت نئی قسمیں ایجاد ہوتی جا رہی ہیں۔

۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ایک مینا بازار سیالکوٹ میں لگایا گیا تھا۔ اس کا افتتاح پاکستان کے کمانڈر انچیف سر

---

[1] اس کا اندازہ کرنے کے لئے ناظرین کو ۲ مارچ ۱۹۴۹ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں کراچی کے مینا بازار میں مسز بیگم لیاقت علی خاں صاحب اور ملک غلام محمد صاحب وزیر خزانہ پاکستان کی ملاقات کی ایک تصویر دیکھ لینا کافی ہوگا۔

ڈنگھم بگ ریسی نے فرمایا۔ اس کے پروگرام میں ایک دن عورتوں کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ اُس خاص دن کے متعلق ایک خاتون کا بیان ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے عینی مشاہدہ کے بعد اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع کردیا ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوسکیگا کہ پاکستان میں مینا بازاروں کا مقصد کیا ہے۔ خاتون مذکور لکھتی ہیں:-

"جناب من"!

سیالکوٹ چھاؤنی میں جو مینا بازار لگایا گیا تھا اس کے متعلق یہ اعلان کیا گیا کہ اس کا دوسرا دن عورتوں کے لئے خاص ہوگا۔ میں یہ اعلان ہی سن کر حیران رہ گئی تھی کیونکہ مینا بازار تو کہتے ہی اس بازار کو ہیں جو عورتیں عورتوں کے لئے لگائیں۔ لیکن جب میں اس مینا بازار میں گئی تو وہاں کا رنگ ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ وہاں کی ہر چیز کو اپنی توقعات کے بالکل برعکس پایا۔ تقریباً سبھی دوکانوں اور اسٹالوں کو مرد ہی چلا رہے تھے اس احاطہ میں سب سے نمایاں چھ پولیس افسر تھے جو اس نمائش کے وسط میں براجمان تھے۔ اس سے بھی زیادہ مضحکہ انگیز وہ چار جی۔ ایم۔ پی کے آدمی تھے جو ہر طرف پھر رہے تھے۔ تقریباً سو آدمی مختلف ٹولیوں میں برطرف گشت لگا رہے تھے"!

بیگم ایم بشیر سیالکوٹ

(سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور ۱۹ ردسمبر ۴۹ء)

بیرونی ممالک میں ہماری خواتین کا تعارف آزادی نسواں کی یہ تحریک اب اندرون ملک ہی تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ اسکی منادی دوسرے ممالک میں بھی شروع ہوگئی ہے۔ آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی ششماہی رپورٹ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی خواتین نے بیرونی ممالک سے اپنے تعلقات جس قدر وسیع کر لئے ہیں خود حکومت پاکستان بھی اپنے تعلقات اب تک اس قدر وسیع نہیں کرسکی ہے۔ یہاں تک کہ بعض وہ اخبارات بھی جو اس تحریک کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش ہیں، اس وسعت تعلقات کو دیکھ کر گھبرا اٹھے ہیں اور وہ عورتوں کو مشورہ دینے لگے ہیں کہ وہ اپنی سرگرمیاں اندرون ملک ہی تک محدود رکھیں تو زیادہ اچھا ہے۔ بیرونی ممالک میں ہماری اسلامی حکومت کی خواتین جس پہلو سے متعارف ہو رہی ہیں اسکو واضح کرنے کے لئے ہم یہاں اس فلمی کارگذاری پیش کرتے ہیں جو آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی طرف سے امریکہ میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی

زنانہ نمائش میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو سکیگا کہ جہاں ہر مذہب ملت کی خواتین نے اپنی اپنی تہذیب و روایات کی نمائش کی وہاں ایک خالص اسلامی حکومت کی نمائندہ خواتین نے اسلامی تہذیب و روایات کے کیا نمونے دکھائے۔

"بین الاقوامی زنانہ نمائش کا چھبیسواں سالانہ اجلاس جو ۷ نومبر ۱۹۴۹ء کو نیویارک میں شروع ہوا اس میں پاکستان کی نمائندگی بیگم حسین ملک (قائد وفد) بیگم نذیر احمد اور مسز پراٹ نے کی......

شام کو پاکستانی وفد (بیگمات مذکورہ) نے حاضرین کی تواضع کے لئے ایک دلچسپ پروگرام پیش کیا...... بیگم حسین ملک نے جنہوں نے اس پروگرام کا افتتاح کیا پاکستانی عورتوں کی طرف سے امریکن عورتوں کو خیر سگالی کا پیغام پہنچایا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ پاکستانی عورتوں کو تعمیر ملی کے کاموں میں عملاً شریک کرنے کے لئے ان کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جاتی ہے .... پردہ کے نفاذ سے عورتوں کو ان کے سیاسی اور شہری حقوق سے محروم کرنا مقصود نہیں تھا۔[1] بہر حال اب پردہ پاکستان سے بڑی تیزی سے رخصت ہو رہا ہے۔ بیگم حسین ملک کے بعد بیگم نذیر احمد نے حاضرین کو پاکستانی گیت سے محظوظ کیا۔ پروگرام کے آخر میں مشہور رقاصہ زہرہ اور اس کے ساتھی نے مغلوں کا درباری رقص پیش کیا۔[2]

اس پروگرام میں ہمارے سفارت خانہ کے افسروں، ان کے متعلقین، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شریک ہونے والے پاکستانی وفد کے ارکین اور امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کی ایک کثیر تعداد شریک تھی۔"

(۲۳ اور ۲۵ نومبر ۴۹ء۔ ڈان۔ کراچی)

پاکستانی خواتین کی ترقی پر نیویارک کے کرسچین سائنس مانیٹر" Christian Science Monitor میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جو ڈان کراچی نے اپنی ۲۹ دسمبر ۴۹ء کی اشاعت میں نقل کیا ہے۔ ہم اس کا ضروری

[1] بیگم صاحبہ نے یہ 'ناچ بھی (معذرت) خالصتاً اسلام کی طرف سے پیش کیا ہے جس کے لئے وہ مسلمانوں کی طرف سے شکریہ کی مستحق ہیں۔

[2] انصاف کے ساتھ فرمائیے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان نہ قائم ہوا ہوتا تو اس عظیم الشان اسلامی رقص کا شاندار مظاہرہ کون کرتا اور امریکہ جیسے دور دراز کفرستان میں آج اس کا مظاہرہ کر کے اسلام کا بول بالا کون کرتا !!

خیالات یہاں پیش کرتے ہیں۔ اس سے بھی اندازہ ہو سکیگا کہ باہر کی دنیا میں پاکستانی خواتین کے حال اور مستقبل کو کس نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے اور کس عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔

"نیویارک ۲۰ دسمبر: پاکستانی خواتین برابر ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھ رہی ہیں...... ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یعنی پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی، آزاد قومی زندگی کی لہر حرم کے اندرونی گوشوں تک پہنچ گئی۔ بہت سی پردہ نشین عورتوں نے بھی آزادی کا مطالبہ کیا اور یک لخت ان میں سے سینکڑوں دبلے زرد ڈھانچے لئے ہوئے پناہ گزینوں کی مدد کے لئے گھروں سے باہر نکل آئیں.....

بیگم رعنا لیاقت علیخاں ———— وزیراعظم پاکستان کی نرم و نازک، زندہ دل، حسین بیوی۔ نہایت ہوشیاری کے ساتھ پردہ کو سر سے اڑا دینے کی خواہاں اور اس کے دقیانوسی حامی گروہوں کے بین بین راستہ اختیار کر رہی ہیں...... حال ہی میں صوبہ سرحد میں ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ پاکستانی گورنر کو خوش آمدید کہنے کے لئے سینکڑوں پٹھان عورتیں گھروں سے باہر نکل آئیں"۔ (ڈان، کراچی، مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء)

"شاہ ایران کے ساتھ جو ایرانی اخبار نویس پاکستان آئے تھے انہوں نے واپس جا کر اپنے اخبارات میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ان کا ایک نمونہ مسٹر ممتاز احمد خاں صاحب جو شاہ کے ہمراہ طہران گئے تھے، کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔

ممتاز احمد خاں صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"...... ایرانی اخبار نویسوں نے جو شاہ ایران کے ساتھ پاکستان آئے تھے، واپس جا کر پاکستان پر

لہ قرآن نے جن خواتین کو مسلمان عورتوں کی رہنمائی پر مقرر کیا ان کے اوصاف سورہ احزاب میں یہ گنائے ہیں: مسلمات (خدا کی فرمانبردار)، مومنات (خدا پر ایمان رکھنے والیاں)، قانتات (مطیع)، صادقات (راستباز)، صابرات (ثابت قدم)، خاشعات (خدا ترس)، متصدقات (صدقہ دینے والیاں)، صائمات (روزہ رکھنے والیاں)، حافظات (اپنے ناموس کی حفاظت کرنے والیاں)، ذاکرات (اللہ کو یاد رکھنے والیاں) (احزاب: ۳۵) لیکن یہ اوصاف تو بیول نامزد کی گئی دقیانوسی قیادت کے ہیں۔ نئی قیادت جن محاسن سے مسلح ہو کر میدان میں آئی ہے وہ نرمی و نزاکت اور زندہ دلی اور حسن ہے۔ ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا!

ہر پہلو سے بہت ہی ہوشربا مضامین لکھے اور ان میں پاکستان کی فوج سے لے کر اسکی شاندار ساڑیوں اور غراروں تک ہر شے کا ذکر کیا۔

ہفتہ وار اخبار ترقی کے ایڈیٹر آقائے لطف اللہ صاحب نے لاہور پر ایک مضمون لکھا جس میں پاکستانی عورتوں کی دولتِ حسن کو، جو ملک کے ہر حصے سے اس خوب صورت رومانی شہر میں جمع ہوگئی تھی، بہت نمایاں کر کے بیان کیا۔ اپنے اس مضمون میں انہوں نے "حسنِ نمکین ہندی" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ایران کے قدیم شاعروں، مصنفوں اور سیاحوں نے ہندی لڑکیوں کی غزال چشمی کے جو نقشے کھینچے تھے آج کا لاہور اس کا ہو بہو نقشہ پیش کرتا ہے ....

یہ مضامین دکانوں، ہوٹلوں، بازاروں اور گھروں میں، ہر جگہ، خوب مزے لے لے کر اور شوق سے پڑھے گئے"۔ (سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۴ اپریل ۵۰ء)

زہر آلود تحریریں اس تحریک کو جلدی سے جلدی کامیاب بنا دینے کے لئے جس قسم کا لٹریچر رات دن فراہم ہو رہا ہے اور وہ جس طرح بے روک ٹوک اخبارات و رسائل کے ذریعہ سے گھر گھر پہنچ رہا ہے افسوس ہے کہ اسکی پوری تفصیل پیش کرنا سردست میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ تاہم چند مراسلات کے نمونے نذرِ ناظرین ہیں۔ ان سے آپ اندازہ فرما سکیں گے کہ ہماری اس اسلامی حکومت کے ارکان جو اپنی ذات پر معمولی سے معمولی تنقید بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور اگر کوئی اخبار یا رسالہ بھول کر بھی ان کی شان میں ایک حرف نکتہ چینی کی قسم کا لکھ دیتا ہے تو فوراً چراغ پا ہو جاتے ہیں اور اس "غدار" کی سیفٹی ایکٹ سے خبر لے ڈالتے ہیں، وہ کتنے روادار اور فیاض و عریت نواز واقع ہوئے ہیں اس قسم کی تحریروں کے لئے جو ان کے اس محبوب مقصد "آزادی نسواں" کو تقویت پہنچاتی ہیں اگرچہ ان میں خاندانِ رسالت اور صحابہ و صحابیات کی کھلی ہوئی توہین کی گئی ہو، اگرچہ ان میں ہمارے تمام اسلاف صالحین کو بد اخلاق ٹھہرایا گیا ہو، اور اگرچہ ان کے ایک ایک حرف سے اسلاف کے خلاف غصہ اور نفرت کی بو پھوٹ رہی ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

راولپنڈی کے کوئی بزرگ کیپٹن لطف اللہ پوشنی ہیں۔ ان کا ایک مراسلہ جو سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کی ۲۷ اپریل ۴۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، ملاحظہ ہو:-

" جناب مس جہان نے میرے خط کا جو جواب دیا ہے اس نے اس تیزی کی یاد تازہ کر دی ہے جو مدتوں

قید رہنے کی وجہ سے اُس کوٹھری ہی سے محبت کرنے لگ جاتا ہے جس میں وہ بند رکھا گیا ہو۔

ہاں میں جانتا ہوں کہ پیغمبر کی بیٹی فاطمہ پردہ کرتی تھیں۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ قائدِ اعظم کی بہن فاطمہ ویسا نہیں کرتیں، اور یہی (موخر الذکر فاطمہ کا) طریقہ صحیح[1] ہے۔ کیونکہ ہمارا ملک دوسرا ہے، ہماری دنیا دوسری ہے، ہمارے حالات دوسرے ہیں اور یہ سب کچھ اس سے مختلف ہے جو تیرہ سو سال پہلے تھا۔[2]

یہ بالکل بے تکے پن سے ہر معاملہ میں قدیم زمانہ سے جواز تلاش کرنے کا رجحان صرف احمقانہ[3] ہی نہیں بلکہ

---

[1] یہ تقابل ملاحظہ ہو مس فاطمہ جناح کا حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو تمام خواتینِ جنت کی سردار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں اور جن کی زندگی تمام خواتینِ امت کے لئے نمونہ اور جن کی محبت لازمۂ ایمان قرار دی گئی ہے۔ پھر بہتر طریقہ ملاحظہ ہو کہ اس تقابل میں مس فاطمہ جناح کے طریقِ زندگی کو اہلِ بیت رسالت کے اسوۂ حسنہ پر کھلم کھلا ترجیح دی گئی ہے لیکن ہماری اسلامی حکومت کے اکابر میں سے کسی کی غیرت بھی اس پر حرکت میں نہ آئی۔ پچھلے دنوں کسی اخبار کی محض اس اطلاع پر کہ امریکہ کی کسی فلم کمپنی کی کسی فلم میں کسی نوعیت سے حضرت فاطمہ کا ذکر آگیا ہے پاکستان کے مسلمانوں کی غیرتِ ایمانی بھڑک اٹھی تھی حالانکہ وہ محض افواہ ہی افواہ تھی اور یہاں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک شخص سیدۂ پاک کی کھلی کھلی توہین و تحقیر کر رہا ہے لیکن کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ ہمارے بعض بزرگ مسلمانوں کی اس معاملہ میں بھی قربانیاں ہونے ہیں کہ وہ خود اپنے بزرگوں اور ائمہ دین کی چاہے جتنی توہین کر ڈالیں مگر کوئی دوسرا ان کے خلاف زبان کھولے تو اس کی جان ایک کر کے رہیں۔ [2] جب سب کچھ دوسرا ہے تو صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہمارا دین بھی دوسرا ہے۔ اسلام کا انکار کر کے تم جس راہ پر چاہو جاؤ جس کو چاہو اپنا امام اور ہادی بناؤ کسی مسلمان کو تم سے بحث نہیں ہوگی۔ لیکن مسلمان کہلا کے تمہیں ان کی توہین کرنے کا کیا حق ہے جن کی پیروی امت کے لئے جزوِ ایمان اور ذریعۂ نجات قرار دی گئی ہے؟ [3] آپ کچھ سمجھے کہ یہ ذات شریف کس بات کو احمقانہ قرار دے رہے ہیں؟ اس بات کو کہ مسلمان ہر معاملہ میں رسول اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقہ سے سند ڈھونڈنے کی کوشش کریں، ہر امر میں خلافتِ راشدہ اور سلفِ صالحین کے تعامل کی دلیل تلاش کریں، ہر قدم اٹھاتے وقت اس بات کی جستجو کریں کہ پیغمبر اور صحابہ کی زندگی کی روشنی میں یہ قدم اٹھانا صحیح ہے یا غلط؟ یہ رجحان ان حضرت کے نزدیک احمقانہ ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ مراسلہ اس اخبار میں شائع ہوا ہے جو ۱۹۵۰ء کے وسط میں سیفٹی ایکٹ کے تحت تین مہینے کے لئے اسی جرم میں بند کیا گیا کہ اس نے کشمیر کے متعلق ایک ایسی افواہ چھاپ دی تھی جس سے ہمارے وزیرِ اعظم صاحب کے متعلق عوام میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن اسی اخبار نے جب مسلمانوں کے اتباعِ صحابہ و رسول کے فعل کو احمقانہ اور خطرناک قرار دیا تو کسی کو اس کی فکر

خطرناک بھی ہے۔ اس کا نتیجہ سماجی جمود اور ذہنی پستی ہوگا۔

بہن جبین! سنو! آپ کی جو بہنیں قید سے رہائی پا چکی ہیں ان پر تتلیوں اور بھیوں کی پھبتی چست کرکے اپنے دل کو اطمینان دلانے کی کوشش نہ کرو۔ اپنے دل کے اندرونی گوشوں میں تم جانتی ہو کہ تتلیاں اُڑ سکتی ہیں اور بلبلیں گا سکتی ہیں مگر تم پنجرے میں بند زرد چڑیا کی مانند رہائی یافتہ ساتھیوں پر حسرت بھری نظر سے تکتی ہوئی محض چیں چیں ہی کر سکتی ہو۔"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۴۹ء)

ایک صاحب احساس صاحبہ کا ایک مراسلہ ملاحظہ ہو جو مذکورہ بالا اخبار کی ۳۰ اپریل ۱۹۴۹ء کی اشاعت کی زینت ہے وہ اخبار کے ایڈیٹر کو مخاطب کرکے رقمطراز ہیں۔

"جناب من!

اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ روزانہ زندگی کے مسائل کو حقیقت پسندانہ طریق پر حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ پردہ کے معنی چہرے کو اس طرح چھپانے کے نہیں ہیں جس طرح ہمارے ہاں چھپایا جاتا ہے۔ اصل شے اخلاقی طرز عمل ہے۔ ہم عورتوں پر پردہ ان لوگوں نے ٹھونسا تھا جن کی اخلاقی حالت کوئی بلند نہیں تھی[1]۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے اخلاق کو بآسانی بلند نہیں کر سکتے اس لئے انہوں نے عورتوں کو اس ظالمانہ طریقہ سے قید کر دینے کی راہ نکال لی اور وہ سمجھے کہ اس غرض پر قابو پانے کا یہی ٹھیک طریقہ ہے .... اس میں شک نہیں کہ اگر ہم (عورتیں) بھی مردوں کی طرح باہر پھرنے لگیں تو شروع شروع میں ہمیں کچھ تکلیف ہوگی مگر یہ صرف عارضی شے ہوگی۔ جب ہم سب اس کے عادی ہو جائیں گے تو کوئی بھی ضرورت سے زیادہ ہماری طرف متوجہ

[1] یہ اخلاقی پستی کا الزام صاحب احساس صاحبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ بلکہ نعوذ باللہ خود اللہ میاں پر بھی عاید کر رہی ہیں کیونکہ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ پردہ سے متعلق تمام جزئیات و تفصیلات خود قرآن پاک اور حدیث شریف میں بیان ہوئی ہیں اور ہمارے ائمہ و فقہا میں سے کسی نے بھی اُس "تبرج" کو جائز نہیں قرار دیا ہے جس کی حمایت میں موصوفہ یہ تقریر فرما رہی ہیں۔

نہیں ہوگا۔[ٹھ] ہمارے دیہات میں کوئی پردہ نہیں ہے۔ عورتیں آزادانہ پھرتی ہیں اور مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں[ٹھ] لیکن اس کے باوجود ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ اور وہ ٹھیک طرح سے رہتی ہیں۔

کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ شہروں میں بھی یہی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے؟ شہری لوگ تو بہرحال نسبتاً زیادہ ہی پڑھے لکھے اور زیادہ ذمہ داری کا احساس رکھنے والے ہوتے ہیں۔"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۵۲ء)

اس تحریک کو تقویت اور قوت پہنچانے کے لئے اسلامی تاریخ بالخصوص صدر اول کی تاریخ کو جس رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے اس کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ پاکستان ٹائمز لاہور کے میگزین سیکشن مورخہ ۴ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ایک بزرگ اپنے ایک مضمون کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:-

"پہلا ادبی مرکز جس کا ہماری موجودہ تاریخ پتہ چلا سکی ہے اس کے قائم کرنے کا فخر حضرت سکینہ کو حاصل ہوا جو سید الشہداء حضرت امام حسینؓ کی صاحبزادی اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی تھیں۔ مدینہ میں ان کا نصب کردہ محل وقت کے تمام بڑے بڑے نامور نحویوں، گویوں، شاعروں اور اہل علم کا مرکز تھا۔ عین اس زمانہ میں جب کہ بہادران اسلام کی تلواریں اسپین اور سندھ کو زیر نگیں کرنے میں مصروف تھیں، یہ نامور خاتون وقت کے ذہین طبقہ کے دلوں اور دماغوں پر حکمرانی کر رہی تھیں۔ یہ ایام اسلامی فتوحات کے ایام بہار تھے۔ ایک طرف ملک کے بعد ملک فتح ہو رہے تھے دوسری طرف اجتماعی اور تہذیبی دائروں کے اندر بھی فتح کے بعد فتح حاصل ہو رہی تھی۔

[ٹھ] یہی ہاں، بالکل اسی طرح جس طرح شہروں کے کلب میں اول روز پہنچنے تا ریتے ترتیبی شرم محسوس ہوتی ہے مگر کچھ مدت کے بعد کسی مرد و عورت کو یہ احساس تک نہیں رہتا کہ یہ بھی کوئی شرمناک چیز ہے۔ شاہ صاحب حسان خاتون اور ان کے ہم مشرب لوگوں کو شاید معلوم نہیں ہے کہ اگر ہمارے دیہات میں کوئی ان آزاد منش خواتین کے سے بناؤ سنگار کر کے ان کی سی چال چلتی ہوئی باہر پھرے اور مردوں کے ساتھ ان کی طرح خلا ملا رکھے تو شاید اسے گاؤں کے غیور لوگ زندہ ہی نہ رہنے دیں۔

حضرت سکینہ فیشن میں ہماری سب سے بڑی اور سب سے پہلی لیڈر ہیں۔ وقت کی تمام مجلسی خواتین ان کے طرّہ کی نقل کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور اسکو طرّۂ سکینہ کہا جاتا تھا۔ وہ موسیقی میں خاص دلچسپی لیتی تھیں چنانچہ انہوں نے اپنے ایک غلام سُریج نامی کو اس زمانہ کے شہرۂ آفاق گویّے طویس سے تربیت دلائی تھی۔

اس ادبی مرکز کے جواب میں ایک دوسرا ادبی مرکز، حجاز کے مشہور صحت افزا مقام طائف میں قائم تھا۔ اس مرکز کی روح رواں عائشہ تھیں جو مشہور صحابی حضرت طلحہؓ کی صاحبزادی تھیں۔ عائشہ کی ماں حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں جن کے نام ہی پر بھانجی کا یہ نام رکھا گیا تھا۔

ان کی کھلے بندوں پبلک میں آمد و شد حضرت سکینہ سے بھی زیادہ نمایاں اور جاذب نظر تھی۔ ایک مشہور قدیم مورخ نے لکھا ہے کہ ان کے دوسرے شوہر ابن زبیر نے جب ان کی اس بات پر اعتراض کیا کہ وہ کبھی چہرے پر نقاب نہیں ڈالتی ہیں۔ تو انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ جب خدائے جمیل نے مجھے اپنے فضل سے حسن و جمال بخشا ہے تو میں اس کے حسن صنعت کو لوگوں کی نگاہوں سے کیوں چھپاؤں۔ لوگ اس طرح خدا کی صناعی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔[1]

(پاکستان ٹائمز میگزین سیکشن۔ مورخہ ۴؍ اکتوبر ۴۹ء)

یہ اہل بیت رسالت اور خاندان صدیق اکبر کی بہو بیٹیوں کی تصویر کھینچی گئی ہے اور مضمون نگار صاحب نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ دعوٰے کیا ہے کہ یہی اس زمانہ کا عام رنگ تھا، اس طرح عورتیں کھلے بندوں اپنے حسن و جمال کی نمائش کرتی پھرتی تھیں تاکہ لوگ خدا کی صنعت کاری کی نشانیاں دیکھ سکیں، جگہ جگہ صحت افزا مقاموں پر نازنینان وقت لٹریری سیلون بنا کے بیٹھتی تھیں اور بھانڈ اور گویّے اور شعراء ان کے اردگرد جمع رہتے تھے۔ وہ فیشن کے نئے نئے نمونے ایجاد کرتی تھیں اور وہ نمونے مقابلہ کے بازاروں میں آتے تھے اور ترجیح و انتخاب کے بعد

[1] یہ پوری بکواس بلا حوالہ ہے۔ حدیث یا تاریخ کی کسی کتاب کا نام اشارۃً بھی نہیں دیا گیا ہے جس سے پتہ چل سکے کہ ان باتوں کا ماخذ کیا ہے اور ان کے تاریخی استناد کا کیا پایہ ہے۔ آگے ہم اس معاملہ کی اصل حقیقت واضح کریں گے۔

تمام شہروں میں پھیلتے تھے اور ولد الزنا لوگ حسن داوان کو قبول کرتے تھے۔

اسلامی تاریخ کا وہ دورِ مبارک جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر القرون سے تعبیر فرمایا ہے ان مضمون نگار صاحب کے نزدیک نسوانی ترقی کی ان تمام "نورانیتوں" سے منور تھا لیکن بعد میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کو اپنے آپ پر یا اپنی عورتوں پر اعتماد نہیں رہا اور انہوں نے عورتوں کی اس ترقی کو پیچھے دھکیل دیا۔ چنانچہ اس مضمون میں مضمون نگار صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"یہ تو بعد کے عباسیوں کے زمانہ میں جب اختلاط شروع ہوا تو عورتوں کی ترقی کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔ اس زمانہ میں بے حیائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ جن لوگوں کو اپنے آپ پر یا اپنی عورتوں پر اعتماد باقی نہ رہا انہوں نے عورتوں کو چہار دیواری کے اندر بند کر دیا۔"

اس قسم کی نادر تحقیقات جو یہ حضرات فرما رہے ہیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ان کی نگاہوں میں جلال و جمال تو سمایا ہوا ہے ہالی وڈ کے ایکٹرز اور ایکٹرسوں کا، اور وہی سوسائٹی جو ہالی وڈ میں قائم ہے یہ حضرات پاکستان میں بھی قائم کرنے کے متمنی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہالی وڈ کے نام سے ہالی وڈ کی تہذیب کو یہاں مقبول بنانا ممکن نہیں ہے اس لئے انہوں نے اس پر مدینہ اور طائف کے لیبل لگانے شروع کر دیئے اور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ہالی وڈ کی ساری تہذیب تو در حقیقت سرقہ ہے ہماری اس اسلامی تہذیب کا جو خیر القرون میں مکہ و مدینہ اور طائف میں رائج تھی لیکن بعد میں عباسیوں کے دورِ زوال میں آ کے اس تہذیب کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔

جن پاکیزہ خاندانوں کی تحقیقات کی یہ تصویر دکھائی گئی ہے ان کی تصویر ذرا ایک نظر اس رنگ میں بھی ملاحظہ فرمایئے جس رنگ میں قرآن نے ان کو نمایاں کیا ہے۔ اس سے اچھی طرح اندازہ ہو سکے گا کہ یہ تصویر کتنی مختلف ہے اس تصویر سے جو یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اہل بیت کو مخاطب کر کے یہ تعلیم دی گئی ہے۔

وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھو اور گذرے ہوئے زمانہ جاہلیت کے طریقہ پر اپنی نمائش نہ کرتی پھرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرتی رہو۔ اس حکم سے اللہ یہ چاہتا ہے اے رسول کے گھر والو کہ تم سے ناپاکی کو دور کرے اور تم کو پاکیزہ بنائے جیسا کہ چاہیئے۔ اور تمہارے

گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور دانائی کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں ان کا چرچا کرو۔ اللہ باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں، ایمان رکھنے والے مرد اور ایمان رکھنے والی عورتیں، یکسو ہونے والے مرد اور یکسو ہونے والی عورتیں، راستباز مرد اور راستباز عورتیں، ثابت قدم مرد اور ثابت قدم عورتیں، خدا ترس مرد اور خدا ترس عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنے ناموس کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد رکھنے والے مرد اور اللہ کو بہت زیادہ یاد رکھنے والی عورتیں ———
ان کے لئے اللہ نے مغفرت اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ (۳۳-۳۵ - احزاب)

یہ ہدایات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل وعیال کو مخاطب کر کے دی گئی تھیں اور آنحضرت صلعم کے اہل وعیال میں حضرت فاطمہ زہرا اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کا جو درجہ و مرتبہ ہے اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مذکورہ ہدایات و اوصاف کا کوئی بہترین نمونہ اگر ہو سکتا تھا تو یہی خواتین ہو سکتی تھیں اور اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ ان اوصاف کا بہترین عملی نمونہ تھیں بھی۔ پھر یہ بات کس قدر بعید از قیاس ہے کہ جن پاکیزہ خواتین کی زندگیاں اس قرآنی سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھیں انہی کی پوتیاں اور بھانجیاں ایسی اٹھیں کہ انہوں نے مدینہ وطائف میں لٹریری سیلون ( ) بنا بنا کے اپنے ارد گرد گویوں اور بذلہ سنجوں کے مجمع اکٹھے کرنے شروع کر دیئے اور اپنے حسن و جمال کی نمائش کے لئے اُسی تبرج جاہلیت کو اختیار کر لیا جس کی ان کی بزرگ دادیوں اور خالاؤں کو قرآن مجید میں ایسی صراحت کے ساتھ ممانعت کی گئی تھی؟

لیکن ہم تھوڑی دیر کے لئے دل پر انتہائی جبر کر کے فرض کر لیتے ہیں کہ ایسا ہوا اور حضرت سکینہ نے اپنے عظیم الشان باپ اور اپنی عظیم المرتبہ دادی اور عائشہ نے اپنے صالح باپ اور اپنے جلیل القدر نانا اور اپنی جلیل القدر خالہ کی پسندیدہ اور اسلامی روشیں ترک کر کے وہی آزادیاں اور بے قیدیاں اختیار کر لیں جن کا مضمون نگار صاحب نے ذکر فرمایا ہے مگر سوال یہ ہے کہ "زوال اور انحطاط" کا نمونہ ان میں سے کونسا طریقہ ہے۔ وہ جس کا ذکر قرآن نے فرمایا ہے اور جس پر حضرت فاطمہ زہرا اور حضرت عائشہ صدیقہ تھیں، یا وہ جس کو مضمون نگار صاحب نے حضرت

سکینہ بنت حسین ؓ اور عائشہ بنت طلحہ ؓ کی طرف منسوب کیا ہے ؟

ستم پر ستم یہ ہے کہ یہ حضرات اتنی بڑی بڑی تہمتیں ایسے پاکیزہ خاندانوں کی بہو بیٹیوں پر لگا جاتے ہیں اور یہ کچھ نہیں بتاتے کہ یہ بات وہ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں تاکہ کوئی شخص اس کی لغویت اگر واضح کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔ شہید کربلا کی صاحبزادی، فاطمہ زہرا کی پوتی، صدیق اکبر ؓ کی نواسی، ام المومنین عائشہ صدیقہ کی بھانجی کی حرمت ان کا مرتبہ صاحبان کی نظر میں بس اس قدر ہے کہ "ایک قدیم مورخ لکھتا ہے" کی سند پر جو خرافات چاہے ان کی شان میں بکتے جائے۔ معلوم نہیں یہ قدیم مورخ کون ہے ؟ کس دور کا آدمی ہے ؟ اس کا دین و مذہب کیا ہے ؟ اور کن ذرائع معلومات کی بنا پر یہ باتیں روایت کر رہا ہے ؟ محض قدیم ہونا یا مورخ ہونا تو اسبات کے لئے کافی نہیں ہے کہ اس نے جو لکھ دیا ہے اس پر ایمان لے آئے۔ قدیم و جدید دونوں ہی گروہوں میں ہم ایسے بہت سے مورخوں سے واقف ہیں جن کی زندگیوں کا مقصد ہی یہی تھا اور ہے کہ انبیاء و صالحین اور ان کے پاکیزہ گھرانوں کی زندگیوں کو بگاڑ کے پیش کریں تاکہ اس طرح اپنے ان آقاؤں کی عیاشیوں اور رنگ رلیوں کیلئے شرعی دلائل فراہم کر سکیں جن کا وہ نمک کھاتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ پاکستان ٹائمز کے مضمون نگار صاحب نے اس گروہ کے کن "قدیم مورخ" کی خوشہ چینی سے تحقیقات کے یہ نوادر فراہم فرمائے ہیں ؟

حوالہ کی غیر موجودگی میں مذکورہ بالا بیانات کی تردید یا تصدیق کا معاملہ تو مشکل ہے لیکن عام ناظرین کی واقفیت کے لئے یہ بتا دینا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا کہ ہمارے یہاں ادب و تاریخ کی بہت سی کتب میں ایسی ہیں جو زمانۂ انحطاط کے بگڑے ہوئے خلفاء اور امراء نے اپنے نمک خواروں سے اس لئے لکھوائی تھیں کہ ان کی تفریح طبع کا سامان مہیا ہو سکے۔ ان کتابوں میں گپوں اور قصوں، عشقیہ حکایتوں اور افسانوں، راگوں اور گیتوں کی لپیٹ میں صحابہ و صحابیات یا ان کے وابستگان سے متعلق ایسے واقعات بھی جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے ان فاسق امراء کی رنگ رلیوں کے لئے دلیل ہاتھ آئے۔ ہمارے عربی لٹریچر میں کتاب الاغانی اس طرز کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس میں عربی گیتوں اور راگوں، گویوں اور گانے والیوں کے ذکر کے سلسلہ میں بہت سے ایسے واقعات بھی ضمناً آگئے ہیں جن کا مقصد پڑھنے والے کے ذہن پر یہ اثر ڈالنا ہوتا ہے کہ یہ رنگینیاں کچھ اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ رسول اور صحابہ کے زمانہ میں بھی اسی طرح موجود تھیں جس طرح آج موجود ہیں۔ اس قسم کے جتنے واقعات ان کتابوں میں ملتے ہیں

بیشتر یا تو محض گپ ہیں یا ان میں صداقت کا کوئی ذرہ ہے تو اسکی نوعیت یہ ہے کہ کسی مؤرخ نے زور ی کے تحت تو اسی کوئی بات کہی ہے سند ہوئی ہے اور اسکو نمک مرچ لگا کر ایک پڑی داستان تیار کی گئی ہے کوئی صاحب نقد اور صاحب علم تو اس طرز کی کتابوں کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا لیکن جو لوگ کہانیوں کی طبیعت رکھتے ہیں اور بیشتر گندی ہی چیزوں پر جھپٹنا پسند کرتے ہیں وہ اس قسم کی کتابوں سے بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔[1] یہ کتابیں جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ اگر کوئی شخص اسی مقصد کے لئے ان کی طرف رجوع کرے تو ہر چند ہمارے نزدیک یہ بھی ایک بہت بڑی بدذوقی ہے تاہم اس کی آزادی انتخاب کا حق تسلیم کر کے ہم اس پر صبر کر لیں گے۔ لیکن یہ تو بڑا ظلم ہے کہ حدیث اور رجال اور تاریخ و سیرت کی مستند کتابوں کو چھوڑ کر اب اس طرح کی خرافات میں سے جھوٹی سچی روایتیں چھانٹ چھانٹ کر یکجا کی جائیں اور دنیا کو یقین دلایا جائے کہ دیکھو یہ ہیں اسلامی تہذیب، اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت کے اصل نمونے

[1] میں نے اس انجام کے ماخذ کے متعلق یہ رائے محض اپنے ذوق کی بنا پر قائم کی تھی اور چونکہ ملتان جیل میں جہاں میں نے یہ کتاب لکھی ہے، اس معاملہ کی تحقیق کے لئے ضروری کتابیں میسر نہیں تھیں اس وجہ سے پورے اطمینان کے ساتھ اسکی تردید یا تصدیق میرے لئے مشکل تھی لیکن حسن اتفاق سے ایک روز جیل کی لائبریری کی فہرست الٹتے پلٹتے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی نظر ایک کتاب پر پڑ گئی جس کا نام تھا سکینہ بنت حسین ؓ۔ کتاب نکلوا کر دیکھی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کے مصنف مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی ہیں۔ کتاب کی نوعیت کا اندازہ تو شرر صاحب کے نام ہی سے ہو گیا تھا لیکن مزید اطمینان کے لئے کتاب پڑھی تو اس کے ماخذ کے متعلق میرا گمان صحیح نکلا۔ شرر صاحب نے اپنے مذاق کے مطابق یہ ایک ناولانہ مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے اگرچہ بیان کردہ واقعات کے حوالے نہیں دیئے ہیں اور نہ ایک ناولانہ مضمون میں اس کی ضرورت تھی لیکن بحیثیت مجموعی کتاب کے ماخذ کا پتہ دے دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اکثر و بیشتر حصہ کتاب الاغانی سے ماخوذ ہے۔

یہ کتاب ہمارے بزرگ اسلاف کی زندگی کا اشتہار دینے کے لئے لکھی گئی ہے تاکہ لوگوں کو زندہ دلی و خوش مذاقی کے لئے دلیل اور سند ہاتھ آئے چنانچہ مصنف نے اپنا مقصد کتاب کے شروع میں خود ہی ظاہر کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"ہمارے قدیم مورخین چونکہ عموماً لوگوں کے ثقہ اور پارسا ہونے ہی کی تاک میں زیادہ رہتے ہیں لہٰذا ہم افسوس کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔۔۔" مصنف کے مذاق اور رجحان کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے خلیفہ راشد کے متعلق لکھتے ہیں۔
"عمر بن عبدالعزیز کہ جو تمام خلفائے اسلام میں ملاؤں اور خشک مزاج زاہدوں کی شان رکھتا تھا اسکے دل میں حضرت سکینہ کے جوشِ علم کی عام تقلید کو بار روکنے کے لئے اپنی شاہی قوت سے کام لینا پڑا وہ ہاتھ میں درہ لئے پھرتا اور جس کے سر پر طرۂ سکینہ دیکھتا درے لگاتا"

شرر صاحب نے کتاب الاغانی وغیرہ جیسی کتابوں سے اخذ کر کے اس قسم کے بہت سے نقشے اپنے ناولوں کے ذریعے مسلمانوں میں پھیلا دیئے ہیں اور اب ہمارے نئے محققین ... [illegible]

یہ حرکت بالکل اسی طرح کی ہے جیسے کوئی شخص اسرائیلی خرافات میں سے وہ سارا مواد جمع کرلے جس میں خدا کے پیغمبروں پر جھوٹ، زنا، چوری، شراب خوری اور طرح طرح کی بداخلاقیوں کی تہمتیں لگائی گئی ہیں اور پھر کہے کہ دیکھو، یہ ہیں وہ اعمال کام جن کے لئے خدا نے اپنے پیغمبر دنیا میں بھیجے تھے۔

آغا خاں کی رہنمائی یہ سطریں لکھ ہی رہا تھا کہ ڈان میں مسلمانوں کے قدیم ناصح مشفق جناب سر آغا خاں بالقابہ کی وہ تقریر نظر سے گذری جو انہوں نے ۸ فروری ۵۰ء کو مسٹر زاہد حسین گورنر اسٹیٹ بینک کے مکان پر بین الاقوامی امور سے متعلق ادارہ کے اہتمام میں کراچی کے اونچے طبقہ کے ایک اجتماع کو مخاطب کر کے مرشدانہ انداز میں فرمائی ہے۔ تقریر کا موضوع تھا "مسلمان سلطنتوں کا عروج و زوال اور ان کا مستقبل"۔ اس تقریر میں آپ نے تاریخ کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان کے ارباب کار کو جو قیمتی مشورے دیئے ہیں ان میں سب سے زیادہ زرّیں مشورہ، خود ان کے الفاظ میں، یہ ہے۔

• یقین کیجئے کہ حقیقی اسلام کبھی بھی جامد نہیں تھا۔ یہ ہمیشہ ایک متحرک شے رہا ہے۔ بنو امیہ کے عظیم الشان دور میں جبکہ اس کی بنیادیں گہرائی اور وسعت کے ساتھ رکھی گئیں، یہ متحرک، نہایت سادہ اور واضح تھا ..... اپنے مورخوں اور مفکروں کو ہدایات کیجئے کہ وہ اپنی ساری توجہ بنو امیہ کے اس عظیم الشان صد سالہ دور پر مرتکز کریں، اور آپ اس اموی دور کو نمونہ کے طور پر سامنے رکھیئے"

آگے چل کر اس مثالی دور کے فضائل و محاسن کی تفصیل کرتے ہوئے آپ نے اسلامی تہذیب و معاشرت کے انہی دو نمونوں کا ذکر فرمایا ہے جن کا ذکر پاکستان ٹائمز کے مضمون نگار صاحب کے حوالہ سے اوپر گذر چکا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"اس سلسلہ میں دو مثالیں بالکل واضح طور پر پیش کی جا سکتی ہیں حضرت امام حسین کی صاحبزادی سکینہ اور طلحہ کی صاحبزادی (حضرت ابوبکر صدیق کی نواسی) نے عرب کی زندگی میں معاشرتی اور علمی حیثیت سے جو آزادانہ حصہ لیا اس کا موازنہ انیسویں صدی کی خواتین کے مرتبہ سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ نیز ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ابتدائی اموی خلفاء کے زمانہ ہی میں مکہ اور مدینہ میں گانے بجانے کا معیار کس قدر بلند ہو چکا تھا اب اس کے مقابلہ میں ذرا اس نفرت و حقارت کو دیکھیئے جو اس زمانہ کے بعض گمراہ مسلمانوں کو فنون لطیفہ (گانے بجانے) سے ہے"　　　　(ڈان کراچی مورخہ ۹ فروری ۵۰ء)

اس تقریر کو پڑھ کر آغا خان بالقابہ کی مرشدانہ قابلیت کی داد دینی پڑتی ہے کہ اسلام کا دم بھرتے ہوئے اسلام سے فرار کی جو راہ انہوں نے سجھائی ہے وہ اب تک یہاں کے نکتہ وروں کو نہیں سوجھی تھی۔ ہمارے ارباب کار ہاتھ پاؤں مار رہے تھے کہ کوئی ایسی راہ ڈھونڈھ نکالیں کہ اسلام کے ساتھ ناتہ بھی ٹوٹے اور یہ اسلام ان کے پیش نظر مقاصد میں خلل انداز بھی نہ ہو سکے۔ لیکن ایسی راہ ڈھونڈھ نکالنا جو کفر و اسلام، شیطان و رحمان، یزدان اور اہرمن دونوں کو جمع کر سکے ہر مدعی کا کام نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک مرشد کامل کی ضرورت تھی اور اس تقریر کو پڑھنے کے بعد ہر شخص تسلیم کرے گا کہ یہ مرشد کامل اگر کوئی ہو سکتا تھا تو بس ہمارے آغا خان بہادر بالقابہ ہی ہو سکتے تھے جو اسلام اور اسلام کی تاریخ پر اتنی عمیق نگاہ رکھتے ہیں۔

سر آغا خان بالقابہ نے ہمارے ارباب کار کو جو راہ سوجھائی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اسلام کے نعرہ کے ساتھ کفر قائم کرنا چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے کہ اپنے مورخوں اور مفکروں کو اس کام پر لگاؤ کہ وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دَور کو چھوڑ کر بنی امیہ کے سنہ ۱۰۰ھ کو اسلامی تاریخ کا خیر القرون ثابت کرنے پر اپنی تمام مساعی مرتکز کر دیں۔ کیونکہ یہی دور میمون ہے جس میں اسلام کی "بنیادیں گہرائی اور وسعت کے ساتھ رکھی گئیں" جس میں سکینہ اور عائشہ جیسی فیشن ایبل خواتین، جو بیسویں صدی کی خواتین کے لئے بھی قابل رشک ہو سکتی ہیں پیدا ہوئیں جس میں گانے بجانے کا وہ فن شریف اپنے عروج و کمال کو پہنچا جس کو اس زمانہ کے گمراہ مسلمان نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اگر ہمارے ارباب حل و عقد سر آغا خان کے اس زرین مشورہ کو قبول کر لیں تو قرار داد مقاصد پاس کر دینے کے بعد سے وہ جس الجھن میں پھنس گئے ہیں اس سے بیک جنبش، وہ رہائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس "دَورِ مبارک" میں جس میں آغا خان کے حسب ارشاد اسلام کی بنیادیں پوری وسعت و گہرائی کے ساتھ رکھی گئیں"، صرف سکینہ اور عائشہ کے قابل اتباع نمونے اور رقص و سرود کے ہنگامے ہی موجود نہیں بلکہ اس کی گہرائیوں اور وسعتوں میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ہمارے ارباب کار کو تلاش ہے اور وہ مل نہیں رہا ہے اور اگر مل رہا ہے تو اسلام کے لیبل کے ساتھ نہیں مل رہا ہے۔

اس کے لئے بس ایک کام، جیسا کہ سر آغا خان صاحب نے مشورہ دیا ہے، کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اسلامی ریسرچ کے پورے ڈیپارٹمنٹ کو کچھ مزید توسیع کے ساتھ اس کام پر مامور کر دیجئے کہ وہ اس دور کی گہرائیوں میں اچھی

طرح اتر کر جو گوہر مقصود ہاتھ آئیں ان کو اکٹھا کر لیں۔ اگر ہم ماہیوں کی معلومات بھی اس کارِ عظیم میں کچھ مفید ہو سکیں تو اس دور کی بابت جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ بھی اشارات کی صورت میں یہاں نوٹ کئے دیتے ہیں بحث برِ تلاش مقصود میں کچھ رہنمائی کر سکیں۔

اس دور کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ملک عضوض" اور "جبریت" کے دور سے تعبیر فرمایا ہے۔ اگر ہمارے ارباب اقتدار اپنی مطلق العنانی اور اپنے استبداد کے استحکام کے خواہاں ہوں تو یہ دورِ جبریت اس کے لئے نہایت گہری . . . . . . نبیاد مہیا کر سکتا ہے۔ اس دور میں اسلام کے جمہوری و شورائی نظام کو بھی ملوکیت اور ولی عہدی سے بدل ڈالا گیا۔ اگر ہمارے ارباب کار تخت و تاج کے قیام کے ارمان رکھتے ہوں تو اس دور سے بڑھ کر ہماری تاریخ کا کوئی دور بھی اس ارمان کی حوصلہ افزائی کرنے والا نہیں ہے۔ اس دور نے خلفائے راشدین کے خدمت خلق اور محنت بے مزد کے طریقہ کو قیصریت و کسرویت سے بدلا۔ اگر ہمارے حکمران قیصریت و کسرویت کے اپنانے کے متمنی ہیں تو صرف یہی دور ہے جو ان کے لئے مثال کا کام دے سکتا ہے۔ اس دور میں مروانی امراء کی عیاشیاں اور سفاکیاں ظہور میں آئیں۔ اگر ہمارے ارباب کار ان کے راستوں پر چلنا چاہتے ہیں تو بلاشبہ ان چیزوں کے لئے تاریخ کا قابل فخر دور یہی ہے اس دور نے یزید اور اس کے ان شقی امراء کو جنم دیا جنہوں نے حسین اور آل رسول کو کربلا میں اس جرم میں قتل کیا کہ وہ ان کی بادشاہی کے آگے خدا کی بادشاہی کا علم بلند کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہمارے ارباب حل و عقد اپنی تاریخ کو بھی کربلا کی شہیدی سے نورانی کرنا چاہتے ہوں تو اس کے لئے بلاشبہ اسی دور سے رہنمائی مل سکیگی۔ اسی دور میں حجاج بن یوسف ثقفی، اور خالد قسری اور ابن ہبیرہ جیسے درندے پیدا ہوئے جن کی سفاکیوں سے خدا کی زمین چیخ اٹھی۔ اگر ان کے کارناموں کو پھر زندہ کرنا پیش نظر ہو تو لازماً اسی دور کی گہرائیوں اور وسعتوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اس دور کے بعض مصلحین نے اپنے زمانہ کے امراء سے خطاب کر کے کہا تھا کہ خدا نے تم کو اپنی مخلوق کا چرواہا بنایا تھا مگر تم نے بھیڑیئے بن کر ان کی کھالیں ادھیڑ ڈالیں، ان کے گوشت کھا لئے اور ان کی ہڈیوں کے ڈھانچے چھوڑ دیئے۔ اگر ہمارے خداوندان نعمت بھی یہی چاہتے ہوں کہ گڈریے کے بجائے بھیڑیئے بن کر ہماری کھالیں کھینچیں اور ہمارے گوشت نوچیں تو بلاشبہ اس سیرت کی بہترین مثالیں بنو امیہ کے اسی صد سالہ دور میں مل سکیں گی۔ نیز یہی دور ہے جس نے آغا خاں کے بقول فاطمہ زہرا کی جگہ سکینہ اور عائشہ

صدیقہ کی جگہ عائشہ بنت طلحہ کو جنم دیا جن کی آزادی، جن کے فیشن اور جن کی مجلس آرائیوں کو آغا خاں بیسویں صدی کی خواتین کے لئے قابل رشک قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ بات ہے تو عورتوں کی اصلاح کی جو تحریک ہمارے لیڈروں نے چلائی ہے اسکی تقویت و تائید کے لئے بھی بہترین دینی مواد اسی دور کی تاریخ سے مل سکیگا۔

غرض سر آغا خاں بہادر نے اپنے اس ایک اشارہ سے ہمارے ارباب اقتدار کی وہ ساری الجھنیں دور کر دی ہیں جن میں وہ قرار داد مقاصد پاس کر کے مبتلا ہو گئے تھے۔ اب اگر ہمارے مؤرخوں اور مفکروں نے سر جوڑ کے اس صد سالہ دور کے مطالعہ پر محنت کی اور اسکی گہرائیوں میں اتر کر اس دور کے سارے مآثر بے نقاب کر لئے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ تجدید و اصلاح کا وہ عظیم الشان کام جو ہماری قیادت علیا کے پیش نظر ہے اس کے لئے کوئی چیز امریکہ و انگلستان سے برآمد نہیں کرنی پڑیگی بلکہ پورا اسلامی تعمیری اور سارا مسالہ اپنے ہی گھر سے فراہم ہو جائیگا جس کو کوئی شخص بھی پردیسی یا غیر اسلامی کہنے کی جرأت نہ کر سکیگا۔

سر آغا خاں کی یہ تقریر پاکستان کے اونچے حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔ یہاں تک کہ ڈان نے اس پر داد دی ہے کہ اقبال کے بعد آغا خاں کے سوا یہ حکیمانہ باتیں اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔

دھمکیاں سر آغا خاں کی یہ تقریر جیسی کچھ بھی ہے اس کا ایک پہلو کم از کم یہ قابل تعریف ہے کہ وہ ماضی کے ساتھ ہمارے ربط کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اگرچہ وہ ماضی عہد رسالت اور دور خلفائے راشدین کے بجائے دور بنی امیہ ہی ہو۔ لیکن یہاں تو اب علی الاعلان یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ ہم اب تک جس انداز سے اور جن زاویہ ہائے نگاہ سے اپنی زندگی کے معاملات پر غور کرتے رہے ہیں اب آزادی کے حصول کے بعد ان میں تبدیلی کرنی پڑیگی اور اگر طوعاً یہ تبدیلی نہ کی گئی تو مصطفےٰ کمال کی طرح جبراً یہ تبدیلی کرائی جائیگی۔ اور ساتھ ہی تمام اسلامی اقدار کی کھلم کھلا توہین کرتے ہوئے عورتوں کو سوسائٹی کے خلاف بغاوت پر ابھارا جا رہا ہے۔ لاہور کے ایک روزنامہ کے ادارتی مقالہ کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ ہوں:-

"عورتوں کی آزادی یا پردہ و نقاب پوشی کے سوال پر فرنگی اقتدار کے دور میں ہم جس انداز سے اور جن زاویہ ہائے نگاہ سے بحث کرتے رہے ہیں اب اس میں بنیادی تبدیلی کرنے کی ضرورت ہے

ورنہ ہماری معاشرت میں وہ توازن و ہم آہنگی اور وہ تناسب و یک رنگی پیدا نہ ہو سکے گی جس کے بغیر قوموں کی سربلندی محال ہے۔" (احسان لاہور مورخہ ۳ فروری ۵۰ء ۲۱۹)

پردہ کا مسئلہ جب بھی زیر بحث آیا ہے، خواہ فرنگی اقتدار کے دور میں یا اس اسلامی اقتدار کے عہد میں اس بحث میں کم از کم پردہ کے حامیوں کا نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ اسلام کے سوا کچھ اور نہیں رہا ہے۔ اب اگر قومی سربلندی اور معاشرت میں توازن و ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ اس نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے تو دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ اب زندگی کے مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور کرنے کے بجائے صرف قومی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے اور اسلام کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

اسی سلسلہ میں آگے چل کر ایڈیٹر صاحب دھمکی دیتے ہیں کہ لوگوں کو چاہئے کہ بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے آگے سر تسلیم خم کریں اور معاشرت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے عورتوں کو آزادی دیں ورنہ یہاں بھی مصطفےٰ کمال کا طریقہ اختیار کیا جائے گا اور ایک صبح و شام میں عورتوں کو پردہ سے باہر نکال دیا جائے گا کیونکہ معاشرت میں انتشار باقی رکھ کے دشمن کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ بہرحال نہیں دیا جا سکتا۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"آزادی کے حصول کے بعد معاشرت کے مختلف دائروں میں ہم آہنگی و یکجہتی پیدا کر کے قوم و ملت کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کا کام دو ہی طرح ہو سکتا ہے:۔ یا تو مصطفےٰ کمال کی قسم کا کوئی آمر مطلق پیدا ہو جو ڈکٹیٹر بن کر اس قسم کے احکام نافذ کرے کہ فلاں تاریخ اور فلاں وقت کے بعد سے کوئی عورت پردہ کے اندر نہ رہے گی اور زندگی کے میدان میں مردوں کے سر کا بوجھ بنے رہنے کے بجائے اپنی راہ آپ تلاش کرے گی۔ اور یا پھر عوام میں خود اتنا شعور ہونا چاہیے کہ وہ اپنے قومی و ملی مفاد کو سمجھیں اور شخصی تعصبات کو ملکی مفادات کے ساتھ متصادم نہ ہونے دیں ـــــ پاکستان میں ابھی تک اس دوسری شکل کا دروازہ کھلا ہوا ہے لیکن اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی تو پھر لامحالہ وہی نتیجے برآمد ہوں گے یا تو ہم میں کوئی آمر مطلق پیدا ہو جائے یا ہمارے اس اندرونی اختلاف و انتشار سے اغیار ناجائز فائدہ اٹھائیں"

(احسان)

اس آمرانہ دھمکی کے بعد ایڈیٹر صاحب سوسائٹی کے موجودہ معروف و منکر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور تلقین فرماتے

ہیں کہ جب تک معروف و منکر کے یہ معیارات قائم رہیں گے اس وقت تک ترقی کے راستہ پر قدم بڑھانا ممکن نہیں ہے بلکہ جو خواتین اس راہ میں آگے بڑھ گئی ہیں وہ بھی نکو بن کے رہ جائیں گی اس وجہ سے سب سے مقدم کام یہ ہے کہ خیر و شر کے موجودہ اقدار و پیمانے بدلیں یہاں تک کہ جن باتوں کو آج عورت کے لئے ہنر سمجھا جاتا ہے وہ عیب خیالی کی جانے لگیں اور جن چیزوں کو عیب سمجھا جاتا ہے وہ ہنر سمجھی جانے لگیں فرماتے ہیں:۔

"اصلی سوال یہ ہے کہ آیا ہم اس قسم کے مشاغل (ڈرائنگ کی طرف اشارہ ہے) کو مسلم خواتین کے لئے باعث عزت سمجھتے ہیں یا مجبوری سے بے شرمی کا حیلہ قرار دیتے ہیں۔ پھر سوال صرف ڈرائنگ ہی کا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اسی قسم کے دوسرے بیسیوں مسائل بھی الجھے ہوئے ہیں۔ اب تک ہماری عورتوں کو صرف مردوں کا دست نگر ہونا سکھایا جاتا ہے۔ ان سے صرف یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ شادی سے پہلے باپ بھائی کی، اور شادی کے بعد شوہر کی خدمت گذاری و اطاعت شعاری کا ہنر سیکھیں۔ گھر کے مرد جو کچھ پیدا کریں اسی میں تنگی ترشی کے ساتھ اپنا وقت گذاریں اور قومی زندگی کو خوش گوار بنانے میں اپنا دائرہ عمل صرف زچہ خانے اور باورچی خانے تک محدود رکھیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا زندگی کا یہ نظریہ اب بھی ہمارے لئے سود مند ہے یا نہیں؟ کیا خواتین کو قومی و ملی مشاغل کے وسیع تر میدانوں سے علیحدہ رکھنے اور انہیں صرف مردوں کی خدمت گذاری یا تفریح طبع کا آلہ کار بنائے رکھنے کا یہ طریقہ نفع بخش ہے یا خطرناک؟ اس وقت تک تو ہماری معاشرت کا ڈھانچہ یہ ہے .... کہ اگر کوئی (عورت) بغاوت کر کے اپنا راستہ بنائے تو اسے یا تو مجبوری کی بنا پر معاف کر دیا جاتا ہے مگر حقارت کے ساتھ یا اسکی اس حرکت کو شرمناک قرار دے کر اس کے خلاف نت نئے شگوفے چھوڑے جاتے ہیں۔ ہم نے عصمت و عفت کو صرف عورت کے ساتھ مخصوص کر کے عصمت و عفت کی حفاظت و صیانت کی راہ بھی خود ہی تجویز کر رکھی ہے۔"

اپنی اس حالت پر ماتم کرنے کے بعد ایڈیٹر صاحب زندہ قوموں کا اسوۂ حسنہ اختیار کرنے کی تلقین فرماتے ہیں اور عورتوں کو مخاطب کر کے للکارتے ہیں کہ تم خود اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرو اور خود اعتمادی کے عزائم کے ساتھ معاشرت کے موجودہ ڈھانچہ کو توڑ پھوڑ دو اور اگر کچھ بے خود غلط لوگ اس پر طعن کرتے ہیں تو اسکی پروا نہ کرو۔ بھلا یہ بھی زندگی کا کوئی

مطمح نظر ہو کہ شادی کے لئے ایک شوہر تلاش کر لیا اور اسی شوہر کی خدمت گذاری میں زندگی گذار دی۔ اپنی خودی اور خودداری کو ابھارو اور زندگی کے وسیع میدانوں میں جولانیاں دکھاؤ۔ اس سوسائٹی کی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو اب تک یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ وقت کے نئے تقاضوں کے ساتھ گذرے ہوئے ماضی کا جوڑ لگانا ممکن نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

"ہم سمجھتے ہیں کہ نہ صرف زندگی میں بلکہ ان تمام قومی و ملی مشاغل کے میدانوں میں خواتین کو آگے آنا چاہئے جن میں ان کی خدمت قوم و ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے سود مند ہو سکتی ہے۔ ہماری خواتین کو چاہیئے کہ اگر ضرورت ہو تو اس سلسلہ میں تھوڑی سی جرأت اخلاق کا مظاہرہ کرنے سے بھی دریغ نہ کریں ...... ہماری خواتین کو محسوس کرنا چاہیئے کہ بیچ کی چند صدیوں نے ہماری معاشرت کا جو ڈھانچہ بنا دیا ہے وہ ہرگز ایسا نہیں ہے کہ اس کی ہر ہر گلی اور اس کے ہر ہر کوچے کو مقدس سمجھ کر آنکھیں بند کئے اس پر چلتی رہیں۔ اگر کچھ پرخود غلط حلقے ان کو مطعون کرتے ہیں تو اس کی پروا نہ کریں صرف اپنے ضمیر اور اپنے خدا[1] کے آگے خود کو جواب دہ سمجھیں اور تعمیر پاکستان کی ان منزلوں میں قدم بڑھانے سے محض اس لئے نہ جھجکیں کہ وہ دنیا کیا کہے گی جو دنیا ابھی تک ماضی و مستقبل کے درمیان حد فاصل کھینچنے ہی میں مجرمانہ تغافل سے کام لے رہی ہے۔ شادی کے لئے ایک شوہر تلاش کر لینا اور زندگی کو اسی شوہر کی خدمت گذاری کے سانچہ میں ڈھالتے رہنے کی کوشش کرنا کوئی مطمح نظر نہیں، کوئی مقصد نہیں۔ اصل مقصد اور اصل مطمح نظر یہ ہونا چاہیئے کہ تعمیر ملت کے وسیع تر مفاد کے لئے خود کو سازگار بنائیں اور اپنی خودی اور خودداری کو دبانے کے بجائے اسے ابھاریں اور جلا بخشیں"

(روزنامہ احسان مورخہ ۴ فروری ۱۹۵۰ء)

یہ ایڈیٹر صاحب اخباری رقابت کے تحت کمیونسٹوں پر اکثر نہایت تیز و تند تنقیدیں کرتے رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں اگر ضرورت پیش آتی ہے تو مذہب کو بھی اپنی حمایت میں استعمال فرماتے ہیں لیکن مذکورہ بالا سطریں غور سے

---

[1] خدا کا نام لینے کی یہ لوانی البا ایڈیٹر صاحب نے اپنے خداوندان کراچی سے سیکھی ہے جو بھی خدا اور اس کے دین کی خوب مرمت کر لینے کے بعد اسی طرح خدا کا حوالہ دیا کرتے ہیں۔

ملاحظہ فرما کر فیصلہ کیجئے کہ کیا کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی تصور کر سکتا ہے کہ ان کا لکھنے والا اسلام سے دور پرے کا بھی کوئی رشتہ رکھتا ہے۔ کیا لینن اور اسٹالین کا کوئی کٹر سے کٹر مرید بھی اسلام اور اسلامی روایات پر اس سے زیادہ بے باکانہ حملہ کر سکتا ہے:۔

اسلام پر پیدا ہونے اور اسلامیت کے دعوے کے باوجود ان کے اخلاقی و معاشرتی نظریات بعینہٖ وہی ہیں جو دنیا کی دوسری مادیت پرست اور کافر قوموں کے ہیں چنانچہ انہی صاحب کے ایک اور ایڈیٹوریل کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ ہوں:۔

"خدا نے تو انسان کو بالکل آزاد بنا کر پیدا کیا ہے مگر انسان نے اپنے معاشرتی مفاد کی خاطر خود ہی اپنے اوپر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ قدرت کا قانون تو یہ ہے کہ ہر عورت ہر مرد کے لئے "کھلی ہوئی" ہے لیکن ہم نے معاشرت میں نفاست و حسن پیدا کرنے اور انسانی نسل کو اخلاقی بلندیوں کی بلند سطح پر لانے کے لئے جنگل کے جانوروں کی اتباع میں جنسی جذبات کو کھلی چھٹی نہیں دے رکھی ہے۔ اس کے برعکس ہم نے ازدواج و مناکحت کی پابندیاں عائد کرنا خود اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے حتیٰ کہ اب تو ہم کسی انسان کی آزادی پر بھی گرفت کرتے ہیں کہ عصمت فروشی میں بے باکی سے کام لے حالانکہ یہ اس کی آزادی میں مداخلت ہے"۔

(احسان لاہور مورخہ ۲۸ جنوری ۵۰ ء)

ان کوششوں کا مجموعی اثر | بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ کہنا یہ تھا کہ اس طرح کا فاسد اور زہریلا لٹریچر ہے جو اس تحریک آزادی نسواں کی حمایت کے لئے اس ملک کا پورا انگریزی پریس اور اردو پریس کا ایک بہت بڑا حصہ رات دن پوری سرگرمی کے ساتھ گھر گھر پھیلا رہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس تحریک کو قوم کے لیڈروں کی سرپرستی حاصل ہو جس کے اندر عمال حکومت اپنے سرکاری فرائض سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہوں، جس کی حمایت کے لئے پریس کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہو کہ جس طرح کا بھی فاسد و محرک و مہیج مواد ان کے ہاتھ لگے اسکو پھیلائیں وہ اگر جنگل کی آگ سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلے تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے چنانچہ ایک طرف تو مشہور قرار داد مقاصد ہے جو کتاب و سنت والی تہذیب قائم کرنے کے لئے پاس کی گئی ہے لیکن اس کے تقاضوں کی تکمیل میں اب تک ایک مردہ سنت بھی پورے ایک سال کے عرصہ میں زندہ نہ کی جا سکی، اور دوسری طرف اس تحریک کی گرماگرمی کا یہ عالم ہے کہ اگر تہذیب اسلامی کے

کچھ نقوش اپنی سخت جانی کی وجہ سے ہماری حیات اجتماعی کے کسی گوشہ میں دبے دباتے پڑے رہ گئے تھے تو وہ بھی صبح وشام میں مٹا چاہتے ہیں۔ اس کا صحیح صحیح اندازہ اگر آپ کو کرنا ہو تو آپ مشرقی پاکستان کے حالات کا جائزہ لیجئے۔ یہ علاقہ مغربی پاکستان کے مقابلہ میں نسبتاً اپنی مشرقیت اور اسلامیت کے لئے مشہور یا ہمارے تجدد پسند حضرات کے نقطہ نظر سے اپنی رجعت پسندی کے لئے بدنام رہا ہے۔ بالخصوص عورتوں کے معاملہ میں تو اس کا حال مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب سے بالکل ہی مختلف رہا ہے۔ لیکن ان مشترکہ مساعی کا نتیجہ یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے آزادی نسواں کی تحریک اب وہاں اس منزل میں پہنچ گئی ہے کہ مشرقی بنگال مسلم لیگ کونسل تک اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو گئی۔ چنانچہ اس کا مندرجہ ذیل ریزولیوشن ملاحظہ ہو:-

"یہ کونسل مشرقی پاکستان کے کلبوں میں عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط اور دوسری اس قسم کی خلاف شریعت، اخلاق سوز حرکات کی پر زور مذمت کرتی ہے .... ان چیزوں کو دیکھ کر عوام کا غصہ اس قدر بھڑک رہا ہے کہ اگر حکومت نے فوراً مداخلت کر کے ان حرکات کو روک نہ دیا تو عوام خود کوئی سخت کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"[۱] (ڈان۔ کراچی۔ مورخہ ۲۳ جون ۴۹ء)

قوم کی واحد نمائندہ جماعت کے اس احتجاج کے بعد جس میں یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر ان خلاف شریعت اور اخلاق سوز حرکات کی روک تھام کے لئے حکومت نے کوئی موثر قدم نہ اٹھایا تو عوام قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں گے، یہ تحریک ہر احتجاج و اعتراض سے بالکل بے نیاز ہو کر جس طرح برابر آگے بڑھتی رہی ہے اس کا اندازہ بیگم شاہنواز کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوگا جو انہوں نے مذکورہ بالا تجویز کے پورے سات ماہ بعد ۲۰ دسمبر ۴۹ء کو مشرقی پاکستان کے دورہ سے واپس آکر کراچی میں پریس کو دیا ہے۔

"مشرقی پاکستان میں عورتوں کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ بہت سے شعبہائے زندگی میں مشرقی پاکستان کی عورتیں مغربی پاکستان کی عورتوں سے

---

[۱] یہ ملحوظ رہے کہ یہ تجویز اس مسلم لیگ نے پاس کی ہے جس کے لیڈر اور جس کی حکومت ہی ان ساری حرکات کے ذمہ دار ہیں اور پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ جن "آزادانہ اختلاط" اور جن "اخلاق سوز حرکات" کو یہ حضرات بھی اخلاق سوز اور خلاف شریعت قرار دیں اس کی نوعیت کیا کچھ ہو سکتی ہے!

آگے نکل گئی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے میڈیکل کالج میں لیڈی پروفیسر اور ان چار لڑکیوں کا ذکر کیا جنہوں نے ہوائی جہاز چلانے کے لائسنس حاصل کئے ہیں۔ آپ نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے ذمہ دار افسروں بلکہ وزراء تک کی بیویاں بھی گھروں میں بند نہیں رہتیں۔ وہ مردوں کے پہلو بہ پہلو تعمیر ملت[1] کے کاموں میں حصہ لینے کے لئے باہر نکل آئی ہیں۔"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء)

عوام کی ذہنیتیں اس تحریک سے جس تیزی کے ساتھ متغیر ہو رہی ہیں اور ہر محفل میں عورتوں کو پیش پیش رکھنے اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے کا مذاق جس سرعت کے ساتھ لوگوں میں ترقی کر رہا ہے اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اب مسلمان میلاد کی مجلسیں بھی منعقد کرتے ہیں تو ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان میں تقریر کرنے کے لئے کسی عالم دین یا کسی مرد لیڈر کے بجائے کسی خاتون ہی کو بلائیں۔ اس وقت جب کہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے سامنے ۱۰ جنوری ۱۹۵۰ء کے ڈان کا پرچہ پڑا ہوا ہے۔ اس میں حیدر آباد سندھ کی ایک انجمن کے جلسۂ میلاد کی روداد شائع ہوئی ہے۔ انجمن کا نام ماشاء اللہ مجلس اسوۂ رسول ہے، جلسہ بھی میلاد نبوی کا ہے لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس مجلسِ اسوۂ رسول نے، اسوۂ رسول بیان کرنے کے لئے جس عالمۂ کتاب و سنت اور پیکرِ اسوۂ رسول کو دعوت دی تھی وہ مس فاطمہ جناح ہیں۔ چنانچہ اخبار نے غالباً موصوفہ کی پیروی اسوۂ رسول ہی کو نمایاں کرنے کے لئے ان کی تقریر کے ساتھ ان کی تصویر بھی شائع کی ہے تاکہ مسلمان خواتین اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ اسوۂ رسول دراصل یہ ہے جس پر ملاؤں نے پردہ ڈال دیا تھا اور جو پاکستان بننے کے بعد اب بے نقاب ہو کر سامنے آیا ہے۔ اس جلسہ میں موصوفہ نے اسوۂ رسول پر جو تقریر ارشاد فرمائی ہے وہ بھی نہایت سبق آموز ہے۔ ہمارے پاکستان میں کچھ فیشن سا ہو گیا ہے کہ جو صاحب بھی کوئی تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں "وکلمۂ اتحاد و یقین

[1] تعمیر ملت ایک اصطلاح ہے جس سے مراد اسی طرح کے کارنامے ہیں جن کا ذکر اوپر مشرقی بنگال مسلم لیگ کونسل کے ریزولیوشن میں آیا ہے اور جن کے خلاف کونسل کو صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ کہیں لفظِ ملت سے کوئی شخص ملتِ ابراہیم و محمد (علیٰ اصحابہما الصلوٰۃ والسلام) مراد نہ لے بیٹھے۔ یہ اِن لوگوں کی اپنی ملت ہے۔ ہر عربی لفظ لازماً اسلامی ہی نہیں ہوتا۔

نظم (Unity, Faith, Discipline) کی تلاوت سے اس کا آغاز فرماتے ہیں اور ظاہر کرنے کی کوشش فرماتے ہیں کہ یہی تین کلمات کن فیکون ہیں جن سے دنیا وجود میں آئی ہے اور انہی تین کلمات کے بل پر یہ پورا کارخانۂ کائنات چل رہا ہے۔ چنانچہ اسی عام روش کی تقلید کرتے ہوئے موصوفہ نے بھی اپنی تقریر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دنیا میں جو عظیم الشان کامیابیاں حاصل کیں وہ بھی انہی تین میں سے ایک کلمہ یقین (Faith) کی مرہونِ احسان ہیں۔ معلوم ہوا کہ تکمیل دین تو اب کہیں جا کر بیسویں صدی میں ہوئی ہے جب کہ بقیہ دو کلمے بھی اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اس سے پہلے سارا کام ایک تہائی دین ہی سے چل رہا تھا۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔

اس مجلس اُسوۂ رسول کے جلسہ میلاد النبی کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی بھی تشریف فرما تھے۔ اور انہوں نے وہاں تقریر بھی فرمائی لیکن اے۔ پی۔ پی کے رپورٹر نے اپنی طویل رپورٹ میں، جو اخبار کے پورے ڈیڑھ کالموں میں شائع ہوئی ہے، ان کا ذکر صرف ڈیڑھ سطر میں اس طرح کیا ہے کہ "جلسہ میں وہ بھی موجود تھے اور انہوں نے مس فاطمہ جناح کی تقریر سے پہلے ایک تقریر فرمائی"۔ ناظرین واقف ہوں گے کہ یہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانہ بھون کے ایک مشہور عالم علوم دینی کے مدرس، اور حدیث و فقہ کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی قدر عافیت اس اسلامی مملکت میں اب یہ رہ گئی ہے کہ میلاد کی مجلسوں میں بھی بیچارے اگر بلائے جاتے ہیں تو مس فاطمہ جناح کے ایک تابع مہمل کی حیثیت سے۔ قانون سازی اور دستور سازی وغیرہ تو مولویوں کی دسترس اور ان کے مبلغ علم سے بالاتر خیال کی ہی جاتی تھیں اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمانوں کو میلاد بھی بیگمات ہی کا پسند آتا ہے، ہمارے علمائے کرام اب اس کام کے لئے بھی کچھ بہت موزوں نہیں خیال کیئے جاتے۔ اگر مسلمانوں کے ذہنی تغیر کی رفتار یہی رہی تو ہمارا اندازہ یہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر اندر آپ دیکھیں گے کہ ہمارے یہ حضرات علما، نماز جنازہ کے لئے بھی ناموزوں قرار دے دیئے جائیں گے۔ اور اگر کسی لیڈر صاحب کی وفات ہوگی تو مسلمان یہی چاہیں گے کہ ان کی نماز جنازہ بھی شیخ الاسلام کے بجائے کوئی لیڈر صاحب یا لیڈرانی صاحبہ ہی پڑھائیں۔

گذشتہ مباحث کا خلاصہ یہ ساری تفصیل ہم نے ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے پیش کی ہے جن کو

سب کچھ دیکھنے کے باوجود بھی کچھ سوجھائی نہیں دیتا۔ اور جو ابھی تک یہی خواب دیکھے چلے جا رہے ہیں کہ ان کے لیڈر رات دن اسلامی نظام قائم کرنے کی تیاریوں میں سرگرم ہیں۔ اور اگر کوئی شخص ان کو آنکھیں کھولنے اور اصل حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کے مشورہ کو قبول کریں الٹے اس کے سر ہو جاتے ہیں کہ تم تو ہمارے لیڈروں سے بدگمان کرتے ہو۔ اس قسم کی خوش گمانی کے مریضوں کے لئے ہم نیچے چند جھلکیاں صرف چند اخباروں سے یہ اقتباسات پیش کئے ہیں۔ (اور واضح رہے کہ جمع شدہ مواد کا نہایت قلیل حصہ اس مضمون میں دیا جا سکا ہے) امید ہے کہ یہ مواد سرمۂ بصیرت کا کام دیگا۔ اور وہ اس کی مدد سے اصل حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ جو سمجھ دار اور منصف مزاج آدمی بھی اس پورے سلسلہ کو غور سے پڑھے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس ملک کے ارباب اقتدار مغربی زندگی کی جو لعنت اس ملک پر مسلط کرنے کے متمنی ہیں اس کا پہلا تجربہ، ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت وہ پہلے ہماری بہنوں اور بیٹیوں پر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں اور ان کا یہ سمجھنا ایک حد تک صحیح ہے کہ اگر عورتوں نے اس طاعون کے جراثیم قبول کر لئے تو ہماری سوسائٹی کا بقیہ حصہ اس سے بچنا بھی چاہے گا تو نہ بچ سکے گا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی شاخوں کا جال۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، پاکستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا ہے۔ اور یہ کام سرکاری اہتمام اور سرکاری سرپرستی میں انجام پایا ہے اور انجام پا رہا ہے۔ ہر ایکسی لنسی بیگم ناظم الدین صاحبہ اور مس فاطمہ جناح اس ایسوسی ایشن کی سرپرست ہیں۔ بیگم لیاقت علی خان اس کی صدر ہیں۔ اضلاع میں اس کی کرتا دھرتا اعلیٰ سرکاری حکام کی بیگمات ہیں۔ اس کی کانفرنسیں گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوا کرتی ہیں۔ حکومت پاکستان نے اس ایسوسی ایشن کو باضابطہ طور پر تسلیم کر کے یہ حکم جاری کر دیا ہے کہ ان تمام معاملات میں جن کا تعلق عورتوں سے ہو محکمہ متعلقہ ایسوسی ایشن مذکور سے استصواب کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائے۔

ان تیاریوں کے ساتھ یہ حضرات ہماری خواتین میں جس قسم کا انقلاب برپا کرنے کے درپے ہیں۔ اگر کوئی شخص

لہ اسی ایسوسی ایشن کی کارکن خواتین کی رہنمائی و قیادت میں آئندہ نسل کی بچیوں اور نوجوان لڑکیوں کو تربیت کرنے اور پروان چڑھانے کے لئے بلیو برڈس (Blue Bird) گرل گائڈس، زنانہ رضاکار، زنانہ نیشنل گارڈ اور اینجلز آف مرسی (Angels of Mercy) یعنی نرسوں وغیرہ کی مختلف تنظیمیں اور تحریکیں سرگرم عمل ہیں

انہی کی تقریروں اور تحریروں کی روشنی میں اس انقلاب کے مطمح نظر کو سمجھنا اور متعین کرنا چاہے تو اسے معلوم ہوگا کہ ہماری سیاست، معاشرت اور اخلاق کے تمام موجودہ اقدار اس کی زد میں ہیں۔ اور اگر یہ واقع ہوگیا تو ہماری زندگی کے ان تینوں گوشوں میں نہایت اہم اور بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں گی جن رجحانی تصور ذہن میں پیدا کرنے کے لئے ہم ان کو یہاں الگ الگ پیش کرتے ہیں۔

(۱) سیاسی پہلو سے یہ حضرات جو انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں وہ مرد اور عورت کی کامل مساوات کے نظریہ پر مبنی ہے۔ حقوق میں بھی مساوات اور فرائض میں بھی مساوات۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ عورت وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو مرد کر سکتا ہے اس لئے اسے وہ سب کچھ کرنے کا موقع ملنا چاہیئے جو مرد کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ عورتوں اور مردوں کی جدوجہد کے میدان الگ الگ ہیں۔ ان کے نزدیک دونوں کے لئے ایک ہی میدان ہے اور ایک ہی گیند اور چوگان، اس سے دونوں کو زندگی کے ایک ہی میدان میں بالکل ایک ہی طرز پر بازی کھیلنی چاہیئے۔ جو شہری حقوق مردوں کو حاصل ہیں وہی شہری حقوق عورتوں کو حاصل ہیں۔ ریاست کی جو ذمہ داریاں مردوں پر عائد ہوتی ہیں، ٹھیک ٹھیک وہی ذمہ داریاں عورتوں پر عائد ہوتی ہیں جس طرح مرد شہری اور ملکی حقوق ادا کرنے کے لئے پولیس اور فوج میں بھرتی کئے جاتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی پولیس اور فوج میں بھرتی کی جائیں۔ جس طرح مرد سپاہی، پائلٹ اور کپتان اور کمانڈر بنتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی سپاہی، پائلٹ، کپتان اور کمانڈر بنیں۔ جس طرح مرد وکیل، جج، ڈپٹی کمشنر، کمشنر، سفیر، وزیر، گورنر اور گورنر جنرل ہوتے ہیں اسی طرح عورتوں کو بھی ان تمام مناصب عالیہ پر سرفراز ہونا چاہیئے۔ جس طرح مردوں کو الیکشن لڑنے، ممبر منتخب ہونے، پارلیمنٹری سیکرٹری، وزیر اور وزیراعظم بننے کے مواقع حاصل ہیں اسی طرح اس ساری قسمت آزمائیوں کے لئے عورتوں کو بھی مردوں کے برابر برابر مواقع ملنے چاہئیں۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ اور جدوجہد زندگی کے ہر گوشہ میں ان لوگوں کے نزدیک مرد عورت ہے اور عورت مرد۔ اس مساوات کو یہ حضرات اجتماعی زندگی میں ہم رنگی وہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے لازمی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے بغیر ملک ترقی کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا۔ اس کے بغیر ہمارے وزیر خزانہ کے ارشاد کے مطابق کوئی ملک معاشی اعتبار سے آسودہ حال نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی چیز کو مطمح نظر قرار دے کر آل پاکستان زنانہ

الیسوسی ایشن جدوجہد کر رہی ہے اور اس کے اس مطالبہ کو ہمارے وزیر اعظم صاحب اس ملک کی ترقی اور مدافعت کے نقطۂ نظر سے ناقابل انکار قرار دیتے ہیں۔

(۲) معاشرتی پہلو سے جس تبدیلی کے یہ لوگ خواہاں ہیں اور جس کے لئے مذکورہ بالا مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں خواہاں ہونا چاہیئے بھی، وہ یہ ہے کہ پردہ کے احکام کو یکسر لپیٹ کر رکھ دیا جائے۔ عورت کا حسن و جمال ان لوگوں کے نزدیک چھپانے کی چیز نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ نمایاں کرکے سامنے لانے کی چیز ہے تاکہ لوگ ان کے حسن و جمال سے قدرت کی صنعت گری کے تماشے دیکھ سکیں۔ پردہ ان لوگوں کے خیال میں ایسے لوگوں کی ایجاد ہے جو خود اخلاقی اعتبار سے پست تھے، انہوں نے اپنی کمزوریوں کو مغلوب کرنے کے بجائے الٹے عورتوں کو گھروں کی چاردیواری کے اندر بند کر دیا۔ ان حضرات نے علمی و تاریخی تحقیقات سے یہ پتہ چلایا ہے کہ اسلام کے دور اول میں عورتیں آرٹ سیلوں بنا بنا بیٹھتی تھیں لہٰذا ان کے ارد گرد شعراء ادباء، بذلہ سنج، لطیفہ گو، بھانڈ اور گویے اکٹھے ہوتے تھے اور وہ ان سب کی راہنمائی اور سرپرستی فرماتی تھیں۔ ان لوگوں کی یہ بھی تحقیق ہے کہ اس عہد کی عورتیں برقعوں اور نقابوں میں لپٹی رہنے کے بجائے اپنے حسن و جمال کے آئینہ میں لوگوں کو اللہ کی قدرت و صناعی کی نشانیوں کا مشاہدہ کراتی پھرتی تھیں۔ لیکن عباسیوں کے دورِ آخر میں جب نیتوں میں خیر القرون والی پاک بازی اور نگاہوں میں عہد صحابہ کی سی پارسائی باقی نہ رہی تو محتاط لوگوں کو مجبوراً آیات الٰہی کی نمائش کا یہ کاروبار ختم کرنا اور اپنی عورتوں کو گھروں میں بند کرنا پڑا۔ اس گروہ کے بعض دوسرے محققین، جو اس تحقیق سے شاید مطمئن نہیں ہیں کہتے ہیں کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ رسول اللہ کی بیٹی فاطمہؓ پردہ کرتی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قائد اعظمؒ کی بہن فاطمہ پردہ نہیں کرتیں اور ہمارے زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ہمارے لئے قابلِ اتباع نمونہ قائد اعظمؒ کی بہن ہی کا ہے نہ کہ رسولِ خدا کی بیٹی کا۔ اس حلقہ میں پردہ کے متعلق نرم سے نرم رائے ہمارے وزیر خزانہ آنریبل مسٹر غلام محمد کی ہے جو اس "رواج" کو "ملایانہ تحکم" کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔ بہرحال استدلال کی نوعیت میں تھوڑا بہت فرق ہو تو ہو لیکن اس نتیجہ پر سب متفق ہیں کہ پردہ اس ملک کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس کا جلد سے جلد دور ہونا ضروری ہے۔

(۳) اخلاقی پہلو سے یہ لوگ جس تبدیلی کے خواہاں ہیں وہ یہ ہے کہ عورت شرم و حیا اور عصمت و عفت کے رسوم و قیود میں جکڑی ہوئی رہنے کے بجائے "مادام" آذوری کی پاکستان اکاڈمی آف آرٹ میں جاکر جسم ہلانے اور جسمانی حرکات میں موافقت و ہم آہنگی پیدا کرنے کا فن سیکھے، تال، سُر اور جسمانی انضباط کا شعور پیدا کرے کتھک ناچ کو، جو مسلمانوں کا خاص ناچ ہے اور جسے اب ہندوؤں نے اپنا رکھا ہے، ہندوؤں سے واپس لے اور اکابر شاہان مغلیہ کے اس ورثہ کو اس کے شایانِ شان ترقی دے۔ گانے بجانے میں، جو مغلوں کے دور میں لڑکیوں کی تربیت کا ضروری جزو رہا ہے، کمال پیدا کرے۔ اور بین الاقوامی نمائش فنون میں جو آئندہ ماہ لندن میں منعقد ہو رہی ہے پاکستان کو دنیا کے تہذیبی نقشہ (Cultural Map) پر جگہ دلائے۔ صرف ایک شوہر تلاش کر لینا اور اس کی اطاعت و وفاداری اور بچوں کی پرورش و نگہداشت میں پوری زندگی کھپا دینا ان حضرات کے نزدیک نہ کوئی مقصد زندگی ہے اور نہ باپ بھائی یا شوہر کی کمائی پر صبر و شکر کی زندگی گذار دینا عورت کے لئے کوئی قابلِ تعریف بات۔ ان حضرات کے نزدیک عورت کی اصل قدر و قیمت اس بات میں ہے کہ قدرت نے اس کو جن اسلحہ سے مسلح کیا ہے ان سے لیس ہو کر گھروں کی چار دیواری سے باہر نکلے، عالی ووڈ کے ذوالقین و ذوآفاقات کی طرح اپنے کمالات فن دکھائے، دلوں کو تسخیر کرے، محفلوں میں نمایاں ہو، مجلسوں میں داد و تحسین حاصل کرے۔ سوسائٹی نے اگر اس آزادی پر کچھ اخلاقی اور شرعی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں تو ان سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو سوسائٹی اتنی معمولی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتی کہ موجودہ وقت کے تقاضے کچھ اور ہیں اور اب ماضی کی روایات اپنے اوپر لادے پھرنا ممکن نہیں ہے، وہ سوسائٹی اس قابل نہیں ہے کہ اس کی باتوں پر کان دھرا جائے۔ ان حضرات کے نزدیک قدرت کی طرف سے تو ہر عورت ہر مرد کے لئے "کھلی ہوئی" ہے، صرف حسن معاشرت کے خیال سے انسان نے از خود اپنے اوپر ازدواج و مناکحت کی پابندیاں عائد کر لی ہیں، اگر اب حسن معاشرت کا مطالبہ یہ ہو کہ ہر عورت مرد کے لئے پھر سے کھول دی جائے تو انسان اپنی عائد کردہ پابندی اٹھا بھی سکتا ہے یا کم از کم اس کو کسی دوسری شکل میں تبدیل کر سکتا ہے۔ ان بزرگوں کے خیال میں عصمت فروشی بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے۔ برائی اگر ہے تو عصمت فروشی میں بیباکی سے کام لینا ہے۔ اور یہ بھی غالباً اس لئے برا ہے کہ اس سے لوگوں

کو کچھ منفرد غلط مثالیں مل جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ عورتوں کی آزادی کے معاملہ میں وزرا متذبذب ہو جاتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ حق بحق دار رسید کا معاملہ خواہ کسی طرح بھی ہو، بجائے خود تو قابل اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔

نظامِ اسلامی کے قیام کا دعویٰ یہ خاصہ ہے اس پیشِ نظر انقلاب کا جو ہمارے ارباب حل و عقد ہماری خواتین کی زندگیوں میں برپا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے یہ خاصہ بیشتر خود انہی کے یا ان کے نمائندوں اور کارندوں کے الفاظ میں یہاں رکھ دیا ہے تاکہ جو کچھ یہ حضرات چاہتے ہیں وہ بیک نظر خود پیش کرنے والوں ہی کے الفاظ میں ناظرین کے سامنے آجاتے۔ پچھلے صفحات میں ہر چیز کے دلائل وشواہد پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں تاکہ اگر اس کے کسی فقرہ کی صداقت میں کسی صاحب کو کچھ تردد ہو تو وہ اس کے اصل و ماخذ کو بغیر زحمت کے معلوم کر سکیں۔

یہ ہے وہ اسلامی نظام جو ہمارے ارباب کار اس ملک میں قائم فرمانا چاہتے ہیں اور جس کی تیاریوں میں وہ رات دن سرگرم ہیں۔ یہی ہے وہ چیز جس کی نسبت ہمارے وزیر اعظم صاحب نے فرمایا:۔

"پاکستان اس غرض کے لئے حاصل کیا گیا ہے تاکہ دنیا کو اسلامی اصولوں پر قائم ریاست کا نمونہ دکھایا جا سکے"۔

(سول اینڈ ملٹری گزٹ ۲۵ جنوری ۴۹ء)

یہی ہے اس اسلامی حکومت کا تہذیبی نقشہ جس کی نسبت ہمارے وزیر اعظم نے ۸ دسمبر ۴۹ء کو کوہاٹ ضلع مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں فرمایا کہ اگر وہ پاکستان میں قائم نہیں کی گئی تو پاکستان زندہ نہیں رہ سکے گا۔

جہاں تک لوگوں کی اس امنگ کا تعلق ہے کہ پاکستان میں اسلامی اصولوں کے مطابق حکومت چلائی جائے، دستور ساز اسمبلی کی پاس کردہ قرار داد مقاصد اس کی کافی ضمانت ہے میرا یہ ایمان ہے کہ اگر ہم نے پاکستان میں اسلامی حکومت قائم نہ کی تو پاکستان زندہ نہیں

رہ سکے گا ...... ہم دنیا کو یہ دکھانے داعیہ رکھتے ہیں کہ فقط اسلام ہی وہ اصول زندگی ہے جو دنیا کے موجودہ مصائب کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

(پاکستان ٹائمز لاہور مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء)

یہی ہے وہ اسلامی نظام جس کا ذکر ہمارے وزیر اعظم صاحب نے ۲۵ نومبر ۱۹۴۹ء کو کراچی میں بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے ان شاندار الفاظ میں فرمایا:-

"پاکستان بس ایک اور صرف ایک ہی ارزو رکھتا ہے اور اس کی وہ آرزو ہے خدمت اسلام اور خدمت بنی نوع انسان ...... میرا یہ محکم یقین ہے کہ آج دنیا جن مشکل مسائل سے دوچار ہے ان کو صرف اسلام ہی حل کر سکتا ہے کیونکہ اسلام انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو مذہب کے اور دوسرے کو دنیا کے حوالے نہیں کرتا۔ وہ اپنے پیرؤوں کی پوری زندگی ــــــ انفرادی ہو یا اجتماعی ــــ اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ وہ ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کے حوالے کر دینا اس کی تعلیم ہے"۔

(ڈان کراچی مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء)

یہی ہیں اسلام کے وہ بہتر اصول جن سے بہتر اصول دنیا پیدا نہیں کر سکی۔ اور جن کے مطابق پاکستان کی حکومت کو بنانے کا عزم وزیر اعظم صاحب نے ان پرشوکت الفاظ میں فرمایا:-

"میں نے حصول پاکستان سے قبل مسلمان رائے دہندگان سے جو وعدے کئے تھے میں انہیں بھولا نہیں ہوں، ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس بنا پر کیا تھا کہ مسلمان اپنی زندگی اسلامی احکام کے قالب میں ڈھال سکیں۔ ہم نے ایک ایسے مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا جہاں ایک ایسی حکومت بنائی جا سکے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو جن سے بہتر اصول دنیا پیدا نہیں کر سکی۔ اسی مقصد کے لئے ہزارہا مسلمانوں نے اپنی زندگیاں قربان تقریباً ستر لاکھ مسلمانوں نے اسی مقصد کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ[1] اور مرتے کٹتے پاکستان تک پہنچے[1]۔ ہم نے مسلمان عوام سے جو وعدہ کیا تھا اب ہمیں اسے پورا کرنا ہے اور ایک ایسی

(۱ اگلے صفحہ پر)

حکومت کرنی ہے جس کا نصب العین سچا اسلامی نصب العین ہو۔ دنیا کو آج اسلام کی ضرورت ہے"

(نوائے وقت ۸ رجنوری ۵۰ء)

یہی ہے اسلام کا وہ مستقل نظام حیات جو ہمارے وزیر خزانہ ملک غلام محمد صاحب نے مدت العمر کے مطالعہ کے بعد دریافت فرمایا ہے اور جس کی تعیین وہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"ہمارا ایک مستقل نظام حیات ہے، ہمارا ایک الگ تمدن ہے، ہمارے اپنے طور طریقے ہیں اور ہم انہی کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب اسلامی اصولوں کے مطابق متحد ہونا اور انہی کے ذریعے عروج[2] حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

(پاکستان ٹائمز لاہور مورخہ ۸ دسمبر ۴۹ء)

اور یہی ہے مقدس پیغمبرؐ کا وہ طریقہ جس کی طرف واپس آنے کی تلقین بیگم لیاقت علی خان اور ان کے زمرہ کی دوسری بیگمات میلاد کی مجلسوں میں مسلمان عورتوں کو فرمایا کرتی ہیں۔

یہ حضرات اگر یہ فتنہ تنہا اپنے بل بوتے پر اٹھاتے اور اسلام کو اس بیچ میں نہ گھسیٹتے تو جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا ہے یہ چیز کچھ ایسی تشویش انگیز نہیں تھی۔ ہزار جہالت کے باوجود ابھی ہماری قوم میں اتنی اخلاقی و مذہبی حس باقی ہے کہ آسانی کے ساتھ اس راستہ پر نہیں جا سکتی جس پر یہ حضرات اس کو ڈال دینا چاہتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہالی وڈ کی اس تہذیب کو مدینہ کے اور صحابہ کی تہذیب کے نام سے اس سراسر جاہلی اور شیطانی نظام معاشرت کو اسلامی نظام معاشرت کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے

[1] اب یہ گواہی ان ستر لاکھ مہاجرین کے ذمہ ہے جو مرتے کھپتے پاکستان پہنچے ہیں کہ کیا واقعی انہوں نے اپنی جان، مال، آبرو اسی لئے لٹائی اور اپنے گھر بار اسی لئے چھوڑے کہ وہ ہندوستان میں اپنی عورتوں کو بے پردہ کرنا چاہتے تھے اور انہیں اس "اسلامی تہذیب" اور ان "اسلامی احکام" پر عمل کرنے سے روک رہے تھے؟

[2] بہتر ہوگا اگر ناظرین ۹ رفروری ۵۰ء کے ڈان میں آذوری صاحبہ کے اس رقص کے اشتہار پر بھی ایک نظر ڈال لیں جس کے آنریبل وزیر خزانہ کے زیر سرپرستی انعقاد کا اعلان ہوا ہے اس سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اسلامی اصولوں کے مطابق عروج حاصل کرنے کا عملی طریقہ کیا ہے؟

جس کی وجہ سے دین سے بے خبر مسلمانوں کا ایک طبقہ اور ان کی عورتیں اس فتنہ کا شکار ہو رہی ہیں اور اندیشہ ہے کہ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی اس میں مبتلا ہو جائیں۔ اس وجہ سے ہم ان حضرات کے اس پیش نظر انقلاب کے ان تینوں پہلوؤں پر جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں تنقید کر کے دیکھیں گے کہ جس اسلام اور جس اسلامی نظام کی محبت میں یہ لوگ چور ہیں کیا فی الواقع وہ مساوات مرد و زن کے اس نظریہ اور ان معاشرتی و اخلاقی تصورات کو کسی درجہ میں بھی قبول کرتا ہے جن کو ہمارے یہ ارباب کار اس زعم اور اس ڈھٹائی کے ساتھ اسلام کے نام سے پیش کر رہے ہیں؟

مسئلہ مزارعت پر تحقیقی نظر

(از حمید الزماں خاں صاحب صدیقی)

مسئلہ مزارعت ہو یا دوسرے دینی، اجتماعی، سیاسی اور معاشی مسائل ہوں، ان سے بحث کرتے وقت دو بنیادی سوال سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام میں ان مسائل کا حقیقی ماخذ کیا ہے؟ صرف قرآن ہے یا حدیث اور اجماع وقیاس بھی قرآن حکیم کی طرح مستقل ماخذ ہیں؟ دوسرے یہ کہ مختلف احادیث و روایات کی جمع و توفیق یا ترجیح و اختیار کے لئے کچھ جامع اور مستند اصول ہیں یا فقط اتنا ہی کافی ہے کہ جو احادیث اپنی رائے کی مؤید ہوں ان کو لے لیا جائے اور جو اپنی رائے کے خلاف پڑتی ہوں ان کو چھوڑ دیا جائے یا تاویلات بعیدہ سے باب کی تمام روایات میں تطبیق کی سعی کی جائے؟ جب تک یہ سوال حل نہ ہونگے اس وقت تک کسی دینی مسئلہ کی بحث و تحقیق میں کوئی دماغی کاوش نتیجہ خیز نہ ہو سکے گی بلکہ پہلے سے زیادہ شکوک و شبہات کے دروازے کھلتے جائیں گے لیکن بحث و نظر سے مقصود اگر یہ ہے — اور یقیناً یہی ہونا چاہئے — کہ چہرۂ حقیقت کو بے نقاب کر کے نزاع و اختلاف کو کم یا بالکل ختم کیا جائے تو کسی مسئلہ سے بحث کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہئے کہ ہماری کاوش نظر سے اصل مسئلہ پہلے سے زیادہ پیچیدہ تو نہیں ہو جائے گا؟

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ راقم الحروف نے "مزارعت پر تحقیقی نظر" کے عنوان سے ایک مضمون قلمبند کیا تھا جو پہلے پہل ملک کے مشہور اسلامی جریدۂ تسنیم میں شائع ہوا تھا اور اب راقم کی کتاب "اسلام کا معاشیاتی نظام" میں بھی ایک مستقل باب کی حیثیت سے چھپ چکا ہے۔ اس مضمون میں قرآنی تصریحات اور مستند اصول حدیث کی روشنی میں مسئلہ مزارعت سے بحث کی گئی تھی لیکن مجھے خود احساس ہے کہ وہ بحث جامع اور مفصل نہ تھی بلکہ بہت ہی مجمل تھی تاہم یہ حقیقت ہے کہ بحث کو محض اصولی حد تک محدود رکھا گیا تھا اور صرف احادیث و آثار کی کثرت و قلت کو حق و باطل کا

معیار نہیں قرار دیا گیا تھا لیکن اس کے بعد میرے چند مخلص واجب الاحترام اور قابلِ صد فخر احباب نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے انتہائی نیک نیتی سے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی سعی فرمائی ہے مگر چونکہ انہوں نے بحث و تحقیق کی عمارت ایک غلط مفروضہ کی بنیاد پر اٹھائی ہے اس لئے اصل مسئلہ پہلے سے زیادہ اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ لہٰذا اب ضروری ہو گیا ہے کہ مسئلہ زیرِ بحث کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

اس باب میں پہلے سوال کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی اور دوسرے سوال سے آئندہ باب "مسئلہ مزارعت اور حدیث" میں بحث کی جائے گی۔

مسئلہ مزارعت اصولِ قرآنی کی روشنی میں

احکام و مسائل کا ماخذ ہمارے فقہا و اصولیین کی عبارات سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ احکام و مسائل کے چار مستقل ماخذ ہیں۔ کتاب اللہ، حدیث رسول، اجماع امت اور قیاس۔ چنانچہ ان حضرات نے اپنی کتابوں میں تصریح کی ہے کہ ہر نئے مسئلہ کا حل سب سے پہلے کتاب اللہ میں ڈھونڈنا چاہئے اگر یہاں سے نہ ملے تو حدیث رسول کی طرف رجوع کیا جائے اگر حدیث سے نہ ملے تو اجماع امت سے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو قیاس سے۔ لیکن اگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو ان حضرات کی عبارتوں میں ایک طرح کی مسامحت نظر آتی ہے یعنی یہ بات بنیادی طور پر صحیح نہیں ہے کہ کتاب اللہ کے علاوہ کسی دوسری چیز کو بھی احکام و مسائل کا مستقل ماخذ تسلیم کیا جائے۔ اور غالباً فقہاء و اصولیین کا حقیقی مقصد یہ نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ اگر حدیث، اور اجماع و قیاس کو مستقل تسلیم کر لیا جائے تو اس کے نتیجہ کے طور پر ہمیں چند ایسے امور تسلیم کرنے پڑیں گے جو قرآنی نصوص قطعیہ سے متصادم ہیں، مثلاً یہ کہ قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ وہ زندگی کے تمام مسائل کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ تبیاناً لکل شیئ (الآیہ)

یعنی قرآن حکیم نے ایسے اصول بیان کر دیئے ہیں کہ ان کی روشنی میں ہر زمانہ کے لوگ اپنے ماحول اور مخصوص حالات کے مطابق زندگی کے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ باالفاظ دیگر حیاتِ انسانی کے تمام مسائل کا حقیقی ماخذ صرف قرآن حکیم

محقق علماءِ اصول نے کھلے لفظوں میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ حدیث وغیرہ مستقل ماخذ نہیں ہیں بلکہ کتاب اللہ کی مخبر اور مظہر ہیں اور یہی بات صحیح ہے۔ (حاشیہ توضیح) (صدیقی)

ہی ہے اور زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل قرآن میں نہ ہو لیکن اگر ہم یہ مان لیں کہ قرآن حکیم کے علاوہ دوسرے ماخذ بھی ہیں اور قرآن سے کسی مسئلہ کا حل نہ ملنے کی صورت میں ان ماخذ کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہوگا کہ زندگی کے ایسے مسائل بھی ہیں جن کا حل قرآن حکیم میں نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان اس بات کو تسلیم تو کیا سننا بھی گوارا نہیں کرے گا۔ اور اس سے ان قرآنی آیات کی تکذیب لازم آئے گی جن کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حکیم پوری زندگی کا جامع اور مکمل قانون ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسائل شرعیہ کا ماخذ صرف وہی ہو سکتا ہے جو ہر لحاظ سے یقینی اور قطعی الثبوت ہو اس کا ایک ایک لفظ تواتر کے ساتھ محفوظ چلا آتا ہو اور اس کی سند کی صحت معلوم کرنے کے لئے انسانی قوانین جرح و تعدیل کی ضرورت نہ پڑے یہ خصوصیت صرف قرآن حکیم ہی کو حاصل ہے۔ اور پھر خدائے قدوس نے خود ہی اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے پر عائد کی ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الآیۃ) ہم نے خود یہ کتاب اتاری ہے اور ہم خود ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اس کے برعکس حدیث کو ہرگز یہ مقام حاصل نہیں ہے کہ اس کے الفاظ ہر حیثیت سے محفوظ ہوں اور اس میں کسی شک و شبہ کا احتمال نہ ہو کیونکہ احادیث کا جو ذخیرہ آج ہمارے پاس موجود ہے وہ ہزارہا انسانوں کی زبان و قلم کے توسط سے ہمارے پاس پہنچا ہے اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کے الفاظ انسانی تصرف سے محفوظ رہ گئے ہوں یہی وجہ ہے کہ خود ائمہ حدیث اس بات پر متفق ہیں کہ حدیث متواتر کو چھوڑ کر باقی تمام اقسام حدیث ظنی الثبوت ہیں اور اس وجہ سے وہ افادہ یقین سے قاصر ہیں۔ رہی حدیث متواتر تو اس کے متعلق خود علمائے حدیث میں اختلاف ہے کہ ایسی حدیث کوئی ہے بھی یا نہیں؟ نیز علمائے حدیث کو اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ جو حدیث کتاب اللہ کے خلاف ہو وہ ہرگز قابل قبول نہیں ہے اور بالکل یہی حال اجماع و قیاس کا ہے۔ کہ یہ دونوں قرآن حکیم ہی کے اصول کلیہ کی ترجمانی کرتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ حدیث[1] اور اجماع و قیاس کو احکام و مسائل کا ماخذ نہیں مانا جا سکتا اور مستقل

---

[1] حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے یعنی وہ ابنی (باقی صفحہ پر)

بالذات ماخذ صرف قرآن حکیم ہی ہے لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حدیث اور اجماع و قیاس کی حیثیت کیا ہے؟ اور کیا زندگی کے مسائل میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے؟

واقعیہ ضبوعۃ مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آگیا ہے ورنہ خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل دلائل و نظائر قابل غور ہیں۔

(۱) مشہور حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں ان دونوں پر عمل کرتے رہوگے تو گمراہ نہ ہوگے۔ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔

(۲) مقدام بن معدی کرب سے سنن میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا، لوگو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اسی کے مثل کچھ اور بھی۔ اسی کچھ اور کو حدیث، سنت اور وحی خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان دونوں روایتوں کا انداز بیان بتلا رہا ہے کہ مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۳) تحویل قبلہ کا حکم قرآن سے ثابت ہے لیکن اس سے پہلے بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم قرآن مجید میں نہ اجمالاً وارد ہوا تھا اور نہ اشارۃً۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے علاوہ ایک اور بھی مستقل ماخذ ہے جس کے ذریعہ قبلہ جیسی اہم شئے کا تعین ہو سکتا ہے۔

قرآن و سنت میں قطعیت کے اعتبار سے جو تفاوت پایا جاتا ہے اس کو تسلیم کرنے کے باوجود سنت کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی لازم نہیں آتی۔ یہ بات تو خود صاحب مضمون بھی مان رہے ہیں کہ حدیث قرآن کی شرح ہے۔ اب اگر حدیث ظنی ہونے کی بنا پر ناقابل اعتماد ہے تو پھر قرآن کی شرح ہونے کی حیثیت سے وہ کیسے قابل اعتماد ہو گئی؟

اسی طرح تبیاناً لکل شئ کا منشا یہ ہے کہ قرآن نے دین کے تمام بنیادی اصول و مبادی بغیر کسی ایچ پیچ کے واضح انداز میں بیان کر دیئے ہیں لیکن اس سے یہ کبھی نتیجہ نکلا کہ دینی زندگی کے تمام جزئیات قرآن میں آگئے ہیں اور جس جزیہ کی اصل قرآن میں نہ ملے وہ اگر حدیث میں ملتی ہو تو اسے صرف اس لئے نہ مانا جائے کہ حدیث یقینی ذریعۂ علم نہیں ہے۔

علماء سلف نے اس لحاظ سے سنت کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ (الف) سنت کسی شئے پر حکم لگانے میں قرآن کے بالکل مطابق ہو یعنی اجمال و تفصیل کے اعتبار سے بھی کوئی نمایاں فرق نہ پایا جاتا ہو۔ اس شکل کو توارد ادلہ سے موسوم کیا جاسکتا ہے

(باقی صفحہ پر)

حدیث اور اجماع و قیاس کا موقف | قرآن حکیم بلاشبہ ایک کامل اور جامع دستورِ حیات ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس میں ہر زمانہ کے مخصوص احوال و ظروف کے لئے انسانی زندگی کے تمام تفصیلی اور فرعی احکام دعوۃً منضبط ہیں۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ قرآن میں وہ تمام اصول عامہ اور قوانین کلیہ موجود ہیں جن سے ہر زمانہ کے مخصوص تقاضوں کا حل دریافت کیا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر نئے موڑ پر ان اصول موضوعہ کو اپنا رہبر بنایا جا سکتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان اصول عامہ کی روشنی میں زندگی کے خارجی نقشہ کی تعمیر و تشکیل کے لئے عقلِ انسانی کو تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے یا اس مقصد کے لئے ہمیں عقل کے سوا کسی اور روشنی کی بھی ضرورت ہے؟

بات یہ ہے کہ ذاتِ نبوت (جن کے توسط سے قرآن انسانوں تک پہنچا ہے) نے خود ہی اپنے قول و عمل سے قرآنی تصورات کی توضیح و تشریح فرما دی ہے اور آپ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ایسے عملی نقوش چھوڑ گئے ہیں جن سے منشا قرآنی کے سمجھنے میں مدد لی جا سکتی ہے یعنی آپ کی قولی اور فعلی تشریحات و تشکیلات قرآنی اصول کلیہ کی متعین اور مشہود تعبیرات ہیں جن کو ہم اسوۂ نبوت کی مقدس اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں اور ہر زمانہ میں قرآنی اصول و نظریات کو خارجی احوال و ظروف پر منطبق کرنے میں ان توضیحات و تشکیلات کی حیثیت ایک درخشندہ اور پائندہ مثال کی ہے جس کو سامنے رکھ کر ہم زندگی کے نئے نئے تقاضوں کا حل قرآن حکیم سے نکال سکتے ہیں، گو اس میں عقل کی رہنمائی سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے لیکن اس کو مطلق العنان نہیں چھوڑا جاتا بلکہ منشا قرآنی کے سمجھنے میں اس کو صاحب وحی کی قولی تشریحات اور عملی تشکیلات کی پابندی کرنی پڑتی ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو عقل حیلہ جو آیاتِ قرآنی کی تاویل و تحریف سے ایک نئی شریعت گھڑ لے جیسا کہ حدیث کی موجودگی میں بھی اہلِ بدعت و ہوا آج تک یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں اور آج بھی یہی ہو رہا ہے بلکہ پہلے تو اس میدان کے شہسوار صرف صوفی و ملا ہی تھے اور آج کل منکرین

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳) (ب) سنت ان مسائل و قوانین کی شارح اور مفسر متعین ہو قرآن میں مجملاً ذکر پایا جاتا ہے۔

(ج) سنت کسی ایسے حکم کو واجب یا حرام قرار دے جس کے بارے میں نفیاً یا اثباتاً قرآن خاموش ہے (اعلام الموقعین ج ۲ ص ۳۰۷)

اس تیسری قسم کے ماتحت مسائل کو حل کرنے کیلئے حدیث کو بہر حال مستقل ماخذ ماننا ہوگا۔ یہ بھی واضح رہے کہ حدیث کو مستقل ماخذ ماننے سے قرآن کے کمال و جامعیت کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ حدیث کی پیروی کا حکم بھی قرآن سے ہی ملتا ہے۔ (ترجمان)

دونوں سے سبقت لے جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسوۂ نبوت کی روشنی بھی نہ ہوتی تو ان لوگوں نے دین خداوندی کا کیا حشر کیا ہوتا؟

عقل بیچاری سائنہ خواہش نفس کی غلام ہے اور جب کسی مسئلہ پر غور کرنے لگتی ہے تو اپنے محورِ حرکت (نفس) کے گرد ہی گھومتی رہتی ہے اس لئے اس کو منشاء خداوندی کے فہم و ادراک کے لئے تنہا چھوڑ دینا گویا انسانی زندگی کو خوفناک ہلاکت و بربادی کے حوالے کرنا ہے۔

راہبر ہو ظن وتخمیں تو زبوں کارِ حیات

اور اس وجہ سے شاہراہِ زندگی میں اس "نور" سے استفادہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن زندگی کو اس کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حدیث ظنی[1] ہے اور اس وجہ سے اس کو دین و شریعت کا ماخذ نہیں تسلیم کیا جا سکتا تو پھر اصولِ قرآنی کی عملی تشکیل میں اس سے مدد کیسے لی جا سکتی ہے

بات یہ ہے کہ کسی چیز کو دین کا ماخذ قرار دینا اور بات ہے اور قرآن کریم کے منشاء کی تعیین کے لئے کسی چیز کو واسطہ بنانا دوسری بات ہے، ثانی الذکر مقصد کے لئے ہم حدیث کے علاوہ مستند تاریخ، لغت، قواعد عربیت اور

---

[1] یہ ظنی کا لفظ بھی ایسا ہوا بن کر رہ گیا ہے کہ جس کی وجہ سے حدیث کا اصل مقام پہچاننے میں لوگوں کو دقت پیش آ رہی ہے زیرِ نظر مضمون میں تو حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی ہے، کچھ لوگ اور آگے بڑھے اور انہوں نے ان الظن لا یغنی من الحق شیئا پڑھتے ہوئے حدیث کے حجت ہونے سے بھی انکار کر دیا۔ قرآن و حدیث میں ظن متعدد معنوں میں مستعمل ہوا ہے:

(۱) شک اور تردد یعنی جس میں مثبت اور منفی پہلو دونوں یکساں ہوں کسی ایک پہلو کو ترجیح حاصل نہ ہو (۲) گمان غالب یعنی راجح پہلو، (۳) یقین ——— قرآن و سنت میں ظن کی مذمت پہلے معنی کے لحاظ سے ہے اور حدیث کو ظنی دوسرے معنی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ آج ہماری زندگی کے دو تہائی سے زیادہ مسائل اسی ظن یا گمان غالب کے محور پر گھوم رہے ہیں۔ (ص)

۴ نے محض ظنی کہہ کر حدیث کی اہمیت کو گھٹانا کوئی علمی شان نہیں (ترجمان ۹۲)

قیاس عقلی سے بھی مدد لیتے ہیں لیکن ان کو دین کا ماخذ نہیں تسلیم کرتے یہ دوسری بات ہے کہ حدیث کا مقام ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے۔

اسی طرح اجماع امت بھی اصول قرآنی کی خارجی تشکیل کا ایک مستند طریق کار ہے لیکن دین و شریعت کا ماخذ نہیں ہے۔ اور قیاس کا کام یہ ہے کہ اس کے ذریعہ قرآنی اصول کلیہ کو جدید مسائل جزئیہ پر منطبق کیا جاتا ہے اور اصل ماخذ صرف قرآن ہی ہے۔

ملکیت زمین اس تمہید کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ زمین کی شخصی ملکیت کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے؟ کیا وہ شخصی ملکیتوں کو برقرار رکھتا ہے یا ان کو اٹھا کر اسٹیٹ کی تحویل میں دے دینا چاہتا ہے؟

دراصل جو شخص دیانت داری سے قرآن حکیم کے معاشی تصورات کو سمجھنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ قرآن کریم شخصی ملکیت کا ہرگز مخالف نہیں ہے بلکہ اس کے بیشتر معاشی اور اجتماعی مسائل شخصی ملکیت ہی کے اصول پر مبنی ہیں اور جو لوگ شخصی ملکیت کی نفی اور قومی ملکیت (نیشنلائزیشن) کے اثبات کے لئے قرآنی آیات "الارض للہ" اور "والارض وضعھا للانام" کو پیش کرتے ہیں وہ خواہ مخواہ قرآن کو فلسفۂ اشتراکیت کا ہمنوا بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ آپ جس طرف جانا چاہتے ہیں بے شک جائیں لیکن قرآن پر رحم کریں اور اگر وہ خود قرآن کے پیچھے نہیں چل سکتے تو قرآن کو اپنے پیچھے نہ چلائیں۔

اسلام نے فرد اور جماعت کے لئے الگ الگ حدود و دوائر متعین کر دیئے ہیں اور اس کی راہ انفرادیت محضہ اور کلیت کے بین بین ہے۔ وہ فرد کی خود ارادیت (سیلف ڈیٹرمینیشن) کو بھی برقرار رکھتا ہے اور جماعتی زندگی کو بھی لازم ٹھہراتا ہے اور ایک سچا مسلمان شخصی طور پر آزاد اور خود مختار ہوتے ہوئے جماعت کے لئے وہ کچھ کر گزرتا

ے افسوس ہے کہ صاحب مضمون نے حدیث اور دوسری چیزوں کے اصولی فرق کو نہیں سمجھا۔ تاریخ، لغت، اور قواعد عربیت ہم کو صرف قرآن کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ مگر قرآن کے مجمل احکام کی تفصیل معلوم کرنے میں ان سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ بخلاف اس کے حدیث ہم کو اجمال کی تفصیل دیتی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حدیث ماخذ دین ہونے کی حیثیت سے آپ کے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہے تو ماخذ علم تفصیلی ہونے کی حیثیت سے کس طرح قابل اعتماد ہو جاتی ہے۔ (ترجمان)

ہے کہ کلیت پسند حضرات اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ غرض کہ اسلام کا فلسفۂ زندگی انفرادیت اور کلیت کے برعکس ایک معتدل اور متوازن طرز خیال پیش کرتا ہے۔

محدود ملکیت یا بے قید ملکیت؟ دراصل اس موقع پر زمین کی شخصی ملکیت سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ یہاں اصل موضوع بحث یہ ہے کہ

(۱) اسلام ذاتی ملکیت پر کچھ قیود و حدود عائد کرتا ہے یا اس نے ہر شخص کو کھلا چھوڑ دیا ہے کہ وہ جتنی زمین پر قبضہ کرنا چاہے کر سکتا ہے خواہ وہ اس زمین کو آباد رکھ سکتا ہو یا نہ رکھ سکتا ہو یعنی ایک شخص کسی قطعۂ زمین کے چاروں طرف نشان لگا کر اس کی آبادکاری کا کام دوسروں کے حوالے کر دیتا ہے اس شرط پر کہ وہ اس کو آباد کریں اور زمین "اب میری ملکیت ہوگی" کیا یہ شخص محض حدود اربعہ متعین کرنے یا تحجیر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس زمین کا مالک متصور ہوگا؟ یا ایک شخص ایک دفعہ زمین کو آباد کر کے اس کو اپنے کام میں نہیں لاتا بلکہ یوں ہی بیکار چھوڑ دیتا ہے تو کیا اس کے حقوق ملکیت ابدالآباد کے لئے قائم رہیں گے؟ یا ایک شخص زمین کو خود آباد کر کے دوسروں کو دے دیتا ہے اور دوسرے لوگ صدیوں سے اس کو آباد کرتے چلے آتے ہیں، کیا اس شخص کی ایک مرتبہ کی محنت نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی جائیگی یا اس کے اثرات کہیں ختم بھی ہو سکتے ہیں؟

(۲) کیا اس قسم کی غیر محدود اور بے قید ملکیت زمین اسلام کے نظام عادل میں کھپ سکتی ہے؟

(۳) اس قسم کی ملکیتوں کے متعلق قطعی فیصلہ ہونے کے بعد مزارعت کے مختلف طریقوں کی حقیقت کیا ہے؟

(۴) دوسری چیزوں سے قطع نظر خود معاملہ مزارعت کے متعلق یہ دیکھنا ہے کہ یہ کتاب اللہ کے اصول عامہ اور احادیث کی روشنی میں سودی کاروبار میں داخل تو نہیں ہے؟

یہی وہ مسائل جن سے اس مضمون میں بحث کی جائے گی لیکن اس سے پہلے زمین اور دیگر اشیا کی ملکیت کے مفہوم اور اسلامی معاشیات کے چند بنیادی تصورات کا سرسری طور پر ذکر کرنا ضروری ہے۔

اسلامی معاشیات کے چند بنیادی اصول اسلامی معاشیات پر نگاہ ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ زمین اور دیگر اشیا حقیقت کے اعتبار سے مباح الاصل ہیں یعنی زمین اور زمین کی ہر چیز انسانی محنت و تصرف سے پہلے سب انسانوں کے لئے مساوی طور پر مباح ہے لیکن محنت و تصرف کے بعد وہ محنت اٹھانے والے یا تصرف کرنے والے

کی ملک قرار پاتی ہے اور جن چیزوں میں انسانی محنت کو دخل نہیں ہے وہ شریعت اسلامیہ میں اپنی اصل یعنی اباحت پر قائم ہیں مثلاً پہاڑ، نمک کی کانیں اور پانی وغیرہ۔

(۲) ملکیت کے تحقق کے لئے ہمیشہ سے ایک ہی اصول رائج چلا آتا ہے اور اسلام نے بھی اس کو صحیح تسلیم کیا ہے کہ جو شخص دوسرے لوگوں سے پہلے کسی چیز پر محنت و تصرف سے قابض ہو جاتا ہے وہ اس چیز کا مالک قرار پاتا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ملکیت کا تحقق محنت و تصرف ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے[1]۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو افراد کی خود غرضانہ مسابقت سے معاشرہ میں دائمی نزاع و اختلاف برپا رہتا۔ اس وجہ سے قرآن حکیم نے کسب و محنت کو ملکیت کا سبب قرار دیا ہے[2]۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (البقرہ)	مردوں کو ان کی کسب کی ہوئی چیزوں سے حصہ ملتا ہے اور عورتوں کو بھی ان کی محنت کا ثمرہ ملتا ہے۔

حضرت امام ولی اللہ اس اصول کی وضاحت میں اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں۔

الاصل فيهما أومأنا إليه أن الكل مال الله ليس فيه حق لأحد في الحقيقة لكن الله لما أباح لهم الانتفاع بالأرض وما فيها وقعت المشاحة فكان الحكم حينئذ أن لا يهيج	اس باب میں اصل وہ ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کا مال ہے اور اس میں درحقیقت کسی انسان کا ذاتی حق نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جب زمین اور اس کی چیزوں کے انتفاع کو لوگوں کے لئے مباح قرار دیا

---

[1] محنت و تصرف کے علاوہ اسلام نے ہبہ، عطیہ، وراثت اور مضاربت کے ذریعہ بھی انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کیا ہے۔ آخر ان ذرائع کو کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ (ترجمان)

[2] اکتساب کے معنی "محنت کا ثمرہ" غلط ہے، اس لئے جو استدلال اس آیت سے کیا گیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ علاوہ بریں اس آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حصر کا مفہوم نکلتا ہو۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ ملکیت کا واحد سبب محنت سے کسی چیز کو حاصل کرنا ہے۔ قرآن خود میراث میں وارثوں کے حصے مقرر کرتا ہے۔ اب فرمایئے کہ ایک شیرخوار بچہ جو اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے مال کا مالک ہوتا ہے اس نے کیا محنت کی ہے جس کی بنا پر وہ اس مال کا جائز مالک ہوا؟

احد مما سبق الیہ من غیر مضارۃ

حجۃ اللہ۔ جلد ۲۔ ص ۱۰۳

ہے۔ تو اس صورت میں نزاع و اختلاف پیدا ہونا یقینی تھا لہٰذا یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ جو شخص دوسروں کو نقصان و ضرر پہنچائے بغیر کسی چیز پر پہلے قابض ہو جاتا ہے وہ اس چیز کا مالک قرار پاتا ہے اور اس کو اس چیز سے محروم نہیں کیا جاتا۔

آگے چل کر شاہ صاحب لکھتے ہیں:

والارض کلها فی الحقیقة بمنزلة مسجد او رباط جعل وقفا علی ابناء السبیل وهم شرکاء فیه فیقدم الاسبق فالاسبق ومعنی الملك فی حق الآدمی کونه احق بالانتفاع من غیره ۱؎

زمین ساری کی ساری دراصل بمنزلہ مسجد یا سرائے کے ہے جو مسافروں پر وقف کی گئی ہو اور وہ سب اس میں برابر کے شریک ہیں پر پہلے آنے والے کا حق مقدم ہوگا اور ملکیت کے معنی آدمی کے حق میں یہ ہیں کہ وہ دوسروں کی نسبت اس چیز سے انتفاع کا زیادہ حقدار ہے۔

اہم: چونکہ ملکیت کا تحقق محنت و تصرف سے ہوتا ہے اس لئے جو چیزیں مسلسل محنت سے کارآمد رہ سکتی ہیں ان پر ایک مرتبہ کی محنت دائمی اور مستقل ملکیت کا سبب نہیں بن سکتی بلکہ جب تک اس کی محنت کے اثرات اس چیز میں باقی رہتے ہیں اس وقت تک اس پر محنت اٹھانے والے شخص کی ملکیت قائم رہتی ہے اور ان اثرات کے ختم ہونے سے ملکیت بھی ختم ہو جاتی ہے ۲؎۔ اس مدت کی تعیین امام عادل اپنی صوابدید سے کر سکتا ہے اور حضرت عمرؓ

۱؎ شاہ صاحب کی انہی عبارات کو نیشنلائزیشن کے حامی اپنے نظریہ کی تائید میں پیش کرتے ہیں اور حکیم صاحب محترم ان عبارات سے مزارعت کی حرمت ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ دونوں استدلال محل نظر ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ ہی میں دوسری جگہ مزارعت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۸۶ باب البر والتعاون۔ مصفیٰ شرح موطا میں لکھتے ہیں:
"مخابرت و آں عمل کردن در زمین است بشرط بعض خارج زمین و بذر از یکے باشد و عمل از دیگرے جائز است یا نہ؟ میل فقیر دریں مذہب امام احمد است، از جواز ہر دو" ص ۹۹۔

تعجب ہے کہ شاہ صاحب کی مفید مطلب عبارات تو خوب زور شور سے پیش کی جاتی ہیں۔ اور انہی کی دوسری تحریروں کو جو متنازعہ مسئلہ پر بہت واضح، مدلل اور فیصلہ کن ہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے آخر انصاف و دیانت کی یہ کونسی قسم ہے؟ ۔ (ترجمان)

۲؎ (تفہیم پشت پر)

نے اس کی مدت تین سال متعین کی تھی چنانچہ ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین عطا کی تھی، لیکن وہ اس کو آباد نہ رکھ سکے، اس وجہ سے حضرت عمرؓ نے یہ زمین اُن سے لے کر حاجت مندوں میں تقسیم کر دی۔ (کتاب الاموال ...)

اسی طرح مزینہ یا جہنیہ کو آنحضرت صلعم نے زمین دی تھی اور انہوں نے اس کو معطل چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کچھ دوسرے لوگوں نے اس کو آباد کر لیا، حضرت عمرؓ کے سامنے یہ جھگڑا پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اگر یہ زمین میری طرف سے یا ابوبکر صدیقؓ کی طرف سے دی ہوئی ہوتی تو میں اس کو واپس کر لیتا لیکن یہ رسول اللہ صلعم کی دی ہوئی ہے۔ اس موقع پر فرمایا کہ اس بارے میں قانون یہ ہے کہ

من عطّل ارضًا ثلث سنين لم يعمرها فجاءه غيره فعمرها فهي له	جو شخص تین سال زمین کو معطل چھوڑے رکھے اور اس کے بعد دوسرا شخص آکر اس کو آباد کرے تو یہ زمین اس دوسرے کی ملکیت قرار پاتی ہے۔
(بحوالہ عینی شرح بخاری)	

(۲) کاروباری معاملات کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ معاملہ فریقین کی باہم حقیقی رضامندی سے طے ہو

(حاشیہ صفحہ ...) اس عبارت کا اگر یہ مطلب ہے کہ زمیندار اگر اپنی زمین میں محنت کرنا چھوڑ دے ... دے تو اس انقطاع محنت و تصرف سے اُس کی ملکیت ساقط ہو جاتی ہے تو یہ بداہتہً غلط ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ کہ اگر یہی زمیندار اپنی زمین اجرت یا نقد لگان پر کاشت کراتا ہے تو ملکیت قائم رہتی ہے حالانکہ مالک کا رشتہ محنت و تصرف یہاں بھی اپنی زمین سے منقطع ہو چکا ہے۔

اصل میں اس دعویٰ کی کوئی بنیاد ہی نہیں کہ "ملکیت کا تحقق محنت و تصرف سے ہوتا ہے" ملکیت کے لئے محنت و تصرف کے علاوہ دوسری بنیادیں بھی ہیں۔ باقی رہا کچھ عرصہ اپنی زمین میں محنت کرنے کے بعد اُسے معطل چھوڑ دینے کا معاملہ تو اصل میں یہ شق اس بحث سے ہی بے تعلق ہے۔ اس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔ اس غلط بحث کے بجائے اصل قابل غور امر یہ ہے کہ اختلاف محض مزارعت کے جواز سے ہے یا یہ اصلی معاملہ سامنے ہے کہ محنت و تصرف کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے ملکیت کا تحقق ہی نہیں ہو سکتا۔ زیرنظر مضمون میں تمہیداً موخرالذکر امر کو ثابت کر رہی ہے لیکن مضمون کے آخری حصہ کا رخ اول الذکر مسئلہ کی طرف پھر گیا ہے۔ یہ تضاد کیوں ؟ (ترجمان)

اور اس میں کسی ایک کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھایا جاتے اور معاملہ بذات خود ایسا نہ ہو جس سے فریقین میں نزاع و اختلاف یا معاشرہ میں فساد و اختلال پیدا ہونے کا قوی امکان ہو یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے سودی لین دین، اکل اموال بالباطل، اور کم تولنے اور کم ناپنے سے بار بار منع کیا ہے اور احادیث میں حرام چیزوں کی بیع و شرا، خود غرضانہ منافقت اور کاروباری معاملہ میں نزاع و اختلاف پیدا کرنے والی شرطیں عائد کرنے سے روکا گیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب اس اصول کو اپنے الفاظ میں یوں بیان فرماتے ہیں:۔

وان کان استمتاع فیها لیس له دخل فی التعاون او بما هو تراض یشبه الاقتصاب فلیس من العقود المرضیة ولا الاسباب الصالحة وان هو باطل وسحت باصل الحکمة المدنیة ـ حجۃ اللہ صـ ۱۰۳	اگر معاشرہ کے ارتقا میں افراد کا تعامل اس طرز کا ہو کہ اس میں تعاون کو دخل نہ ہو یا ان کی رضامندی حقیقت و معنی کے لحاظ سے ظلم و ناانصافی کا حکم رکھتی ہو تو ایسے معاملات پسندیدہ نہیں ہیں اور نہ ہی وہ معیشت کے اسباب صالحہ سے ہیں بلکہ وہ حکمت مدنیہ کے لحاظ سے باطل اور حرام ہیں۔
واشترط فی [illegible] ان لا یضیق بعضهم علی بعض بحیث یفضی الی فساد التمدن ـ	معاشی وسائل کو ذریعہ معیشت بنانے کی شرط یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی حریت معیشت پر اثر انداز نہ ہو کہ اس سے تمدن انسانی میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

(۵) کاروباری وسائل اور معاشی ذرائع کو اس ڈھنگ سے کام میں لایا جائے کہ اس سے ملک کی اجتماعی خوشحالی میں اضافہ ہو اور ایسا نہ ہو کہ ملک کا ایک طبقہ دولت اور وسائل دولت پر قابض ہوتا چلا جائے اور دوسرے کی دولت اور وسائل دولت مسلسل گھٹتے چلے جائیں یہاں تک کہ یہ طبقہ پہلے طبقہ کے مقابلہ میں چارپایوں کی سطح پر آجائے۔

کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (آیہ) تاکہ دولت صرف اہل دولت ہی کے درمیان چکر نہ کاٹتی رہے

اب ان قرآنی اصولوں کو سامنے رکھ کر زمینداری کی متذکرہ اقسام پر حقیقت شناس نگاہ ڈالنا چاہیے۔

سب سے پہلے قسم اول کو لیجئے جس میں ایک شخص قطعۂ زمین کے حدود اربعہ متعین کرنے کی وجہ سے اس کا مستقل مالک

بن جاتا ہے لیکن وہ خود اس کو آباد نہیں کرتا بلکہ اس کی آباد کاری کا کام دوسروں کے حوالے کرتا ہے اور یہ لوگ اس زمین کو خود آباد کرنے کے باوجود محض مزارع کی حیثیت سے زمین کو کاشت کرتے ہیں۔

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اگر کسب و محنت[1] ہی ملکیت کا سبب بنتی ہے تو اس زمین کے مالک وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کو محنت سے آباد کیا ہے اور جو لوگ آج اس قسم کی زمینوں کے مالک بنے بیٹھے ہیں ان کی ملکیتیں قطعی ناجائز ہیں[2] اور یہ حکومت اسلامیہ کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ ان زمینوں کے حقوق ملکیت مستقل طور پر پہلا مزارعین کی طرف منتقل کرے اور موجودہ مالکوں کو ان زمینوں سے بالکل بے دخل کردے۔[3]

احادیث نبوی سے یہ بات ثابت ہے کہ محض تحجیر سے کوئی شخص زمین کا مالک نہیں بن سکتا[4]، کیونکہ تحجیر صرف اعلام کے لئے ہوتی ہے[5] اور ملکیت احیا ہی سے متحقق ہوسکتی ہے۔

---

[1] کسب و محنت ہی ملکیت کا سبب بنتی ہے" آخر اس دعویٰ کی کوئی دلیل بھی ہے؟ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اگر کوئی شخص تانگہ خرید کر کرایہ پر چلانے کے لئے دوسرے کو دیدے اور حاصل ہونے والی آمدنی میں اپنا حصہ مقرر کرلے تو یہ جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس تانگے کے ساتھ اس کے کسب و محنت کا تعلق باقی نہیں رہا ہے۔ اس قسم کی ہزار مثالیں صدیوں قرن اول سے برابر رائج چلی آرہی ہیں شریعت نے ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ لیکن اس مذکورہ بالا اصول کے ماتحت یہ سب ناجائز ٹھہرتی ہیں (ترجمان)

[2] جب یہ مذکورہ بالا اصول ہی غلط ہے تو پھر اس کا جو نتیجہ نکالا گیا ہے وہ کیسے درست ہوسکتا ہے "قطعی ناجائز" ہونے کیلئے تو کوئی قطعی بنیاد ہونی چاہئے۔ فافہم (ترجمان)

[3] ہمارے یہاں بیشتر ملکیتیں اسی قسم کی ہیں اور ان کی کاشت کرنے والے لوگ "موروثی مزارع" کہلاتے ہیں۔ (صدیقی)

[4] یہ کہنا کہ تحجیر سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی غلط ہے، اصل میں ملکیت تو تحجیر سے ثابت ہوجاتی ہے ہاں اگر وہ تین سال تک آباد نہ کرے تو حکومت اس کی ملکیت ساقط کرسکتی ہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص تین سال کے اندر کسی تحجیر شدہ زمین پر قبضہ کرنا چاہے تو قانون اُسے اجازت نہ دیگا۔ یہ اسی وجہ سے ہے ناکہ تحجیر سے پہلے اس شخص کی ملکیت ثابت ہوچکی ہے فافہم۔

[5] حدیث میں ہے۔ من سبق الی ماء لم یسبقہ الیہ مسلم فھو لہ (ابوداؤد) "جو کسی ایسے پانی کی طرف پہلے پہنچ گیا جہاں ابھی تک اس سے قبل کوئی دوسرا مسلمان نہیں پہنچا تو وہ پانی اس کا ہے" یہاں ماء سے مراد وہ زمین ہے (باقی صفحہ ۷۰ پر)

عن الزهری عن سالم عن ابیه قال کان الناس یتحجرون علی عهد عمرؓ فقال من احیا ارضا فهی له (فتح الباری وعینی شرح بخاری)

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لوگ زمینوں پر محض نشان لگاتے تھے، حضرت عمرؓ نے فرمایا جو شخص زمین کو باقاعدہ آباد کریگا وہ مالک متصور ہوگا۔

وروی ابو عبید بن سلام فی کتاب الاموال باسناده عن محمد بن عبد الله الثقفی قال کتب عمرؓ ان من احیی ارضا مواتا فهو احق به ۔

جو شخص غیر آباد زمین کو آباد کرے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے

دوسری قسم کی ملکیت زمین کو ایک مرتبہ آباد کرنے کے بعد اس کو معطل چھوڑ دیا جاتے، میں علماء سلف کا اختلاف ہے لیکن متذکرہ قرآنی اصولوں کی روشنی میں صحیح یہی ہے کہ ایسی ملکیتوں کو ختم کر دیا جاتے اور اس طرح کی زمینیں اہل حاجت میں تقسیم کر دی جائیں نیز احادیث سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ ایسی ملکیت کو ہمیشہ کے لئے برقرار نہ رکھا جائے بلکہ ایک موت کے بعد دوسروں کی طرف منتقل کر دیا جائے۔

(بقیہ حاشیہ صت۳۳) جس میں کنواں یا چشمہ پایا جاتا ہے کیونکہ محض پانی پر تو شخصی ملکیت ثابت ہی نہیں ہو سکتی۔ عرب میں ماء بنی فلاں بولا جاتا ہے اور اس سے کوئی خاص بستی یا آبادی مراد ہوتی ہے نہ کہ صرف پانی کا چشمہ ـــــ

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے جو پہلے پہنچ کر کسی غیر مملوکہ افتادہ زمین پر قبضہ کرے تو وہ اس کی ہو جاتی ہے۔ یہاں ملکیت کیلئے احیاء شرط نہیں ہے۔ (ترجمان)

ؔ تین سال کا قانون صرف تحجیر کے لئے مخصوص ہے یا عام ہے؟ اس میں اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اس کو عام ہی رکھا جائے کیونکہ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے اور اصول قرآنی بھی عموم ہی کے حق میں ہیں۔ (صدیقی)

نوٹ: تین سال کے قانون کو عام قرار دینے کے لئے کسی واضح نص کی ضرورت ہے۔ ایک شخص اپنی خریدی ہوئی زمین تین سال سے زیادہ عرصہ تک بیکار چھوڑے رکھتا ہے۔ تو کیا حکومت محض اس بنا پر اس کا حق ملکیت ساقط کر سکتی ہے؟ حکومت یہ تو کر سکتی ہے کہ دباؤ ڈال کر مالک کو آباد کرنے پر آمادہ کرے لیکن سلب ملکیت کا حق اُسے حاصل نہیں ہو سکتا۔ تین سال کا قانون تو تحجیر شدہ زمین یا عطیہ منجانب سرکار پر ہی جاری ہو سکتا ہے۔ (ترجمان)

تیسری قسم کی ملکیت زمین کو بھی اگر متذکرہ اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے۔ تو بالکل ظاہر ہے کہ جب کسب و محنت ہی سبب ملکیت ہے تو جب تک اس شخص کی محنت کے اثرات کسی نہ کسی شکل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ زمین میں موجود رہیں گے اس وقت تک وہ اس کا مالک متصور ہوگا اور یہ بات اسلام کے اصول عدل کے خلاف ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص زمین کو آباد کرکے اس کی کاشت۔ کاری کا کام مستقل طور پر دوسرے کے سپرد کر دے۔ اور اس کے بعد اسے آباد کرنے والی نسلوں میں زمین کے حقوق ملکیت منتقل ہوتے چلے جائیں اور جو لوگ صدیوں سے اس زمین کو آباد کرتے چلے آتے ہیں ان کو محض موروثی یا غیر موروثی مزارع کی حیثیت حاصل ہو۔

یہ دوسری بات ہے کہ اگر ایک شخص کسی وجہ سے خود کاشت نہیں کرتا اور وہ اجرت دے کر دوسرے سے کاشت کراتا ہے تو اس صورت میں وہ گویا خود ہی کاشت کرنے والا متصور ہوتا ہے اور بالواسطہ اس کی محنت کے اثرات زمین میں قائم رہتے ہیں۔[1]

زمینداری کی ایک اور قسم ہے جس کو عرف عام میں جاگیرداری کہتے ہیں۔ اس قسم کی زمینوں کو تم کئی حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں (۱) جو حکومت مغلیہ کے عہد میں جاگیر کے طور پر کسی کو دی اور وہ اب تک اس کی نسلوں میں منتقل ہوتی چلی آتی ہے (۲) جو سکھوں کے عہد اقتدار میں کسی کو اس کی خدمات کے صلہ میں دی گئی تھی (۳) جو انگریزوں نے اپنے خیر خواہوں اور مت فروشوں کو جاگیر کے طور پر دی تھی۔ چونکہ یہ جاگیریں شرعی نقطہ نظر سے بالکل ناجائز ہیں اس لئے ان کو بھی متذکرہ بالا اقسام زمینداری کی طرح ختم کرنا ضروری ہے۔

زمینداری کی ان اقسام کو زمانہ نبوت کے اشخاص و قبائل کی زمینوں پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق[2] ہے یعنی یہ

---

[1] یہ فرق واضح نہ ہوا کہ اگر کوئی زمیندار تنخواہ پر ملازم رکھ کر کاشت کرائے تو جائز قرار پائے اور بالواسطہ اسی کی محنت شمار ہو۔ لیکن اگر بٹائی پر زمین دے دی جائے تو ناجائز ٹھہرے۔ آخر عقلی طور پر محنت و تصرف کے لحاظ سے دونوں میں کیا فرق ہے؟ اور شرعی طور پر اس فرق کی بنیاد کیا ہے۔ (ترجمان)

[2] واقعی یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر کسی خیر مسلم یا کافر حکومت نے پبلک خدمت کے صلہ میں کوئی جاگیر عطا کی ہو تو کیا اس کو بھی ناجائز ٹھیرایا جائیگا؟ تحقیق کے بغیر حرمت کا عام حکم لگا دینا کس طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ (ترجمان)

کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو لوگ اسلام لاتے تھے ان کی ملکیتوں کو جوں کا توں بحال رکھا گیا تھا۔ اس لئے آج بھی جو لوگ زمینوں پر ناجائز طور پر قابض ہیں ان کی ملکیتوں کو بحال رہنے دیا جاتے بالکل صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملت کی مصلحت عامہ کی خاطر اس وقت ان کی ذاتی ملکیتوں سے تعرض نہیں کیا تھا۔ نیز ان لوگوں نے جس وقت زمینوں پر جائز یا ناجائز قبضہ کیا تھا اس وقت وہ

لائق صاحب مضمون نے اس سوال پر پوری طرح غور نہیں فرمایا کہ آخر وہ کیا مصلحت عامہ تھی جس کی بنا پر ان کی ذاتی ملکیتوں سے تعرض نہ کیا گیا؟ وہ مصلحت یہ تھی کہ وہ ... تھے اس لئے آپ نے ان کو ان کا اطمینان دلا دیا کہ لوگ تمہارے پاس جو دست مکسوب ... ڈاکہ، چوری، سود، قحبہ گری اور دوسرے ناجائز ذرائع سے حاصل کئے ہوئے جو حرام مال جمع ہیں وہ ... تمہاری ہی ملکیت رہیں گے۔ ... تم کسی اصول ... میں داخل ہو جاؤ۔ اگر یہ آپ کا خیال ہے تو آپ ایک بہت بڑی کمزوری خدا اور رسول کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس شدید الزام کی یہ توجیہ کہ وہ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام سے پہلے وہ لوگ احکام شریعت کے مکلف نہ تھے اس لئے اسلام قبول کرنے کے بعد ان سے تعرض نہ کیا گیا۔ احکام شریعت کے تو نہیں مگر احکام اخلاق کا تو ہر انسان مکلف ہے۔ ڈاکہ، چوری، غصب اور قحبہ گری کو انسان نے کب جائز تسلیم کیا ہے۔ پھر جن لوگوں کے پاس ان ذرائع سے حاصل کئے ہوئے اموال تھے ان کی ملکیتیں اسلامی نظام قائم ہونے پر کیوں برقرار رکھی گئیں؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہے اور یہی اس پورے مسئلے کو حل کر دیتا ہے کہ اسلام کسی ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیتے وقت سابق نظام کے سارے معاملات پر خط نسخ نہیں پھیر دیتا، بلکہ اپنی اصلاحی تدابیر کو صرف آئندہ معاملات میں جاری کرتا ہے۔ البتہ اگر سابق نظام کے بقایا میں سے کوئی ایسی خرابی اس وقت موجود ہو جس کا تدارک ممکن ہو تو اس کے تدارک میں وہ دریغ بھی نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر متبنیٰ ماؤں سے نکاح کو جب حرام کیا گیا تو سابق نکاحوں کے معاملہ میں یہ تو ضرور کیا گیا کہ جن لوگوں کے گھروں میں اس وقت ایسی عورتیں تھیں ان کو الگ کر دیا گیا، لیکن یہ نہیں کیا گیا کہ پہلے جن جن لوگوں کے آباء و اجداد نے اس طرح کے نکاح کئے تھے ان سب کو ولد الزنا قرار دیا جاتا اور ان سے ان کے باپ دادا کی میراثیں چھین لی جاتیں۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ جب ایک غلط نظام کسی ملک میں مدت دراز سے جاری رہا ہو اور اس میں صحیح و غلط ہر طرح کے کام ہوتے رہے ہوں تو یہ بات انسانی طاقت سے باہر ہے کہ یک وقت آپ پچھلے سارے معاملات کی تحقیقات کر کے صحیح اور غلط معاملات اور ان کے اثرات (باقی صفحہ پر)

مسلمان نہیں تھے اور نہ وہ احکامِ شریعت کے مکلف تھے مگر یہاں دوسری صورت ہے کہ ان زمینوں پر جن لوگوں نے قبضہ کیا تھا وہ مسلمان تھے لیکن چونکہ اس وقت صحیح اسلامی حکومت قائم نہ تھی اس لئے اُن سے کسی نے تعرض نہیں کیا اور اگر آج خدا کرے خالص حکومتِ اسلامی قائم ہو جائے تو اُس کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اس قسم کی زمینوں کی چھان بین کرے۔ چنانچہ خلفاء راشدین اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانۂ خلافت میں ایسا ہی ہوتا رہا

مسئلہ مزارعت | سطورِ بالا میں موجودہ زمینداریوں کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے اور ملکیتِ زمین کی شرعی حیثیت کو بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ اب اس بات میں کسی طرح کا الجھاؤ باقی نہیں رہنا چاہئے کہ جب ہمارے زمانہ کی اکثر و بیشتر زمینی ملکیتیں سرے سے جائز و صحیح ہی نہیں ہیں تو ان میں عقدِ مزارعت کا تحقق ہی کیسے ہو سکتا ہے؟ یعنی آپ جس کو مالکِ زمین تصور کرتے ہیں وہ دراصل مالک ہی نہیں ہے اور جس کو آپ موروثی یا غیر موروثی مزارع

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۶) و نتائج کو الگ الگ معلوم کر سکیں اور پچھلی تمام غلطیوں کا تدارک کر سکیں۔ اور یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ آپ اس تحقیقات کو ناممکن پا کر یہ فیصلہ کر دیں کہ پچھلے سارے معاملات جو کفر و جاہلیت کے زیرِ اقتدار انجام پائے تھے، چونکہ بنیادی طور پر غلط تھے اس لئے سب کالعدم ہیں۔ ہاں جس جگہ غلط کو صحیح سے ممیز کرنا ممکن ہو اور اس کا تدارک بھی ممکن ہو تو یہ تحقیق اور تدارک البتہ قرین انصاف ہے۔ (ترجمان)

ہم بھی تو یہ چاہتے ہیں کہ ایسے عطیوں کی چھان بین کی جائے اور ان پر اندھا دھند کوئی حکم نہ لگا دیا جائے۔ اس چھان بین میں شرعی نقطۂ نظر سے جو سوالات تحقیق طلب ہیں وہ ہمارے نزدیک یہ ہیں:-

(۱) کسی شخص کو کسی سابق حکومت نے جو عطیہ زمین دیا ہے آیا وہ غیر مملوکہ اراضی یا حکومت کی مملوکہ اراضی میں سے دیا ہے یا کسی ایک سے چھین کر دوسرے کو دیدیا ہے؟ اگر پہلی صورت ہے تو اس حد تک وہ عطیہ درست ہے اور اگر دوسری صورت ہے تو وہ ایک ظلم ہے جس کی تلافی ہونی چاہئے۔

(۲) وہ عطیہ کس نوعیت کی خدمات کے صلہ میں ہے؟ یا کن اغراض کے لئے ہے؟ اگر وہ خدمت یا غرض پبلک کے حقیقی مفاد سے تعلق رکھتی ہے تو اس حد تک وہ جائز ہے اور اگر پبلک کے مفاد کے خلاف ہے تو اسے منسوخ ہونا چاہئے۔

(۳) وہ حدِ اعتدال کے اندر ہے یا اس میں اعتدال سے تجاوز کیا گیا ہے؟ اگر وہ معقول حد کے اندر ہے تو (باقی صفحہ ۱۴۸)

کہتے ہیں وہ حقیقت میں زمین کا آباد کار ہے اور شرعی نقطۂ نظر سے یہی اس کا حقیقی مالک ہے[1]۔

اب ہم نفس مسئلہ مزارعت پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ اسلام کے معاملاتی تصور اور قرآن کے اصول حکمیہ کے لحاظ سے اس کی حیثیت کیا ہے؟ دراصل قرآن حکیم نے معاملات کی صحت و فساد کو عام اصولی رنگ میں بیان کیا ہے اور اس کے جزئیات و تفاصیل متعین کرنے کے لئے ہمیں بہرحال احادیث و آثار اور قیاس ہی سے مدد لینی پڑے گی۔ چنانچہ قرآن حکیم نے معاملات کے بارے میں ایک قانون کلی بیان کیا ہے کہ

اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (آیہ) خدا نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ بیع اور ربوا دونوں از قبیل معاملات ہیں۔ لیکن ربا میں وہ کون سا قبح ذاتی ہے جس کی وجہ سے قرآن حکیم نے اس کو صرف ممنوع ہی قرار نہیں دیا بلکہ سودی کاروبار کرنے والوں کو ان وحشت ناک الفاظ میں چیلنج کیا ہے کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئیں گے تو انہیں خدا و رسول سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے

ربٰو کی حقیقت پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے معاشرہ کے ایک طبقہ میں انتہائی درجہ کی خود غرضی، غریب کشی، سنگ دلی، قساوت قلبی اور دولت پرستی کے جراثیم نشوونما پاتے ہیں اور دولت بڑھنے اور پھیلنے کے بجائے اسی ایک طبقہ میں سکڑتی اور سمٹتی چلی جاتی ہے اور دوسرے طبقہ میں اسی تناسب سے غربت و افلاس اور فقر و فاقہ بڑھتا اور دولت گھٹتی چلی جاتی ہے اور پھر اسی رفتار سے اس طبقہ میں پہلے طبقہ کے خلاف شدید انتقامی جذبہ بھڑکتا چلا جاتا ہے اور اس معاشی کھینچا تانی کا قدرتی اور طبعی نتیجہ بخت طبقاتی تصادم اور معاشرہ کے فساد و اختلال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اب دوسری باتوں سے قطع نظر مزارعت کے مسئلہ پر ہمیں اسی نقطۂ نظر سے غور کر لینا چاہئے کہ کیا معاملۂ مزارعت اپنی ذات کے اعتبار سے سودی کاروبار کی طرح معاشرہ میں مستقل اور دائمی شورش و اضطراب

(دیکھیے حاشیہ صفحہ ۴۲) بجا ہے اور اگر بے اعتدالی کے ساتھ کسی خاندان کو بہت زیادہ زمین دے دی گئی ہے تو اوپر کی دونوں شرطیں پوری ہونے کی صورت میں ان کے پاس معقول حد تک زمین چھوڑ کر زائد زمین ان سے واپس لی جا سکے گی۔ (ترجمان)

[1] یہ بات جس بے احتیاطی کے ساتھ کہی گئی ہے وہ کسی ایسے شخص کو زیب نہیں دیتی جو شرعی مسائل پر عالمانہ اظہار رائے کر رہا ہو۔ (ترجمان)

پیدا کرنے والا نہیں ہے؟[1] اس بات کو نہ دیکھئے کہ مزارعت کا رواج شروع سے چلا آتا ہے[2] اور اس کے قائلین جواز میں بڑے بڑے اہلِ علم وتقویٰ بھی شامل ہیں۔ ہمیں ان بزرگوں کے علم وتقویٰ سے انکار نہیں ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے دل میں ان بزرگانِ دین کا احترام کسی دوسرے سے کم نہیں ہے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علماء سلف میں سے جنہوں نے مزارعت کو ناجائز قرار دیا ہے وہ بھی علم وتقویٰ میں کسی سے کم نہیں ہے۔ مگر آج ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ علماء سلف کے ان دو گروہوں کے دلائل وشواہد کا جائزہ لیں، اور جو رائے کتاب وسنت سے قریب تر ہو اس کو اپنا لیں۔

آج ملک کے ہر حصہ میں زمینداروں اور اہلِ زراعت میں خطرناک کشمکش چل رہی ہے اور اس کی وجہ سے ہمارا معاشرہ ایک شدید طبقاتی جنگ کی طوفانی لہروں سے ٹکرا رہا ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ نتیجہ ہے زمینوں کی غلط تقسیم اور مزارعت کے طریقہ پر زمینوں کی کاشت کرانے کا؟[3] اور یہ زمانہ حاضر کا کوئی عارضی حادثہ نہیں ہے بلکہ خلافت راشدہ کے بعد سے زمیندار اور کاشت کار

---

[1] یہ ایک عجیب طرز استدلال ہے۔ ربوٰ کے حکم کا اطلاق کسی دوسری شے پر کرنے کا صحیح شرعی طریقہ تو یہ تھا کہ ربوٰ کی صورت معاملہ سے ملتی جلتی صورت آپ اس میں ثابت فرما دیتے۔ لیکن اس کے بجائے آپ کر یہ رہے ہیں کہ پہلے ربوٰ کی حرمت کے اسباب اپنے طور پر متعین فرماتے ہیں، پھر ایک دوسری شے میں وہ قباحتیں بیان کرتے ہیں جو آپ کے نزدیک حرمت ربوٰ کا سبب ہیں، اور اس پر یہ عمارت کھڑی کرتے ہیں کہ چونکہ اس شے میں بھی وہی قباحتیں پائی جاتی ہیں جو ربوٰ میں ہیں اس لئے یہ بھی ربوٰ کی طرح حرام ہے۔ (ترجمان)

[2] اسے کیوں نہ دیکھا جائے جبکہ متعدد صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد خلافت راشدہ میں بکثرت جلیل القدر صحابہ مزارعت کرتے تھے اور خیبر میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کی ہے۔ (ترجمان)

[3] یہاں جناب مصنف دو مختلف چیزوں کو خلط ملط کر رہے ہیں۔ ایک چیز ہے نفس عقد مزارعت۔ دوسری چیز ہے وہ ظالمانہ طریقے جو مزارعت کے ساتھ زمینداروں نے شامل کر رکھے ہیں۔ آپ جن خرابیوں کا ذکر فرما رہے ہیں وہ پہلی چیز کا نہیں بلکہ دوسری چیز کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان خرابیوں کو آپ دلیل بنا رہے ہیں پہلی چیز کی تحریم کے لئے (باقی صفحہ پر)

کی تقسیم پیدا ہو گئی تھی اور اس وقت سے زمینداروں کی طرف سے اہل زراعت سے ناروا سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ بلکہ خود آنحضرت صلعم نے بھی ایک مرتبہ اس اندیشہ کا اظہار فرمایا جبکہ دو شخص ، مالک اور مزارع ، اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرانے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ، آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا[1]۔

ان کان ھذا شانکم فلا تکروا المزارع (ذکرہ الطحاوی) — اگر تمہاری حالت یہ ہے تو پھر تم زمینوں کو بٹائی پر دینا چھوڑ دو[2]۔

آج سے سات آٹھ سو سال پہلے کے زمانہ کی نسبت مشہور عالم ابن تین ؒ کے الفاظ سے آپ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

ان المشاھدۃ الآن ان اکثر الظلم انما ھو علی اھل الحرث۔ — اس وقت مشاہدہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اہل زراعت پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو مزارعت حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے بھی ربا کے مفہوم میں داخل ہے چنانچہ تجارت اور سودی کاروبار کے اس فرق کو تمام علماء امت تسلیم کرتے ہیں کہ تجارت خواہ انفرادی ہو یا بطور شرکت ، اور پھر شرکت کی صورتوں میں سے کوئی صورت ہو بہرحال اس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے ، لیکن سودی کاروبار میں ایسا نہیں ہوتا یعنی اس میں فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے اور نقصان کا احتمال نہیں ہوتا۔ اب مزارعت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹) زمینداروں کے ظالمانہ طریقوں کا کوئی معقول آدمی بھی حامی نہیں ہے۔ ہم خود چاہتے ہیں کہ ان کا سختی کے ساتھ انسداد کیا جائے۔ مگر جب تک آپ یہ نہ ثابت کر دیں کہ مزارعت بجائے خود یہ قباحتیں پیدا کرتی ہے آپ کے استدلال کی حیثیت مغالطہ سے کچھ بھی مختلف نہیں مانی جا سکتی۔

[1] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے لوگوں کو مزارعت سے تدریجی طور پر منع کیا تفصیل آگے آئیگی ۱۲ (صدیقی)

[2] یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے دو شریک آپس میں جھگڑیں اور ایک صلح پسند انسان اصلاح کی کوئی صورت نکلتی نہ دیکھ کر ان سے کہے کہ بھائی اس لڑائی جھگڑے سے بہتر ہے کہ تم شرکت میں کاروبار کرنا چھوڑ دو۔ آخر اس کے معنی یہ کیسے ہو گئے کہ وہ دنیا بھر کے لئے شرکت میں کاروبار کو روک دینا چاہتا ہے ؟ (ترجمان)

کو دیکھئے کہ یہ کاروبار بھی بالکل ایسا ہی ہے کہ صاحب زمین کا اصل مال (زمین) ہر حال میں باقی رہتا ہے، اس میں کسی خسارہ کا احتمال ہی نہیں ہے۔ البتہ اگر فصل نہ ہو تو کسان کی محنت ضائع چلی جاتی ہے[۱]۔ لہذا مزارعت کو مضاربت پر قیاس کرنا سراسر غلط ہے کیونکہ مضاربت میں رب المال جو سرمایہ کاروبار میں لگاتا ہے ہو سکتا ہے کہ خسارہ کی صورت میں وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ لیکن یہاں زمین کے چلے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے[۲]

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ نئی اختراع نہیں ہے بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کو ربوا سے تعبیر کیا ہے۔

من لم یدع المخابرۃ فلیؤذن بحرب من اللہ ورسولہ (حدیث جابرؓ)

لہذا مذکرہ بالا آیت کا مفہوم متعین کرنے میں ان احادیث ہی سے مدد لی گئی ہے (مسئلہ مزارعت اور حدیث کے باب میں ان احادیث کو ذکر کیا جائے گا۔

---

[۱] اس تشریح کے مطابق مضاربت بھی ربوا سے مشابہ ٹھیرائی جا سکتی ہے کیونکہ اس میں بھی یہ صورت پیش آسکتی ہے کہ سرمایہ دینے والے فریق کا راس المال محفوظ رہ جائے اور دونوں فریق منافع کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں۔ پھر کیا اس طرح کے احتمالات کی بنا پر آپ تجارتی شرکت کو بھی سود کے حکم میں داخل فرمائیں گے؟ (ترجمان)

[۲] جی نہیں۔ یہاں بھی یہ اندیشہ موجود ہے۔ اگر فصل نہ ہو تو مالک زمین بھی اس بات پر مجبور ہو سکتا ہے کہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے زمین اونے پونے فروخت کر دے۔

پھر یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ آپ مضاربت کو جائز اور مزارعت کو ناجائز قرار دیتے ہیں حالانکہ شریعت میں مضاربت کے جواز کا حکم مزارعت کے جواز ہی پر قیاس کر کے نکالا گیا ہے۔ بجائے خود مضاربت کے جواز پر کوئی مستقل شرعی دلیل موجود نہیں ہے۔ چنانچہ امام خطابی لکھتے ہیں۔

واصل المضاربۃ فی السنۃ المزارعۃ والمساقاۃ فکیف یجوز ان یصح الفرع ویبطل الاصل۔ معالم السنن شرح ابوداؤد ج ۳ صفحہ ۹۴۔ یعنی سنت میں مضاربت کے جواز کا تو ماخذ ہی مزارعت اور مساقات ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اصل تو باطل ہو اور فرع صحیح قرار پائے؟[۳] (ترجمان)

[۳] دیکھو صفحہ ۱۴۴

جو لوگ آج مزارعت کا جواز ثابت کرنے پر ہی مُصر ہیں اگر وہ قرآنی آیات اور احادیث مرفوعہ کی تاویل کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں تو ان کو اس بات کے تسلیم کرنے میں کیا چیز مانع ہے کہ مزارعت میں بدرجۂ اقل ربوا کا شبہ تو بہرحال موجود ہے اور احادیث و آثار میں ایسے معاملات سے بھی مجتنب رہنے کی تاکید کی گئی ہے جن میں سود کا ہلکے سے ہلکا شائبہ پایا جاتا ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ | اس موقع پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ جب مزارعت جائز نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں

(حاشیہ صفحہ ۱۴۱) اس حدیث میں بٹائی کی خاص شکل کی حرمت کا بیان ہے جیسے صحیح مسلم میں "ماذیانات" والی روایت میں واضح کیا گیا ہے لیکن اگر یہ حدیث مزارعت کی تمام صورتوں کو ربوا قرار دیتی ہے اور اس کے مرتکبین کو اعلان جنگ سناتی ہے تو پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ خلفاء راشدین اور اس عہد کے اجلۂ صحابہ اس معصیت فاحشہ کو نہ صرف یہ کہ برداشت کرتے رہے بلکہ خود بھی ان کا اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ آخر یہ کیسے ہوا؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ حضرت ابوہریرہؓ اور دوسرے دو چار صحابہ کے کان میں چپکے سے یہ بات کہہ دی تھی کہ بٹائی پر کاشت کرنا حرام ہے؟ کیا زمین کا معاملہ ایسا ہی تھا کہ صرف چار پانچ آدمیوں سے اس کا حکم بیان کر دیا جاتا اور خلفائے راشدین، صوبوں کے گورنروں اور عدالت کے قاضیوں تک کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ زمین کے معاملہ میں ان کی حکومت کا قانون کیا ہے؟ اس طرح کے احکام ان لوگوں کو معلوم ہونے چاہئے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی حکومت میں وزیر، گورنر اور قاضی رہ چکے تھے یا ان لوگوں کو جنہیں آپ کے عہد میں حکومت اور عدالت کے معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا؟ (ترجمان)

لہ دراصل اس قسم کے معاملات میں ربوا کا دخل اس وقت ہوتا ہے جبکہ ایک فریق کا حصہ متعین کر دیا جائے اور دوسرے فریق کا حصہ غیر متعین رہے مثلاً زمیندار یہ کہے کہ پیداوار کم ہو یا زیادہ بہرحال میں تو ... من غلہ یا جنس یا اسی روپیہ سے کر ہی رہوں گا۔ لیکن اس کے بجائے دونوں فریق اگر اپنے سے پوری پیداوار میں سے نصف یا ثلث وغیرہ حصہ طے کر لیں تو پھر یہ نہ سود ہوگا اور نہ اس حالت میں کسی نزاع و جدال کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

کہ ایک شخص صرف اتنی ہی زمین کا مالک رہ سکتا ہے جس کو وہ خود کاشت کر سکتا ہو اس تحدید سے اسلام کے دوسرے قوانین مثلاً قانونِ وراثت، قانونِ بیع و شرا وغیرہ متاثر ہونگے یعنی ان میں بھی تحدید کرنی پڑے گی حالانکہ ایسا کرنا قطعی غلط ہوگا۔

دراصل یہ سوال اس وقت صحیح ہے جبکہ یہ فرض کر لیا جائے کہ عدمِ جوازِ مزارعت اور تحدیدِ ملکیتِ زمین میں لزوم ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے یعنی زمین کو دوسروں سے کاشت کرانے کے ایسے طریقے بھی ہیں جو بالاتفاق جائز ہیں مثلاً نقد اجرت دے کر کاشت کرانے کے جواز میں کسی کو اختلاف نہیں ہے[1] چنانچہ رافع بن خدیج دجہ احادیثِ عدمِ جوازِ مزارعت کے راوی ہیں، ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے۔

عن رافع بن خدیج ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن کراء المزارع قال حنظلۃ فسألت رافع بن خدیج بالذہب والفضۃ فقال اما بالذہب والفضۃ فلا بأس بہ (رواہ مالک)	رسول اللہ صلعم نے کھیتوں کو کرایہ پر دینے (مزارعت) سے منع فرمایا ہے۔ حنظلہ کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن خدیج سے دریافت کیا کہ سونے اور چاندی کے بدلے میں دینا کیسا ہے؟ فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دراصل اختلاف اس صورت میں ہے کہ زمین کی پیداوار کے ایک حصہ پر زمین کاشت کرنے کو دی جائے جس کو مزارعت کہا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ممنوع ہے اور امام احمدؒ کے

[1] نقد اجرت پر کاشت کرانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مالک زمین کسی شخص کو مزدور کی حیثیت سے استعمال کرے اور اس کی محنت کی اجرت نقد دے کر پوری پیداوار خود لے لے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مالک زمین کاشت کار سے نقد لگان وصول کر لے اور پیداوار پوری کی پوری کاشت کار کے پاس رہے۔ پہلی صورت میں اس کا احتمال ہے کہ فصل کچھ بھی نہ ہو مگر کاشت کار اپنی معین اجرت وصول کرے۔ دوسری صورت میں اس کا امکان ہے کہ کاشت کار کے ہاں کوئی پیداوار نہ ہو مگر مالک زمین اپنا طے شدہ لگان لے لے۔ یہ دونوں صورتیں بٹائی کی بہ نسبت [illegible] سے قریب تر ہیں۔ لیکن عجیب لطیفہ ہے کہ صاحبِ مضمون ان دونوں کو تو جائز مانتے ہیں مگر بٹائی کو ناجائز۔

نزدیک مشروط طور پر جائز ہے یعنی وہ اس شرط پر جائز قرار دیتے ہیں کہ بیج مالک زمین کی طرف سے[1] ہو۔ غالباً یہ شرط انہوں نے ربوٰ سے بچنے کے لئے عائد کی ہے۔

مسئلہ مزارعت اور حدیث

احادیث نبوی اور آثار صحابہ کی روشنی میں مسئلہ مزارعت کی بحث و تحقیق سے پہلے اس سوال کو حل کرنا ضروری ہے کہ جب ایک ہی معاملہ میں متعارض اور مختلف الحکم احادیث وارد ہوئی ہوں یعنی کچھ احادیث اس کے جواز پر دلالت کرتی ہوں اور دوسری احادیث سے اس کا عدم جواز مفہوم ہوتا ہو تو اس صورت میں ان متعارض احادیث کے رو سے اس معاملہ کے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ کس طرح کیا جا سکے گا؟ کیا اس کا فیصلہ ہر شخص کے رجحان طبیعت اور میلان نفس پر چھوڑ دیا جائے گا یا اس کے لئے کوئی اصولی طریق کار ہے جس کے پیش نظر ایک طرف کی احادیث کو ناسخ یا راجح اور دوسری طرف کی احادیث کو منسوخ یا مرجوح قرار دیا جائے گا؟

اس بات کا انکار حقیقت الامر کا انکار ہے کہ ائمہ حدیث اور علماء سنت نے علم الحدیث کی ترتیب و تدوین اور تحقیق و تنقیح یعنی احادیث کی صحت و سقم دریافت کرنے میں اتنی کاوش کی ہے کہ انسانی قوائے علم و عمل کے لئے اس سے زیادہ ممکن ہی نہ تھی۔ ان حضرات نے علم الحدیث کو زیادہ سے زیادہ قریب الیقین اور مستند بنانے کے لئے حدیث کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا اور آگے چل کر اس کا ہر پہلو مستقل فن بن گیا۔ مثلاً محدثین کا ایک طبقہ وہ ہے جس نے انتہائی محنت سے احادیث کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیا اس طبقہ میں بخاریؒ، مسلمؒ، ابوداؤدؒ، امام مالکؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جس نے اسناد یعنی رواۃ حدیث کے معیار عدل و ضبط، ثقاہت و تفقہ، تقویٰ و طہارت اور دیگر وجوہ جرح و تعدیل سے بحث

---

[1] جس مجمل طریقہ سے صاحب مضمون نے ائمہ اربعہ کے مذاہب کو نقل کیا ہے یہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ "مسئلہ ملکیت زمین" میں مذاہب کی جو تفصیل دی گئی ہے براہ کرم وہ اس کو ملاحظہ فرمائیں، پھر یا تو اس کو غلط ثابت کریں یا تمہیں تو مذاہب ائمہ سے غلط طریقے پر استدلال کرنا چھوڑ دیں۔ (ترجمان)

کی ہے۔ اس ضمن میں بہت سے دوسرے امور بھی آگئے ہیں۔ مثلاً رواۃِ حدیث کی سن پیدائش، سن وفات، علمی مشاغل، سماع حدیث کے سلسلہ میں اساتذہ کا ترتیب وار ذکر، نیز "الاسماء والکنیٰ" کی تشریح وغیرہ۔ اس اہم شعبہ حدیث پر لکھنے والوں میں شعبہ بن الحجاج، سفیان ثوری، عبدالرحمان بن مہدی، یحییٰ بن القطان، یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل شامل ہیں۔ نیز اس شعبہ حدیث سے ایک دوسرے شعبہ نے جنم لیا جس کو "موضوعات الحدیث" کہا جاتا ہے۔ اس موضوع پر بہت سے ائمہ حدیث نے کتابیں لکھی ہیں مثلاً ابن جوزی، سیوطی، عراقی، ملا علی قاری اور شوکانی وغیرہم۔

ایک اور طبقہ ہے جس نے روایت و فقہ حدیث کو موضوع بنایا۔ مثلاً سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ، امام احمد، عبداللہ بن المبارک، اسحاق بن ابراہیم راہویہ، امام بخاری، ابوداؤد۔

ابن خلدون فلسفہ تاریخ کے موجد ہیں اور تمام محدثین نے ان پر اعتماد کیا ہے۔ انہوں نے ایسے اصول درایت وضع کئے ہیں جن سے اخبار و احادیث کی تاریخی صحت کا صحیح جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح علماء حدیث نے دفع تعارض احادیث کو بھی خاص طور پر موضوع بحث بنایا ہے چنانچہ اس موضوع پر امام شافعی نے کتاب اختلاف الحدیث اور ان کے بعد ابن قتیبہ اور طحاوی وغیرہ نے کتابیں لکھی ہیں، اور اس کے علاوہ عام کتب اصول حدیث اور اصول فقہ اسلامی میں متعارض احادیث کی جمع و تطبیق، یا حکم یا نسخ یا ترجیح و اختیار کے ایسے اصول و قوانین موجود ہیں جو ہر حیثیت سے مستند اور سائنٹیفک کہے جاسکتے ہیں اور دفع تعارض احادیث میں ان سے مدد لی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علماء حدیث نے جو کچھ لکھا ہے اس کا اجمال یہ ہے۔

اگر متعارض احادیث میں تعسف و تکلف اور دور از کار تاویل کے بغیر جمع و توفیق ممکن ہو تو اس طریقہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس نوع کو "مختلف الحدیث" کہتے ہیں اور امام شافعی، ابن قتیبہ اور طحاوی نے اس میں مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔

اگر جمع و توفیق ممکن نہ ہو تو تاریخی حالات اور آثار و قرائن سے متعارض احادیث کی تاریخ کا تعین کیا جائے اور جو حدیث زمانہ کے لحاظ سے متاخر ہو اس کو ناسخ اور جو متقدم ہو اس کو منسوخ تسلیم کیا جائے۔

اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر دیکھنا چاہئے کہ متعارض احادیث میں سے ایک کو دوسری پر کوئی ترجیح حاصل ہے، اگر ایسا ہو تو حدیث راجح پر عمل کیا جائے اور مرجوح کو چھوڑ دیا جائے۔ اس ضمن میں علماء حدیث نے وجوہ ترجیح سے

سے مفصل بحث کی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک وجوہ ترجیح دو قسم کے ہیں، ایک قسم سند حدیث سے متعلق ہے اور دوسری متن حدیث سے۔ یعنی یا تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اصول جرح و تعدیل اور دوسرے امور کے اعتبار سے متعارض احادیث کی سندوں کا مقام کیا ہے۔ جس کی سند دوسری سے زیادہ صحیح اور قوی ہے اس کو دوسری پر ترجیح دی جاتی ہے اور یا متن حدیث کے مضمون کو دیکھا جاتا ہے مثلاً ایک طرف کی حدیث سے اصول کلی منہدم ہوتا ہے اور دوسری حدیث کسی خاص واقعہ کو ظاہر کرتی ہے تو اول الذکر کو دوسری کے مقابلہ میں ترجیح دی جاتی ہے۔

یہ ہے وہ اصولی طریق کار جو متعارض احادیث میں برتا جاتا ہے اور احادیث مزارعت میں ہم اسی طریق کو مدنظر رکھیں گے۔ لیکن قبل اس کے کہ ان احادیث سے اصولی بحث کی جائے مزارعت کے جواز اور عدم جواز سے متعلق تمام احادیث و آثار کو بالترتیب یہاں ذکر کرنا ضروری ہے۔

اس باب میں جو احادیث اور آثار مستند کتب حدیث میں ملتے ہیں ان کو ہم ان کی معنوی اور افادی حیثیت سے تین انواع میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) وہ احادیث جن کو مزارعت کے جواز میں اصل اور بنیاد تصور کیا گیا ہے۔

(۲) وہ احادیث جو امتناع مزارعت میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۳) وہ تشریحی اور تائیدی روایات جن سے احادیث مزبورہ کی تائید یا تشریح ہوتی ہے۔

جواز مزارعت سے متعلق احادیث

عن نافع ان عبد الله بن عمر اخبره ان النبی صلعم عامل اهل خيبر بشطر ما يخرج منها من ثمر او زرع۔ (بخاری و مسلم)

حضرت نافعؒ کو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر سے زمین کی پیداوار اور پھل کے نصف پر معاملہ کیا۔

عن ابی هريرة قال قالت الانصار للنبی صلعم اقسم بيننا وبين اخواننا النخيل قال لا فقالوا تكفونا المؤنة ونشرككم فی الثمرة قالوا سمعنا واطعنا (بخاری)

ابو ہریرہ کہتے ہیں۔ انصار نے نبی کریم صلعم کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے اور مہاجرین کے درمیان آپ کھجوروں کے باغ تقسیم کردیں، آنحضرت صلعم نے فرمایا: نہیں۔ انصار نے کہا تو پھر آپ لوگ ہماری جگہ کام اور محنت کریں اور ہم آپ کو

پھلوں میں حصہ دار بنا دیں گے، اس پر مہاجرین نے رضامندی کا اظہار کیا۔

جوازِ مزارعت میں یہ دو ہی مستند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں اس کے علاوہ آثار صحابہ ہیں جن سے اس مسلک کی تائید ہوتی ہے۔

قال قیس بن مسلم عن ابی جعفر قال ما بالمدینۃ اھل بیت ھجرۃ الا یزرعون علی الثلث والربع وزارع علیؓ وسعد بن مالکؓ وعبد اللہ بن مسعود وعمر بن عبد العزیز والقاسم وعروۃ بن الزبیر وآل ابی بکر وآل علی وابن سیرین - (بخاری)

قیس بن مسلم ابی جعفرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ مدینہ میں مہاجرین کا کوئی گھرانا ایسا نہیں جو زمین کو تہائی یا چوتھائی پر مزارعت کے لئے نہ دیتا ہو۔ علیؓ، سعد بن مالکؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، عمر بن عبد العزیزؒ، قاسم، عروہ بن زبیرؒ، آل ابی بکرؓ، آل علیؓ اور ابن سیرینؒ ۔ ان سب حضرات نے زمین کی بٹائی کا معاملہ کیا ہے۔

قال الحسن لا باس ان تکون الارض لاحدھما فینفقان جمیعا فما خرج فھو بینھما ورای ذالک الزھری (بخاری)

حسن بصری کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ایک کی زمین ہو اور دونوں فریق اس سے فائدہ اٹھائیں اور زمین کی پیداوار دونوں میں تقسیم ہو، زہری کا خیال بھی یہی ہے۔

عن ابی جعفر کان ابوبکر یعطی الارض شطراً - (بخاری)

ابو جعفر کہتے ہیں حضرت ابو بکرؓ اپنی زمین نصف حصہ پیداوار پر زراعت کے لئے دیتے تھے۔

ان آثار کے علاوہ کتب حدیث میں اور بھی آثار ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت مزارعت کو جائز تصور کرتی تھی یا وہ خود عقدِ مزارعت کے ذریعہ بٹائی کا معاملہ کرتی تھی۔[1]

امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام حسین علیہ السلام ہیں۔ ان کا یہ بیان کہ مدینہ میں مہاجرین (دو) خوجان کا اپنا گھرانا بھی اس رواج عام پر عامل تھا، بے وزن نہیں ہو سکتا۔ (ترجمان)

... امام کو جائز کہتے تھے (بقیہ حاشیہ)

(امتناعِ مزارعت کی احادیث) عن رافع بن خدیج قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن المحاقلة والمزابنة قال انما یزرع[2] ثلاثة رجل له ارض ورجل منح ارضًا ورجل اکتری ارضًا بذهب او فضة (اخرجه ابوداؤد والنسائی)

رافع بن خدیج[1] کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محاقلہ اور مزابنہ سے منع کیا آپ نے فرمایا کہ تین آدمی زراعت کا کام کرسکتے ہیں۔ ایک وہ جس کی اپنی زمین ہو، دوسرا وہ جس کو زمین بخش دی گئی ہو تیسرا وہ جس نے سونے یا چاندی کے بدلہ میں زمین کرایہ پر لی ہو۔

(۲) عن رافع بن خدیج ان رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی عن کراء المزارع قال حنظلة فسألت رافع ابن خدیج بالذهب والورق فقال اما بالذهب والورق فلا بأس به۔ (رواه مالک)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا (زمین کی پیداوار کے ایک حصہ پر)۔ حنظلہ کہتے ہیں کہ میں نے رافع سے پوچھا کہ سونے اور چاندی کے عوض بھی؟ رافع نے کہا کہ سونے اور چاندی کے عوض کام کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷) اور حضرت ابوبکر، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کے نام تو اس فہرست میں گذر چکے ہیں مزید نام یہ ہیں: حضرت عمر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت زبیر بن العوام، حضرت اسامہ بن زید، حضرت معاذ بن جبل، اور حضرت عبداللہ بن عباس۔ موخر الذکر بزرگ کو چھوڑ کر باقی سب وہ لوگ ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے ستون تھے۔ قاضی، گورنر سپہ سالار انہی میں سے بنتے تھے۔ ملکی معاملات میں یہی شریک مشورہ ہوتے تھے، انہی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جانتے تھے اور عام مسلمان بھی سمجھتے تھے کہ حضور کے بعد یہی لوگ آپ کی جانشینی کے اہل ہیں۔ حیرت ہے کہ ان میں سے کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ ان کی حکومت کا قانون بٹائی کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ ترجمان)

[1] واضح ہے کہ رافع بن خدیج کی عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بمشکل ۲۲ سال تھی۔ جنگ بدر میں نہ شریک ہو سکے تھے کہ ان کی عمر ۱۵ سال سے کم تھی (ترجمان)

[2] انما یزرع سے لیکر آخر تک کی عبارت مدرج ہے یعنی یہ حضرت سعید بن مسیب کا اپنا قول ہوگیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ (امام نسائی ... غلط ...)

(۳) عن رافع بن خديج أنه زرع أرضاً فمرّ به النبي صلعم وهو يسقيها فسأله عن الزرع ولمن الأرض فقال زرعي ببذري وعملي لي الشطر ولبني فلان الشطر فقال أربيتما فردّ الأرض على أهلها وخذ نفقتك (أبو داؤد وطحاوي)

رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک زمین کاشت کی جب وہ کھیت کو پانی دے رہے تھے تو آنحضرت صلعم کا وہاں سے گذر ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا کھیتی اور زمین کس کی ہے؟ ۔ رافع نے جواب دیا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور عمل کے عوض ہے، نصف حصہ میرا ہے اور نصف بنی فلاں کا، آنحضرت صلعم نے فرمایا تم نے سودی معاملہ کیا ہے، پس تم زمین کو مالک زمین کے حوالہ کر دو اور اپنا خرچ لے لو۔

(۴) عن أبي النجاشي مولى رافع بن خديج سمعت رافع بن خديج بن رافع عن عمه ظهير بن رافع قال نهانا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن أمر كان بنا رافقاً قلت ما قال رسول الله فهو حق قال دعاني رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ما تصنعون بمحاقلكم قلت نؤاجرها على الربيع من التمر والشعير قال لا تفعلوا ازرعوها أو أزرعوها أو أمسكوها قال رافع قلت سمعاً وطاعة (أخرجه البخاري)

رافع بن خدیج اپنے چچا ظہیر بن رافع سے روایت کرتے ہیں ظہیر بن رافع نے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے ہم کو ایسے امر سے منع فرمایا ہے جو ہمارے لئے آسانی کا باعث تھا۔ مجھے آپ نے بلا کر فرمایا کہ تم اپنی زمینوں کا کیا کرتے ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ ہم جداول کی پیداوار یعنی کھجور اور جو کی شرط پر اپنی زمین دیتے ہیں، فرمایا ایسا مت کرو۔ تم خود اس کی کاشت کرو یا دوسروں کو یونہی کاشت کے لئے دے دو۔ یا اس کو روک رکھو۔

(۵) عن رافع بن خديج قال كنا نحاقل الأرض على عهد رسول الله صلعم فنكريها بالثلث والربع والطعام المسمى فجاءنا

رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں زمین کو تہائی، چوتھائی اور غلہ کی معین مقدار کے عوض کرایہ پر دیا کرتے تھے ایک دن میرے ایک چچا تشریف لائے اور انہوں نے کہا

لہ اس روایت کی سند میں بکر بن عامر افیوی محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۵۱ (ترجمان)

ذات يوم رجل من عمومتي فقال نهانا رسول الله صلعم عن امر كان لنا نافعا وطاعة الله ورسوله انفع لنا نهانا ان نحاقل بالارض فنكريها على الثلث والربع والطعام المسمى وامر رب الارض ان يزرعها او يزرعها وكره كراءها[1] وما سوى ذلك (اخرجه مسلم)

کہ رسول اللہ صلعم نے ہم کو ایسے امر سے منع فرمایا ہے جو ہمارے لئے بہت سودمند تھا۔ آپ نے اس بات سے منع کیا ہے کہ ہم زمین کو تہائی، چوتھائی اور غلہ کی معین مقدار کے بدلے میں کرایہ پر دیں، اور آپ نے مالک زمین کو حکم دیا ہے کہ وہ خود زمین کی کاشت کرے یا دوسرے کو دے دے اور آپ نے کرایہ زمین کو ناپسند فرمایا۔

(۶) عن عطاء عن جابر قال كانوا يزرعونها بالثلث والربع والنصف فقال النبي صلى الله عليه وسلم من كانت له ارض فليزرعها او ليمنحها فان لم يفعل فليمسك ارضه

حضرت جابرؓ[2] کہتے ہیں کہ حضرات صحابہ تہائی، چوتھائی اور نصف پر زمین کاشت کے لئے دیا کرتے تھے۔ پس نبی کریم صلعم نے فرمایا جس کے پاس زائد زمین ہو اس کو خود کاشت کرے یا دوسرے کو عطا کر دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اپنی زمین کو روک رکھے۔

عن ابی هريرة بلفظ آخر فليمنحها اخاه فان ابى فليمسك ارضه (بخاری ومسلم)

پس وہ اپنے بھائی کو بخش دے پس اگر وہ اس سے انکار کرے تو پھر اپنی زمین روک رکھے۔

(۷) عن جابر بن عبد الله نهى رسول الله صلعم عن المخابرة والمحاقلة (شيخين)

جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مخابرہ اور محاقلہ سے منع فرمایا ہے۔

عن جابر بن عبد الله قال كان لرجال فضول ارضين من اصحاب رسول الله صلعم

کچھ صحابہ کے پاس زائد از ضرورت زمینیں تھیں پس رسول اللہ صلعم نے فرمایا جس کے پاس زائد زمین ہو پس وہ اس کو خود

---

[1] اس روایت سے اگر مطلقاً مزارعت کی حرمت ثابت کی جا سکتی ہے تو زمین کو نقد کرایہ پر دینے کا جواز بھی ختم ہو جاتا ہے۔ فافہم۔ (ترجمان)

[2] معلوم رہے کہ حضرت جابرؓ کی عمر بھی حضور کی وفات کے وقت ۲۳ سال سے زیادہ نہ تھی۔ (ترجمان)

فقال رسول اللہ صلعم من کانت لہ فضل ارض فلیزرعھا او لیمنحھا اخاہ فان ابی فلیمسک ارضہ (بخاری و مسلم)

کاشت کرے، یا اپنے مسلم بھائی کو بخش دے۔ پس اگر وہ انکار کرے تو پھر اپنی زمین کو روک رکھے۔

۸۰۔ عن جابرؓ قال سمعت رسول اللہ صلعم یقول من لم یذر المخابرۃ فلیؤذن بحرب من اللہ عزوجلّ۔ (ابوداؤد، طحاوی)

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص مزارعت ترک نہ کرے گا، اس کو اللہ تعالیٰ کے اعلانِ جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئے

۹) عن زید بن ثابتؓ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المخابرۃ (ابوداؤد)

زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلعم نے مخابرہ سے منع فرمایا۔

اسی روایت میں ہے کہ ثابت بن حجاج نے زید بن ثابتؓ سے پوچھا کہ مخابرہ کیا چیز ہے؟ حضرت زیدؓ نے فرمایا مخابرہ یہ ہے کہ تم زمین کی پیداوار کے نصف یا تہائی یا چوتھائی پر زمین لو۔

۱۰) عن عبد اللہ بن السائب قال سألت عبد اللہ بن مغفل عن المزارعۃ فقال اخبرنی ثابت بن ضحاکؓ ان النبی صلعم نھی عن المزارعۃ (مسلم)

آنحضرت صلعم نے مزارعت سے منع فرمایا ہے۔

عن ابی سعید الخدری قال ان النبی صلعم نھی عن المزابنۃ والمحاقلۃ (مسلم)

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے مزابنہ اور محاقلہ سے منع کیا ہے۔

احادیث نہی کے متعلق چند غور طلب امور: یہاں تک احادیث جوازِ مزارعت اور احادیث نہی کو ترتیب وار ذکر کیا گیا ہے قبل اس کے کہ دونوں طرف کی احادیث کا اصولی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے۔ اس موقعہ پر چند ایسے اہم امور کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے جن کی روشنی میں ان تشریحی روایات کی حیثیت کو متعین کیا جاسکے گا جو

لہ واضح رہے کہ ثابت بن ضحاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صرف سات برس کے تھے۔ (ترجمان)

لہ ان سب روایات کا عموم و اطلاق ہو، ذیادات والی روایت کی بنا پر مقید ہو جائے گا۔ (ترجمان)

متذکرہ احادیث نہی کی تاویل و تشریح میں بعض متقدر صحابہ سے منقول ہیں۔

(۱) احادیث امتناع مزارعت کسی ایک ہی صحابی سے مروی نہیں ہیں بلکہ متعدد جلیل القدر صحابہ نے ان کو روایت کیا ہے اور ان میں وہ صحابہ بھی ہیں جن کا علمی پایہ بہت بلند ہے مثلاً ان میں ایک حضرت زید بن ثابتؓ ہیں جو ان چار فقہا صحابہ میں سے ہیں جن کے استخراجی مسائل پر موجودہ فقہ اسلامی کی بنیادیں اٹھائی گئی ہیں، اور جو زمانۂ رسالت ہی میں افتاء کے فرائض انجام دیتے تھے اور عہد ابوبکرؓ و عمرؓ میں حکومت کی طرف سے ان کو باضابطہ طور پر قاضی مقرر کیا گیا تھا نیز تابعین میں سے سعید بن مسیب، عطاء بن یسار، عروہ اور قاسم ایسے جلیل القدر علماء ان کے تلامذہ میں ہیں اور گو چلکہ امام مالک ایسے یگانۂ روزگار امام حدیث و فقہ نے حضرت زید کے ان تلامذہ ہی سے حدیث و فقہ کی تحصیل کی۔[1]

احادیث نہی کو روایت کرنے والے صحابہ میں حضرت جابر بن عبداللہ کا نام بھی شامل ہے، جن کا شمار طبقۂ اولیٰ کے رواۃ حدیث میں سے ہے، علامہ سیوطی ہشام بن عروہ کی سند سے لکھتے ہیں۔

کان لجابر بن عبد اللہ حلقۃ فی المسجد النبوی یؤخذ عنہ العلم (حسن المحاضرۃ)

مسجد نبوی میں جابر بن عبداللہ کا حلقۂ درس تھا لوگ ان سے علم حاصل کرتے تھے۔

انہی صحابہ میں سے ایک حضرت ابو سعید خدریؓ ہیں جو بلند پایہ عالم حدیث ہیں اور ان کا شمار بھی طبقۂ اولیٰ کے رواۃ حدیث میں سے ہے اور اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ اور دوسرے حضرات جن سے "فلیمنحھا اخاہ" اور حدیث احیاء الارض مروی ہے تمام اونچے پایہ کے عالم ہیں اور ان سب کے متعلق ہرگز یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے منشاء حدیث کے سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔

(۲) جہاں تک متن حدیث کا تعلق ہے اس کے الفاظ میں یقیناً کچھ اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس حدیث کو متعدد صحابہ روایت کرنے والے ہوں اس میں لفظی اختلاف کا پایا جانا ایک ناگزیر امر ہے لیکن جب ہم ان روایات کے مفہوم و مصداق پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ سب میں ایک ہی ہے، کسی روایت میں مخابرہ ہے، کسی میں محاقلہ

---

[1] زید بن ثابت ہی سے رافع بن خدیج کی علی الاطلاق ممانعت والی روایات کی یہ تشریح منقول ہے کہ اس سے وہ شکل مراد ہے جس میں نزاع و قتال کا اندیشہ ہو۔ (ترجمان)

ہے کسی میں یہ دونوں ہیں، کسی میں مزارعت کا لفظ ہے کسی میں کراء الارض بما یخرج منہا، اور کسی میں کراء الارض بالثلث والربع کے الفاظ ہیں مگر ان سب کا مصداق ایک ہی ہے اور وہ بٹائی کے ان تمام طریقوں کی ممانعت ہے جن میں محنت وغیرہ کا معاوضہ زمین کی پیداوار کی شکل میں مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ تمام روایات اس مفہوم پر قطعی الدلالۃ ہیں اور ان میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ رہا زمین کو سونے اور چاندی کے عوض کرایہ پر دینا تو اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔[1]

اب ان تصریحات کو سامنے رکھ کر آپ ان تشریحی روایات پر ایک نگاہ ڈالیں جن میں کچھ مقتدر صحابہ نے احادیث نہی کی تاویل و تشریح کی ہے۔

تشریحی روایات: (۱) قال عمرو قلت لطاوس لو تركت المخابرة فانهم يزعمون ان النبي صلى الله عليه وسلم نهى عنه قال طاوس اني اعطيهم واعينهم وان اعلمهم اخبرني يعني ابن عباس ان النبي صلعم لم ينه عنه ولكن قال ان يمنح اخاه خير له من ان ياخذ عليه خرجا معلوما (بخاری و مسلم)

عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے طاؤس سے کہا، کاش کہ میں مزارعت کو چھوڑ دیتا کیونکہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ نبی کریم صلعم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ طاؤس نے کہا کہ میں لوگوں کو دیتا ہوں اور ان کی مدد کرتا ہوں اور اعلم صحابہ (ابن عباسؓ) نے مجھے بتایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں کیا۔ البتہ انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ اپنے بھائی کو یونہی بخش دینا اس سے بہتر ہے کہ وہ پیداوار کا ایک حصہ

(۲) عن ابن عباس ان النبي صلعم لم يحرم المزارعة ولكن امر ان يرفق بعضهم ببعض (اخرجه الترمذی)

ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مزارعت سے منع نہیں فرمایا بلکہ انہوں نے حکم دیا ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے نرمی کا سلوک کریں۔

(۳) قال طاوس لما سمع (ابن عباسؓ) في كراء الارض قال سبحان الله انما قال رسول الله

طاؤس کہتے ہیں۔ ابن عباسؓ نے جب کرایہ زمین کے متعلق سنا تو فرمایا سبحان اللہ! رسول اللہ صلعم نے تو صرف یہ فرمایا

---

[1] اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے جیسا کہ اس سے پہلے ایک حاشیہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ (ترجمان)

صلعم الا منحها احدکم اخاه؟ قاله تحریضا للناس علی الاحسان ولم ینه عن کرائها

(رواہ احمد)

تھا کہ تم میں سے کوئی ایک شخص اپنے بھائی کو یونہی کیوں نہیں بخش دیتا یعنی آپ نے لوگوں کو نیکی کرنے کی ترغیب دی ہے اور کرایہ زمین سے منع نہیں فرمایا۔

(۴) قال جابر بن عبد اللہ کنا فی زمن النبی صلعم فاخذ الارض بالثلث والربع بالماذیانات[1] فقام رسول اللہ صلعم فی ذالک فقال من کانت لہ الارض فلیزرعها فان لم یزرعها فلیمنحها اخاہ (اخرجہ مسلم)

جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں نالیوں کے اطراف کی پیداوار کے تہائی یا چوتھائی حصہ پر زمین لیا کرتے تھے، تو اس بارے میں رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو اس کو وہ خود کاشت کرے ورنہ اپنے بھائی کو مفت عطا کر دے۔

(۵) عن زید بن ثابت: یغفر اللہ لرافع بن خدیج انا واللہ اعلم بالحدیث منہ انما اتی رجلان النبی صلعم قد اقتتلا فقال ان کان ھذا شانکم فلا تکروا المزارع فسمع رافع بن خدیج قولہ فلا تکروا المزارع[2]

(رواہ ابو داؤد)

زید بن ثابت فرماتے ہیں، خدا رافع بن خدیج کو معاف کرے اصل بات کو میں ان سے زیادہ جانتا ہوں۔ رسول اللہ صلعم کے پاس دو آدمی آئے جنہوں نے باہم جھگڑا کیا تھا اس پر آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اگر تمہاری حالت یہ ہے تو زمینوں کو کرایہ پر نہ دیا کرو۔ رافع نے حضور کی صرف آخری بات ہی سنی "فلا تکروا المزارع"۔

---

[1] یہاں "بالماذیانات" کا لفظ قابل غور ہے۔ اس روایت میں حضرت عبد اللہ بن جابر کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ جن روایات میں مطلقاً "بالثلث والربع" کی صراحت کے ساتھ مزارعت کی ممانعت آئی ہے ان سے مراد یہی "ماذیانات" والی خاص شکل ہے۔ (ترجمان)

[2] زید بن ثابت کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ رافع بن خدیج کی حدیث ممانعت کی کیا اصل بنیاد کیا ہے۔ ان کو "فلا تکروا المزارع" کا پس منظر معلوم نہ تھا کہ یہ ممانعت کس موقع پر آپ نے فرمائی ہے بس انہوں نے "فلا تکروا المزارع" سنا اور اسی کو نقل کر دیا۔

زید بن ثابت کا یہ قول صاف بتلاتا ہے کہ رافع بن خدیج کی روایت میں جس مزارعت کی ممانعت ہے اس سے وہ خاص شکل مراد ہے جس میں فریقین کے درمیان نزاع و قتال کے برپا ہونیکا اندیشہ ہے کہ مزارعت کی شکل۔ زید بن ثابت فقہا صحابہ میں ہیں آخر کی تشریح کیسے رد کی جا سکتی ہے۔ (ترجمان)

(۶) عن سعد بن ابی وقاصؓ قال كنا نكری الارض بما علی السواقی وما سعد بالماء منها فنهانا رسول الله صلعم عن ذالك وامرنا ان نكريها بذهب او فضة۔ (رواه ابو داؤد)

سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ ہم زمین کو پانی کی نالیوں کے کناروں کے حصۂ زمین اور جہاں پانی خود پہنچ جاتے، کی پیداوار کی شرط پر دیتے تھے پس رسول اللہ صلعم نے ہم کو اس سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ ہم سونے اور چاندی کے عوض زمین کی کاشت کرائیں۔

(۷) عن حنظلة بن قيس الانصاری قال سألت رافع بن خديج عن كراء الارض بالذهب والورق فقال لا بأس به انما كان الناس يؤاجرون على عهد رسول الله صلعم على الماذيانات واقبال الجداول واشياء من الزرع فيهلك هذا ويسلم هذا ويسلم هذا ويهلك هذا فلم يكن للناس كراء الا هذا فلذلك زجر عنه واما شيئٌ معلوم مضمون فلا بأس به (مسلم، ابوداؤد)

حنظلہ بن قیس انصاری کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن خدیجؓ سے سونے اور چاندی کے عوض زمین کو کرایہ پر دینے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں ہے بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کے عہد میں لوگ اس شرط پر زمین کو اجرت پر دیتے تھے کہ پانی کی نالیوں کے کناروں اور کھیت کے بعض حصوں میں جو پیداوار ہوگی وہ مالک زمین خود لے گا پس کبھی ایسا ہوتا کہ اس جگہ کی فصل برباد ہو جاتی اور اس جگہ کی بچ جاتی اور کبھی اس کے برعکس ہوتا۔ اس وقت کرایہ زمین کا یہی دستور تھا، اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا لیکن متعین چیز کے عوض زمین کی کاشت کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت حنظلہ کی ایک اور روایت میں "شیئٌ معلوم مضمون" کی جگہ "بالدینار والدرهم" کے الفاظ ہیں۔ وہ روایت یہ ہے۔

(۸) حدثنی عمای انهم كانوا يكرون

رافعؓ کہتے ہیں مجھ سے میرے دو چچاؤں نے بیان کیا کہ

لہ شیئ مضمون سے صرف دینار و درہم مراد لینا درست نہیں روایت کا انداز بتلا رہا ہے کہ اگر زمین کا کوئی ٹکڑا کسی ایک فریق کیلئے متعین نہ ہو بلکہ نصف ثلث پر عقد مزارعت کیا جائے تو جائز ہے (ترجمان)

الارض على عهد النبي صلعم بما ينبت على الاربعاء او شيئ يستثنيه صاحب الارض فنهى النبي صلعم عن ذالك فقلت لرافع فكيف هي بالدينار والدرهم فقال رافع ليس بها بأس بالدينار والدرهم۔

(بخاری، نسائی)

عہد رسالت میں لوگ زمین کو نالیوں کے کناروں کی پیداوار اور اس حصہ زمین کی پیداوار کے عوض دیتے تھے جو مالک زمین اپنے لئے مخصوص کر لیتا تھا پس نبی کریم صلعم نے اس سے منع کر دیا۔ حنظلہ کہتے ہیں کہ اس پر میں نے رافعؓ سے پوچھا کہ دینار اور درہم کے عوض زمین کی کاشت کرانا کیسا ہے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۹) عن نافع ان ابن عمر كان يكري مزارعه على عهد النبي صلعم وابي بكرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وصدرا من امارة معاوية ثم حدث عن رافع بن خديجؓ ان النبي صلعم نهى عن كراء المزارع فذهب ابن عمرؓ الى رافع فذهبت معه فسأله فقال نهى النبي صلعم عن كراء المزارع فقال ابن عمرؓ قد علمت انا كنا نكري مزارعنا على عهد رسول الله صلعم بما على الاربعاء وبشيئ من التبن[1] (بخاری مع عینی)

نافع کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ آنحضرت صلعم ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ کے زمانہ میں اور امیر معاویہ کی امارت کے ابتدائی عہد میں بھی اپنی زمینیں کرایہ پر دیتے رہے، اس کے بعد رافع بن خدیجؓ سے یہ بات سامنے آئی کہ رسول اللہ صلعم نے زمینوں کو کرایہ پر دینے سے منع کیا ہے۔ پس ابن عمرؓ رافع بن خدیج کے پاس گئے اور میں بھی ان کے ساتھ تھا اور حضرت رافع سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ رافعؓ نے کہا رسول اللہ صلعم نے زمین کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ اس پر ابن عمرؓ نے فرمایا، آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ کے زمانہ میں نہروں کے قریب کے حصہ زمین کی پیداوار یا بھوسے کی کسی مقدار کے عوض اپنی زمینیں کرایہ پر دیتے تھے۔

تشریحی روایات پر تنقیدی نظر قائلین جواز مزارعت نے مذکورہ تشریحی روایات کو اپنے مسلک کی تائید میں ذکر کیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے مسلک کا دارومدار ہی ان آثار پر ہے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آسکا کہ ذیل کے بین حقائق ان کی نگاہ سے کیسے اوجھل رہ گئے ہیں؟

---

[1] اس روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک احادیث نہی کا اصل مقام کیا تھا۔ (ترجمان)

(۱) اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد[1] نے امتناعِ مزارعت کی احادیث کو روایت کیا ہے اور ان میں وہ جلیل القدر صحابہ بھی شامل ہیں جو فقہ و احادیث میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں[2]۔ ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ انہوں نے منشاءِ حدیث کے سمجھنے میں غلطی کھائی ہے بعید از قیاس ہے۔

(۲) امتناعِ مزارعت کی احادیث میں ایسے واضح اور غیر مبہم الفاظ موجود ہیں جن سے مزارعت کی تمام صورتوں کی ممانعت معلوم ہوتی ہے اور ان الفاظ کی موجودگی میں تاویلات مذکورہ کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً امتناعِ مزارعت کی احادیث کے ضمن میں روایت ۵ کے الفاظ یہ ہیں۔

آنحضرت صلعم نے محاقلہ (مزارعت) اور مزابنہ (درختوں پر پھلوں کی خریداری) سے منع فرمایا ہے اور آپ نے فرمایا کہ صرف تین آدمی کاشت کاری کر سکتے ہیں۔

(۱) جس کی اپنی زمین ہو (۲) جس کو زمین بخش دی گئی ہو (۳) جو سونے یا چاندی کے عوض زمین کو کاشت کرائے

اس روایت میں "انما" کے لفظ نے حصر پیدا کر دیا ہے یعنی بجز ان تین صورتوں کے کاشتکاری کی باقی تمام صورتیں ممنوع ہیں[3]۔

روایت ۳۵ میں کہا گیا ہے

آنحضرت صلعم نے زمین کو پیداوارِ زمین کے عوض کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ سونے اور چاندی کے عوض کرایہ پر دینا جائز ہے۔

روایت ۳۸ و ۳۹ میں مزارعت کو ربا سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس معاملے سے سخت الفاظ میں منع فرمایا گیا ہے[4]

---

[1] یعنی صرف چھ صحابیوں نے جو حضرت ابو ہریرہ کے سوا سب کے سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کمسن تھے۔ (ترجمان)

[2] مگر ان صحابہ کے مقابلہ میں ان کا کیا مرتبہ ہے جن سے مزارعت کا جواز اور اس پر عمل منقول ہے؟ (ترجمان)

[3] پہلے گذر چکا ہے کہ یہ قول حضور کا نہیں بلکہ سعید بن مسیب کا ہے۔ (ترجمان)

[4] یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس روایت کی سند مخدوش ہے۔ (ترجمان)

روایت ۱۴ کے الفاظ سے بھی حصر معلوم ہوتا ہے۔

تم خود کاشت کرو یا دوسروں کو یونہی کاشت کے لئے دے دو[1]۔

روایت ۵ و ۱۴ میں ذیل کے الفاظ قابل غور ہیں۔

"آپ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ ہم زمین کو تہائی یا چوتھائی یا غلہ کی معین مقدار کے عوض کرایہ پر دیں اور آپ نے مالک زمین کو حکم دیا ہے کہ وہ خود کاشت کرے یا دوسرے کو مفت کاشت کے لئے دے دے، اور آپ نے کرایہ زمین کو ناپسند فرمایا ہے"۔

ان روایتوں میں "علی الثلث والربع[2]" کے الفاظ اتنے واضح ہیں کہ ان میں تاویل کی قطعاً گنجائش نہیں ہے باقی روایات میں "نہی عن المحاقلۃ" اور "نہی عن المزارعۃ" کے واضح الفاظ موجود ہیں۔ ایک روایت میں رافع بن خدیج کے چچا کے مندرجہ ذیل الفاظ قابل غور ہیں۔

یا بنی حارثۃ قد دخلت علیکم الیوم مصیبۃ۔ — اے بنی حارثہ آج تم پر ایک بڑی مصیبت آپڑی ہے۔

اگر تشریحی روایات کی تصریحات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس صورت میں احادیث نہی کو مزارعت کی کچھ مخصوص صورتوں پر محمول کیا جائیگا۔ اور ظاہر ہے کہ مزارعت کی ایک آدھ صورت (جو تشریحی روایات میں مذکور ہے) کی ممانعت اس قدر مصیبت کی بات نہ تھی جبکہ مزارعت کی دوسری جائز صورتیں موجود تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے

---

[1] اس روایت سے تو صرف دو صورتوں کا جواز نکلا، خود کاشت کرو یا دوسروں کو یونہی کاشت کیلئے دے دو۔ کراء الارض بالذہب والفضۃ کو جائز ماننے کی صورت میں اجلّہ اور فقہاء صحابہ حضرت جابر اور ابو ہریرہ کی روایات کے معنی کیا ہونگے؟ اگر یہاں حصر کے باوجود نقد لگان کا جواز نکل سکتا ہے تو "انما" والی روایت کی حدبندی بھی حدیث خیبر اور تعامل صحابہ سے وسیع ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ "انما" والا جملہ ہی محل نظر ہے۔ جیسا کہ گزشتہ حاشیہ میں اس کی تصریح ہو چکی ہے۔ (ترجمان)

[2] مسلم کی ایک روایت میں جو پہلے گزر چکی ہے علی الثلث والربع کے ساتھ بالماذیانات کی قید بھی موجود ہے۔ اس سے ان روایات کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔ (ترجمان)

کہ آنحضرت صلعم نے مزارعت کی تمام صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے، اور اس کو مذکورہ روایت میں "بڑی مصیبت"[1] سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے توضیحی بیان میں احادیث نہی کو بر و احسان اور اخلاقی فضیلت پر محمول کیا گیا ہے لیکن احادیث مرفوعہ کے واضح غیر مبہم الفاظ کے مقابلہ میں صحابی کی ذاتی رائے کو ہرگز ترجیح نہیں دی جا سکتی[2]۔ یہ بات خود ائمہ حدیث کے نزدیک مسلم ہے۔

(۴) توضیحی روایات کے ضمن میں جابر بن عبداللہؓ، زید بن ثابتؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، رافع بن خدیجؓ اور عبداللہ بن عمرؓ کی روایات میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس سے مزارعت کا جواز مفہوم ہو سکتا ہو۔ ان روایات سے صرف سونے اور چاندی کے عوض زمین کو کرایہ پر دینے کا جواز معلوم ہوتا ہے چنانچہ سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :-

"اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ حکم دیا کہ ہم سونے یا چاندی کے عوض زمین کو کرایہ پر دیا کریں"

اور رافع بن خدیجؓ کی توضیحی روایت میں یہ الفاظ ہیں :-

"دینار اور درہم کے عوض زمین کو کرایہ پر دینے میں کوئی حرج نہیں[3]"

جابر بن عبداللہؓ کی روایت میں "بالثلث، والربع" کے الفاظ اور "من کانت لہ الارض فلیزرعھا

---

[1] اس "بڑی مصیبت" کی وجہ خود رافع بن خدیج ؓ سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس زمانہ میں مزارعت کی ممنوع صورتوں ہی کا رواج تھا۔ (ترجمان)

[2] عبداللہ بن عباس کی اس تشریح کو ذاتی رائے کہہ کر ٹال دینا کوئی صحیح طریق کار نہیں ہے۔ عبداللہ بن عباس کوئی معمولی صحابی نہیں ہیں۔ ان کا شمار جلیل القدر فقہاء صحابہ میں ہوتا ہے۔ یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ حرام و حلال کے معاملہ میں انہوں نے علم کے بغیر اظہار رائے کیا ہوگا۔ آخر متعارض احادیث کا مفہوم متعین کرنے میں صحابہ کرام کے اقوال و افعال سے کیسے بے نیازی برتی جا سکتی ہے؟ یہ واضح رہے کہ صحابہ کی بڑی اکثریت مزارعت کے جواز کی قائل ہے۔ (ترجمان)

[3] عجیب بات ہے کہ عبداللہ بن عباس کی بات تو ذاتی رائے کہہ کر ٹال دی جائے اور رافع بن خدیج کی ذاتی رائے کو خود حجت میں پیش کیا جائے۔ (ترجمان)

فان لم یزرعھا فلیمنحھا اخاہ" کے الفاظ بھی موجود ہیں جن سے امتناع مزارعت کا عموم مفہوم ہوتا ہے[1]

إذا زرعھا او منحھا اخاہ"۔ یدل علی سد باب المزارعۃ بالنھی مطلقاً (المبسوط للسرخسی) — إذا زرعھا الخ کے الفاظ مزارعت کے دروازہ ہی کو مسدود کر دیتے ہیں۔

(۵) دراصل ان توضیحی روایات میں مزارعت کی ایک مخصوص مروجہ صورت بیان ہوئی ہے اور یہ کہ قائلین جواز نے حکم امتناع مزارعت کو اس ایک ہی صورت سے مخصوص کر دیا ہے حالانکہ حکم امتناع عام تھا اور اس ایک ہی صورت سے مخصوص نہ تھا۔[2]

عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو احادیث امتناع مزارعت کا پہلے علم نہ تھا اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جس سے ان کی ذات کی تنقیص ہوتی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی بڑے سے بڑے صحابی کو کسی خاص بات کا علم نہ ہو یا اس کو کوئی حدیث نہ ملی ہو۔[3]

حضرت رافعؓ کی روایت کی بنا پر یہ قطعی حکم لگا دینا کہ حضرت امیر معاویہ کے دور آخر سے پہلے یہ بحث

شدہ صرف امتناع مزارعت ہی کیوں؟ اگر اس روایت کو علی الاطلاق رکھا جائے تو نقد لگان بھی ناجائز اور کاشت کاروں کو اُجرت دے کر کاشت کرنا بھی ناجائز۔ فافہم (ترجمان)

[2] اس دعوی پر کوئی واضح دلیل ہونی چاہئے۔ رافع بن خدیج کی حدیث کے الفاظ فلم یکن لھا الا ھذا الارض الا ھذا سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام ممانعت والی روایات سے یہی خاص شکل مراد ہے نہ کہ مزارعت کی تمام صورتیں۔ (ترجمان)

[3] یہ معاملہ کسی ایک صحابی کا نہیں ہے۔ اس توجیہ و تاویل سے تو لازم آتا ہے کہ نہ صرف عبداللہ بن عمرؓ بلکہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، چاروں خلفاء اپنے عہد خلافت میں یہ نہ جانتے تھے کہ مزارعت کے باب میں ان کے ملک کا قانون کیا ہے۔ نیز حضرت معاذ بن جبل، خباب، سعد بن ابی وقاص، حذیفہ، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، اور دوسرے اکابر اور فقہاء صحابہ اور معاویہ تک حرمت مزارعت سے بالکل بے خبر رہے۔ اور نہ صرف بے خبر تھے بلکہ اس سودی کاروبار کو پورے انشراح قلب کے ساتھ کرتے رہے۔ نیز یہ کہ حضرت ابو ہریرہ، ابو سعید خدری اور جابر بن عبداللہ تقریباً چالیس برس تک یہ سب کچھ دیکھتے رہے لیکن انہوں نے اس منکر عظیم کے خلاف کبھی کوئی احتجاج تک نہ کیا۔ متعارض روایات کی توجیہ جس سے صحابہ کرامؓ کے بارے میں اس قسم کا تصور قائم ہوتا ہے کس طرح باور کی جا سکتی ہے۔ (ترجمان)

چھڑی ہی نہ تھی، صحیح نہیں ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صرف رافع کی ایک روایت (اثر) کی بنا پر ان واضح اور غیر مبہم احادیث مرفوعہ کے مفہوم ہی کو بدل دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اس روایت سے اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اس سے پہلے احادیث مرفوعہ کا علم نہ تھا۔[1]

اصولِ حدیث کی روشنی میں احادیثِ مزارعت کا جائزہ توضیحی روایات پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد ان احادیث مرفوعہ کا جائزہ لینا باقی رہ گیا ہے جو مزارعت کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور وہ اصولی طریق کار جس کی روشنی میں ان احادیث کا جائزہ لیا جائے گا وہ بھی پہلے مذکور ہو چکا ہے۔

جمع و توفیق اصولی طریق کار کی پہلی شق یہ ہے کہ احادیث متعارضہ میں تطبیق کی سعی کی جائے۔[2] اور یہاں اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ احادیث نہی کو مزارعت کی مخصوص شکل پر محمول کیا جائے جیسا کہ قائلین جواز نے کیا ہے، لیکن یہ صورت ہر لحاظ سے غیر موزوں ہے،[3] چنانچہ گذشتہ سطور میں اس کے وجوہ ذکر کئے جا چکے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں طرف کی احادیث کو الگ الگ مصداق پر محمول کیا جائے اور یہ صورت وہی ہے جو مخالفینِ مزارعت کے قائلین نے اختیار کی ہے یعنی احادیث نہی میں جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ مزارعت (بٹائی) ہے اور حدیث خیبر میں آنحضرت صلعم کے عمل سے جو چیز ثابت ہو رہی ہے وہ خراج مقاسمت ہے اور اسی طرح حدیث معاملہ

---

[1] براہ کرم ذرا پھر سوچئے کہ عبداللہ بن عمرؓ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے ہیں جو دس سال تک سلطنت اسلامیہ کے خلیفہ رہے۔ کیا آپ باور کر سکتے ہیں کہ دس سال تک خلیفہ کا اپنا بیٹا ایک خلاف قانون کام علانیہ کرتا رہے اور نہ خلیفہ اس پر ٹوکے نہ سوسائٹی میں کوئی اور اس پر حرف رکھے نہ کوئی اسے بتائے کہ یہ کام خلاف قانون ہے۔ (ترجمان)

[2] امام شافعی اور بیشتر علماء حدیث کے نزدیک پہلے جمع و تطبیق کی کوشش کی جاتی ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر تاریخی تقدم و تاخر دریافت کیا جاتا ہے، لیکن حنفیہ کے نزدیک پہلے تاریخی شواہد سے تقدم و تاخر معلوم کیا جاتا ہے، اور متقدم کو منسوخ اور متاخر کو ناسخ قرار دیا جاتا ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر جمع و توفیق کی کوشش کی جاتی ہے ۱۲۔ (صدیقی)

[3] تطبیق کی یہ شکل تو خود راوی حدیث حضرت رافع بن خدیج سے مروی ہے پھر اسے غیر موزوں کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اور آخر احادیث کے درمیان تطبیق دینے کی اس سے زیادہ موزوں صورت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک حدیث کی ایسی تشریح کی جائے جس سے دوسری احادیث کی تکذیب لازم نہ آئے۔ (ترجمان)

انصار و مہاجرین سے مساقات کا جواز نکلتا ہے، اس تقدیر پر ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا حدیث خیبر کو خراج مقاسمت پر محمول کیا جا سکتا ہے؟ دراصل غور سے دیکھا جائے تو اراضی مفتوحہ کے بارے میں شرعی قانون یہ ہے کہ اگر ملک کفار پر مسلمانوں کا قبضہ باہم مصالحت کے ذریعہ سے ہو تو اس میں حکم یہ ہے کہ صلحنامہ میں جن امور کو فریقین نے تسلیم کر لیا ہو ان کی پابندی کی جائے اور شرائط صلح سے سرِمو بھی انحراف نہ کیا جائے چنانچہ فتح خیبر کے بعد یہود وادی القریٰ آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بغیر جنگ کے انہوں نے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی کی، آنحضرت صلعم نے ان سے چند شرائط پر معاہدہ کیا۔ یعنی وادی القریٰ کی پیداوار میں اس سے پہلے یہود اور بنی عذرہ برابر کے شریک تھے اور آپ نے اس کو تین حصص میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ مسلمانوں کے لئے ایک بنی عذرہ کے لئے اور ایک یہود کے لئے، نیز معاہدۂ صلح میں آنحضرت صلعم کے یہ الفاظ بھی مرقوم تھے أقرکم بما أقرکم اللہ۔ جب تک خدا کو منظور ہوگا ہم تم کو یہاں رہنے دیں گے۔

اسی طرح نصاریٰ نجران سے آپ نے مندرجہ ذیل شرائط پر معاہدہ کیا تھا۔

على أموالهم وأنفسهم وأرضهم وملتهم	ان کے مال، جان، زمین، مذہب، غائب، حاضر، قبیلہ،
وغائبهم وشاهدهم وعشيرتهم وبيعهم	عبادت گاہوں اور ہر اس چیز پر جو ان کے قبضہ میں
وكل ما تحت أيديهم من قليل أو كثير (كتاب الخراج)	ہے خواہ تھوڑی ہو یا زیادہ، یہ معاہدہ جاری ہوگا۔

اور اگر ارض کفار پر مسلمانوں کا قبضہ جنگ کے ذریعہ (عنوۃً) ہو تو اس صورت میں قانون شریعت نے امیر ملت کو اختیار دیا ہے کہ وہ محاربین کی زمینوں کو غانمین میں تقسیم کر دے یا سابق مالکوں کے قبضہ ہی میں رہنے دے۔ دوسری صورت میں اسکو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ ان زمینوں پر خراج وظیفہ مقرر کرے یا خراج مقاسمت؛ لیکن اس صورت میں زمین کے مالک وہی لوگ متصور ہوں گے۔ اور ان کی طرف سے تمام حقوق ملکیت مثلاً بیع و شرا اور وراثت وغیرہ ان میں جاری ہوں گے۔ یعنی جب امیر ملت نائب ملت کی حیثیت سے دوسری صورت کو ترجیح دیتا ہے تو گویا وہ خود ہی حقوق ملکیت سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ اور اہل الذمہ کو ان زمینوں کی ملکیت کا آئینی حق حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عہد خلافت راشدہ میں بالعموم دوسری صورت پر ہی عمل کیا گیا۔

ارضِ خیبر کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا ایک حصہ جنگ کے ذریعہ فتح ہوا تھا اور دوسرا حصہ مصالحت سے؛ پہلا حصہ آپ نے غانمین میں تقسیم کر دیا اور اس کا انتظام حکومت نے اپنے ذمے لیا تھا اور دوسرا حصہ اصل مالکوں ہی کے پاس رہنے دیا گیا اور اس پر خراج مقاسمت[ل] مقرر فرمایا

ظاہر ہے کہ ان دو حصوں کی نوعیت الگ الگ تھی، اور اس کے احکام بھی جدا جدا تھے لیکن بعد میں فقہا نے ان دونوں کو خلط ملط کر دیا، قائلین امتناع مزارعت نے اس دوگونہ معاملہ کو صرف خراج مقاسمت پر اور قائلین جواز نے مزارعت پر محمول کر لیا حالانکہ یہاں یہ دونوں چیزیں تھیں لیکن دو الگ الگ خطوں میں۔

اس تحقیق کی بنا پر قائلین امتناعِ مزارعت کی یہ توجیہ دفع تعارض کے لئے کافی نہیں ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے من واحسان کے طور پر زمین ان کے پاس ہی رہنے دی اور ان پر خراج مقاسمت مقرر فرمادیا کیونکہ قائلین جواز یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہماری مراد ان زمینوں سے ہے جو غانمین میں تقسیم کی گئی تھیں اور ان کی کاشت کاری کا کام مزارعت کے طریق پر ہونا قرار پایا تھا۔

بہرصورت یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت تک آیت جزیہ نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔ تو یہ خراج مقاسمت کیا؟ ابوبکر رازی نے شرح مختصر الطحاوی میں اس کا یہ جواب دیا ہے۔

ومما یدل علی ان ما شرط من نصف التمر والزبیب کان علی وجه الجزیة انه لم یروَ فی شیٔ من الاخبار انه صلی الله علیه وسلم اخذ منهم الجزیة الی ان مات ولا ابوبکرؓ ولا عمرؓ الی ان اجلاهم ولو لم یکن ذالك لاخذ منهم الجزیة

آنحضرت صلعم نے کھجوروں اور زمین کی پیداوار کے نصف کی جو شرط عائد کی تھی، وہ جزیہ کے طور پر تھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کہیں موجود نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم نے یہود سے اس کے علاوہ کوئی جزیہ لیا ہو، یہاں تک کہ آپ اس دنیا سے رحلت ہو گئے اور آپ کے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ نے بھی نہیں

[ل] خراج مقاسمت کا مفہوم یہ ہے کہ امام پیداوار کا چوتھا یا دسواں حصہ یا ثلث کے لئے مقرر کرے اور زمین اصل مالک ہی کے پاس رہنے دے۔ اگر زمین میں کچھ نہ پیدا ہو تو اس سے کچھ نہ وصول کرے۔ ۱۲ (صدیقی)

حين نزلت آية الجزية — لیا یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے ان کو جلا وطن کیا۔

بحوالہ عینی شرح بخاری — اگر یہ جزیہ نہ ہوتا تو آیت جزیہ کے نزول کے بعد ان

صـ ۲۴۳ — سے ضرور جزیہ لیا جاتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیداوار کا جو حصّہ بیت المال یا ملّت کے لئے مقرر فرمایا تھا وہ بہرحال ایک حکومتی ٹیکس تھا اور آیت جزیہ کے نزول کے بعد اس ٹیکس کو اصطلاحی جزیہ کا قائم مقام تصور کر لیا گیا۔

بہرحال سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ اس کے پیش نظر احادیث نہی اور حدیث خیبر کا تعارض دور نہیں ہو سکتا۔

جمع و توفیق کی دوسری توجیہ یہ ہے کہ اہل خیبر سے جو معاملہ طے ہوا تھا وہ اجتماعی نوعیت کا تھا اور اس کا تعلق غیر مسلموں کے ساتھ تھا۔ اس سے مطلق مزارعت کا جواز قطعاً ثابت نہیں ہوتا۔[۱]

---

[۱] جناب مصنف نے خیبر کے معاملہ کو جس سرسری طریقہ سے ٹالنے کی کوشش کی ہے یہ معاملہ اس طرح ٹال دینے کے لائق نہیں دراصل یہ جواز مزارعت کے حق میں سب سے بڑی حجت اور امتناع مزارعت کے خلاف سب سے زیادہ مضبوط دلیل ہے خیبر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو حصّوں میں تقسیم فرمایا تھا۔ ایک حصہ حکومت کی ملکیت تھا اور دوسرا حصہ ان مجاہدین پر تقسیم کیا گیا تھا جو جنگ خیبر میں شریک ہوئے تھے۔ دونوں حصّوں کے بارے میں یہودیوں سے نصف نصف کی بٹائی پر معاملہ ہوا تھا۔ پہلے حصّہ کی بٹائی تو ظاہر ہے کہ خراج تھی۔ لیکن دوسرے حصّہ کی بٹائی، جس میں خود حضورؐ کا اپنا ذاتی حصّہ بھی شامل تھا۔ یقیناً مزارعت کے سوا اور کسی تعریف میں نہیں آ سکتی۔ یہ معاملہ چاہے اجتماعی طریقہ پر طے پایا ہو، لیکن جو زمین مجاہدین پر تقسیم کی گئی تھی اس کے مالک یہ مجاہدین فرداً فرداً ہی قرار دیئے گئے تھے۔ ہر ایک کی زمین کے الگ حدود مقرر کر دیئے گئے تھے۔ ہر ایک کو بٹائی میں ایک متعین حصّہ دیا جاتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سے خود بھی ایک مقرر حصّہ پاتے تھے۔ ایسے کھلے کھلے معاملہ کو آخر مزارعت کی تعریف سے آپ کس طرح خارج کر سکتے ہیں۔ محض اتنی سی بات سے اس معاملہ کی اصولی نوعیت میں کیا فرق پڑ جاتا ہے کہ بٹائی کی شرائط ایک ایک شخص نے فرداً فرداً طے نہیں کی تھیں بلکہ امیر قوم نے سب کی طرف سے اکٹھا معاہدہ کر لیا تھا۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ جس طریق معاملہ پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ کے آخری لمحہ تک خود عامل رہے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پورے دور خلافت میں اور حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے ابتدائی عہد میں جس پر عمل کیا وہ حرام کیسے ہو سکتا ہے۔ حقیقی

ناسخ و منسوخ دفع تعارض کے اصولی طریق کار کی دوسری شق یہ ہے کہ متعارض احادیث کا تاریخی تقدم و تاخر دریافت کرنے کے بعد متقدم احادیث کو منسوخ اور متاخر کو ناسخ قرار دیا جائے۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم احادیث مزارعت کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ کہ اسلام سے پہلے اور ابتداء اسلام میں مزارعت کا عام رواج تھا اور ایسے امور میں جو لوگوں میں بہت زیادہ مقبول اور مروج تھے آنحضرت صلعم کا اصلاحی اسلوب کار یہ تھا کہ جزوی مفاسد کی اصلاح سے اصل معاملہ کا بے ضرر ہونا اگر ممکن ہوتا تو صرف ان خارجی اسباب فساد ہی کی اصلاح پر کفایت فرماتے۔ اور اگر کوئی معاملہ اپنی ذات سے پُر ضرر اور معاشرہ کے لئے تباہ کن ہوتا تو اُس کو آپ بالکل ممنوع قرار دیتے تھے۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ اس کی ممانعت تدریجی طور پر انجام پذیر ہوتی تھی، چنانچہ اکثر معاشرتی اور معاشی مسائل میں آپ نے اسی اصول پر عمل کیا۔

احادیث مزارعت پر غائر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی اسی اصول کے تحت مزارعت کو ممنوع قرار دیا گیا، چنانچہ اہل خیبر سے جو معاملہ کیا گیا تھا وہ تاریخی لحاظ سے پہلے کا واقعہ ہے اور اس وقت تک مزارعت کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا تھا چنانچہ احادیث امتناع مزارعت میں سے بعض احادیث کے الفاظ سے اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی جن احادیث میں "نهی عن المخابرة" کے الفاظ پائے جاتے ہیں[1] ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کا واقعہ پہلے کا واقعہ ہے اور احادیث نہی تاریخی لحاظ سے متاخر ہیں[2]

---

[1] مخابرہ کا لفظ خیبر ہی سے لیا گیا ہے اور اس سے معاملہ خیبر مراد لیا جاتا ہے اور بعد میں یہ لفظ مزارعت (بٹائی) کا مرادف بن گیا ہے ۱۲ (صدیقی)

[2] اپنے حسب منشا استدلال کرنے کی کوشش میں جناب مصنف یہ بات بالکل بھول گئے کہ خیبر کے معاملہ کی ابتدا چاہے کسی وقت ہوئی ہو، بہرحال اس پر عمل نبی صلے اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ کے آخری سانس تک کرتے رہے اگر یہ مان لیا جائے کہ معاملۂ خیبر کے بعد آپ نے مزارعت کی ممانعت فرمادی تھی تو اس صورت میں یہ ضروری تھا کہ آپ کم از کم اپنے حصہ کی حد تک اور دوسرے مجاہدین کے ذاتی حصوں کی حد تک خیبر کی بٹائی کا معاملہ ترک فرمادیتے لیکن جب آپ نے ایسا نہیں کیا اور آخر وقت تک خیبر کی بٹائی کا حصہ خود لیتے اور مجاہدین میں تقسیم کرتے رہے تو یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ نے مطلق مزارعت کو حرام نہیں کیا تھا۔ (ترجمان)

کچھ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مزارعت کے مفاسد کا آپ کو پہلی دفعہ اس وقت احساس ہوا جبکہ دو آدمی لڑتے جھگڑتے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا:
ان کان هذا شانکم فلا تکروا المزارع — اگر تمہاری یہ حالت ہے تو تم زمینوں کو کرایہ پہ نہ دیا کرو۔

اس سلسلہ میں جب ہم غور سے دیکھتے ہیں تو بعض احادیث میں مزارعت کی ایک مخصوص شکل کی، بعض میں مطلق مزارعت کی اور بعض میں مطلق کرایۂ زمین کی ممانعت معلوم ہوتی ہے اور اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے تدریجی رفتار سے کرایہ زمین کی ممانعت فرمائی ہے۔

چونکہ حرمت مزارعت کے بارے میں کوئی صریح نص قرآنی وارد نہیں ہوئی بلکہ قرآن حکیم نے اس کو ایک عام اصول اور کلی شکل میں بیان کیا ہے اس لئے ان مختلف احادیث کی موجودگی میں صحابہ کے درمیان اختلاف پایا جانا ناگزیر تھا اور ایسا ہی ہوا۔ کسی کو صرف پہلے کے واقعات کا علم تھا اور اس نے مزارعت کے جواز کا فتویٰ دے دیا اور جن کو بعد کے واقعات کا بھی علم تھا انہوں نے مزارعت کے عدم جواز کا فتویٰ[1] دیا۔ اور پھر اس کی تفصیلات میں صحابۂ کرام اور بعد کے ائمۂ فقہ میں غیر معمولی اختلاف رونما ہوا۔

ان حقائق کے پیش نظر اب یہ سوال خود بخود ہی حل ہو جاتا ہے کہ اگر مزارعت ممنوع تھی تو اتنی اہم چیز بہت سے صحابہ کرام سے کیسے مخفی رہ گئی۔ اور اس وقت سے آج تک مسلمانوں کی اکثریت مزارعت کو کیوں ایک جائز معاملہ تصور کرتی رہی ہے۔ بلکہ عہد خلافت راشدہ میں کیوں اس پہ عمل ہوتا رہا ہے؟

جن لوگوں کو دوسرے معاشرتی اور معاشی مسائل کا علم ہے وہ اس مغالطہ میں ہرگز مبتلا نہیں ہو سکتے

---

[1] جی ہاں، بس غلطی یہ ہوگئی کہ زرعی قانون کے ایک نہایت اہم مسئلے کے متعلق آخری حکم جس سے لاکھوں آدمیوں کی معیشت اور ملک کی زمینوں کے بندوبست پر زبردست اثر پڑنے والا تھا خطبۂ جمعہ میں بیان کرنے اور پبلک میں اعلان عام کرنے کے بجائے صرف چند آدمیوں کو پرائیویٹ طور پر بتا دیا گیا اور اس سے وہ لوگ تک بے خبر رہ گئے جو اس وقت بھی ملک کا نظم و نسق چلانے میں شریک تھے۔ اور بعد میں بھی انہی کو چلانا تھا۔ (ترجمان)

کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بہت سے دوسرے مسائل بھی ایسے ہیں جن کی نوعیت مسئلہ مزارعت کی سی ہے مثلاً اعتقادی مسائل میں مسئلہ معراج ہی کو لے لیجئے۔ قرآنی آیت کے موجود ہوتے ہوئے بھی اس بارے میں صحابہ کے مابین اختلاف تھا کہ معراج نبوی کی نوعیت کیا ہے۔؟

معاشرتی مسائل میں طلاقِ ثلثہ کے مسئلہ پر غور کیجئے۔ قرآن حکیم نے طلاق کا ایک طریقہ بیان کر دیا ہے لیکن چونکہ اس میں تاویل کی گنجائش ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر میں آج تک طلاق ثلثہ کا مسئلہ مختلف فیہ چلا آتا ہے۔ اور اس مسئلہ کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔

سیاسی مسائل میں ملوکیت اور مطلق العنانہ طرز حکومت ہی کو دیکھئے قرآنی آیات اور احادیث نبوی میں کہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا مگر بعد کے فقہا اور متکلمین نے امیر معاویہؓ کے طرز عمل کو سامنے رکھکر اسکو اسلامی طرزِ حکومت کی سہ گانہ اشکال میں سے ایک شکل قرار دے دیا۔[۱]

---

[۱] یہ تینوں مسائل جن کو فاضل مضمون نگار نے نظیر میں پیش فرمایا ہے، ان کے حق میں دلیل نہیں بن سکتے۔ جو چیز یہاں زیر بحث ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ ایک طریق معاملہ جس کا سارے ملک میں عام رواج تھا آپ کے دعوٰی کے مطابق سود کی طرح حرام کیا گیا تھا۔ اس قسم کے معاملات میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا، اور عقل بھی چاہتی ہے کہ یہی ہونا چاہیے تھا، کہ آپ اپنی تقریروں میں اس کا اعلان فرماتے، بار بار اس کا ذکر کرتے، عام طور پر اہل معاملہ کو اس سے باخبر کرتے اور باہر بھی اپنے عمّال کو اس کے بارے میں فرامین بھیجتے۔ لیکن آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ یہاں خود مدینہ کی زراعت پیشہ لوگوں کو بھی اس کا علم نہ ہو سکا۔ مہاجرین اور انصار کے تمام بڑے بڑے گھرانے اس سے بے خبر رہے۔ حضور کے اپنے داماد حضرت علی، اور آپ کے برادر نسبتی حضرت عبداللہ بن عمر اور آپ کے خسر حضرت ابوبکر مزارعت کرتے رہے، ان میں سے کسی کو پتہ نہ چلا کہ یہ طرز معاملہ حرام کر دیا گیا ہے۔ خبر ہوئی تو صرف حضرت ابوہریرہ کو جن کا کوئی تعلق پیشۂ زراعت سے نہ تھا، یا انصار میں سے چار پانچ ایسے نوجوانوں کو جن میں سے ایک صاحب حضور کے انتقال کے وقت صرف سات برس کے تھے اور باقی اصحاب ۲۲ - ۲۳ سال سے زیادہ کے نہ تھے کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے ایک اہم معاملہ کو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ

اسی طرح آپ فقہ اسلامی کے معاشی مسائل پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو بہت سے ایسے مسائل نظر آئیں گے جن میں ابتدا ہی سے اختلاف چلا آتا ہے اور ہر فریق آنحضرت صلعم کے قول و عمل ہی کو بطور سند پیش کرتا ہے۔ لہٰذا کسی مسلک کی تائید کے لئے یہ دلیل ہرگز کافی نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم یا خلافت راشدہ کے عہد میں کیوں ایسا ہوتا رہا ہے؟

راجح و مرجوح اصولی طریق کار کی یہ تیسری شق ہے اور اس کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں، ا) دونوں طرف کی احادیث کی اسناد کو قوت و ضعف کے اصولی معیار پر پرکھا جائے یا متن حدیث کے مفہوم کی نوعیت کو معیار ترجیح قرار دیا جائے۔

پہلی صورت میں یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حرمتِ مزارعت کی احادیث تمام تر مرفوع ہیں، اور دوسرے مسلک کے پیروؤں کا دارو مدار صرف آثار پر ہے اور یہ لوگ اپنے مسلک کی تائید میں کوئی مسند حدیث پیش ہی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ابن التین نے القابسی سے نقل کیا ہے کہ امام بخاری نے جواز مزارعت کے باب میں صرف آثار ہی ذکر کئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ کذا لا دمتی بما یخرج منہا کے باب میں اس کے نزدیک کوئی حدیث مسند جس کی صحت میں کوئی کلام نہ ہو موجود ہی نہیں ہے[۱]

(بقیہ حاشیہ صہ) حضورؐ نے امت تک پہنچانے کا یہ طریقہ اختیار فرمایا ہوگا۔ اس کے جواب میں جو نظریں آپ پیش فرما رہے ہیں ان پر آپ خود غور کر لیں کہ وہ اس اعتراض کو رفع کرنے میں کہاں تک آپ کی مدد کرتی ہیں۔ معراج کا مسئلہ نہ زندگی کے عملی معاملات سے کوئی تعلق رکھتا ہے نہ دین کے بنیادی عقائد سے۔ طلاق ثلٰث کے مسئلے میں اختلاف کی وجہ فہم و نظر اور استنباط کا اختلاف ہے نہ کہ حضورؐ کے ارشادات کا اختلاف رہی ملوکیت، تو آپ خود جانتے ہیں کہ اس معاملہ میں پورے عہد خلافت راشدہ میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ اور جب یہ بلا مسلمانوں پر مسلط کی گئی تو کسی نے بھی یہ دعویٰ نہ کیا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد اس کے جواز کے حق میں اس کے پاس موجود ہے۔ (ترجمان)

[۱] عینی شرح بخاری (صدیقی)

حدیث خیبر اگرچہ مسند ہے لیکن اس میں کئی احتمالات ہیں، اس لئے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔[۱]

۲۔ دوسری حدیث میں انصار و مہاجرین کے معاملہ کا ذکر ہے وہ مساقات سے متعلق ہے اور مزارعت کو مساقات پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے کیونکہ مساقات[۲] مزارعت کی نسبت مضاربت سے زیادہ مشابہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی مزارعت کو تو ناجائز کہتے ہیں۔ اور مساقات ان کے نزدیک جائز ہے۔

اب رہی دوسری صورت یعنی مفہوم حدیث کی نوعیت کے اعتبار سے احادیث جواز مزارعت اور احادیث نہی کا مقابلہ کیا جائے، اس بارے میں علماء حدیث و فقہ نے تصریح کی ہے کہ اگر ایک طرف کی احادیث[۳] سے اصل کلی اور قانون عام مفہوم ہوتا ہو اور دوسری طرف کی حدیث کسی خاص واقعہ کو ظاہر کرتی ہو تو ثانی الذکر کے مقابلہ میں اول الذکر کو ترجیح دی جاتی ہے۔[۳]

---

[۱] احتمالات نکالنے کی بات تو دوسری ہے ورنہ حدیث خیبر کی جو تشریح ہم اوپر کر آئے ہیں اس میں کسی احتمال کی گنجائش نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ خیبر کا معاملہ آپ کے مسلک کے خلاف ایک دلیل قاطع ہے اور اس کو ٹالنے کا وہ طریقہ صحیح نہیں ہے جو آپ اختیار فرما رہے ہیں۔ آپ کو دو باتوں میں سے ایک بات لامحالہ ثابت کرنی ہوگی۔ یا تو یہ کہ حضور نے اپنی طرف سے اور دوسرے مجاہدین کی طرف سے یہودیوں کے ساتھ بٹائی پر معاملہ نہیں کیا تھا اور اپنے آخر زمانہ تک آپ اس پر عامل نہیں رہے۔ یا پھر یہ کہ معاذ اللہ حضور کے قول اور عمل میں اختلاف تھا۔

[۲] مزارعت کو اگر ربوا قرار دیا جا سکتا ہے تو مساقات کب اس "شائبہ ربوا" سے پاک ہے۔ باغ میں اگر کسی سال پیداوار نہ ہو تو جس شخص نے پھلوں کی بٹائی پر باغ کی نگہداشت کا ذمہ لیا ہو اس کی محنت ضائع ہو جائے گی۔ مگر باغ اپنی زمین سمیت مالک کے پاس باقی رہ جائیگا۔ اب فرمایئے کہ آخر کس معقول دلیل کی بنا پر آپ مساقات اور مزارعت میں فرق کرتے ہیں۔ غلہ کی بٹائی ناجائز اور پھلوں کی بٹائی جائز، اس بات کو سمجھنے سے ہم تو قطعی عاجز ہیں۔

[۳] کوئی ایسی قولی حدیث جس سے کوئی اصل کلی یا قانون عام مستنبط ہوتا ہو کسی ایسی فعلی روایت سے منسوخ ہو سکتی ہے۔ جو اس قانون کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہو، الا یہ کہ اس کے خصائص نبوت میں سے ہونے کی کوئی دلیل موجود ہو۔ اس کی نظیر خود عہد نبوی ہی میں ملتی ہے۔ آپ نے حکم دیا تھا (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیں)

اب دیکھئے کہ ایک طرف حدیث خیبر ہے، جس میں ایک خاص واقعہ بیان ہوا ہے، یا معاملۂ انصار و مہاجرین والی حدیث ہے، اور دوسری طرف امتناع مزارعت کی احادیث ہیں جن میں قانون کلی بیان کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا اصول کے تحت احادیث جواز کے مقابلہ میں احادیث نہی ہی کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صد) اذا صلی الامام جالسا فصلوا جلوسا "جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھو" اس روایت سے ایک عام ضابطہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ حکم اس واقعہ سے منسوخ ہو گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور صحابہ نے آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ یہاں ناسخ یہ خاص فعل ہی ہے نہ کہ کوئی قولی اور اصولی روایت۔ لہذا یہ ضابطہ کوئی عمومی اور کلی ضابطہ نہیں قرار دیا جا سکتا کہ جب کبھی نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے عمل ایک طرح کا ثابت ہو اور قول دوسری طرح کا تو لازماً قول کو عمل پر ترجیح دی جائے گی۔ آپ خود غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں کیا قباحت ہے۔ اس کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ نعوذ باللہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل میں تضاد تھا!

سود میں نئے مباحث کا اضافہ

از مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

(قسط : پنجم)

اصلاح کی عملی صورت

پچھلے صفحات میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ سود خواہ کسی نوعیت کا ہو بہر حال وہ انسانی تمدن و معیشت میں سراسر ایک تخریبی طاقت ہے اور ان اہم ترین اسباب میں سے ہے جو ہماری اخلاقی و مادی زندگی میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ اسکے بعد کسی معقول آدمی کو یہ ماننے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ ایک صالح معاشرے میں سود کو حرام ہونا چاہئے۔ اب صرف آخری سوال باقی رہ جاتا ہے جس کا ہمیں جواب دینا ہے، اور وہ یہ ہے کہ "کیا فی الواقع سود کو ساقط کر کے ایک ایسا نظام مالیات قائم کیا جاسکتا ہے جو موجودہ زمانے میں ایک ترقی پذیر معاشرے اور ریاست کی ضروریات کے لئے کافی ہو؟"

چند غلط فہمیاں اس سوال پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ بعض ایسی غلط فہمیوں کو صاف کر دیا جائے جو نہ صرف اس معاملہ میں بلکہ عملی اصلاح کے ہر معاملہ میں لوگوں کے ذہنوں کو الجھایا کرتی ہیں۔

سب سے پہلی غلط فہمی تو وہی ہے جس کی بنا پر مذکورہ بالا سوال پیدا ہوا ہے۔ کسی چیز کو غلط تسلیم کر لینے کے بعد لوگوں کا یہ پوچھنا کہ "کیا اس کے بغیر کام چل بھی سکتا ہے؟" اور اصلاح کی کسی تجویز کو صحیح و برحق مان لینے کے بعد یہ سوال کرنا کہ "کیا یہ قابل عمل بھی ہے؟" دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ خدا کی اس خدائی میں کوئی غلطی ناگزیر بھی ہے اور کوئی راستی ناقابل عمل بھی پائی جاتی ہے یہ دراصل فطرت اور اس کے نظام کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ایک

ایسے فاسد نظامِ کائنات میں سانس لے رہے ہیں جس میں ہماری بعض حقیقی ضرورتیں غلطیوں اور بدکاریوں سے وابستہ کر دی گئی ہیں اور بعض بھلائیوں کے دروازے جان بوجھ کر ہم پر بند کر دئے گئے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی گذر کر یہ بات ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ فطرت خود اس قدر ٹیڑھی اور اوندھی واقع ہوئی ہے کہ جو کچھ خود اُس کے اپنے قوانین کی رو سے غلط ہے وہی اس کے نظام میں مفید اور ضروری اور قابلِ عمل ہے اور جو کچھ اُس کے قوانین کی رو سے صحیح ہے وہی اس کے نظام میں غیر مفید یا غیر ضروری یا ناقابلِ عمل ہے!

کیا واقعی ہماری عقل اور ہمارے علوم اور ہمارے تاریخی تجربات مزاجِ فطرت کو اسی بدگمانی کا مستحق ثابت کرتے ہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ فطرت بگاڑ کی حامی اور بناؤ کی دشمن ہے؟ اگر یہ بات ہے تب تو ہمیں اشیاء کی صحت اور غلطی کے متعلق اپنی ساری بحثیں لپیٹ کر رکھ دینی چاہئیں اور سیدھی طرح زندگی سے استعفا دے دینا چاہئے۔ کیونکہ اس کے بعد تو ہمارے لئے امّید کی ایک کرن بھی اِس دنیا میں باقی نہیں رہتی۔ لیکن اگر ہماری اور کائنات کی فطرت اِس سوءظن کے لائق نہیں ہے تو پھر ہمیں یہ اندازِ فکر چھوڑ دینا چاہئے کہ "فلاں چیز ہے تو بُری مگر کام اُسی سے چلتا ہے، اور فلاں چیز ہے تو برحق مگر چلنے والی چیز نہیں ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جو طریقہ بھی رواج پا جاتا ہے۔ انسانی معاملات اِسی سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور اس کو بدل کر دوسرے طریقے کو چلانا مشکل نظر آنے لگتا ہے۔ ہر رائج الوقت طریقے کا یہی حال ہے، خواہ وُہ طریقہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ دشواری جو کچھ بھی ہے تغیر میں ہے اور سہولت کی اصل وجہ رواج کے سوا کچھ نہیں۔ مگر نادان لوگ اس سے دھوکا کھا کر یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جو غلطی رائج ہو چکی ہے انسانی معاملات بس اسی پر چل سکتے ہیں اور اس کے سوا دوسرا کوئی طریقہ قابلِ عمل ہی نہیں ہے۔

دوسری غلط فہمی اِس معاملہ میں یہ ہے کہ لوگ تغیر کی دشواری کے اصل اسباب کو نہیں سمجھتے اور خواہ مخواہ تجویزِ تغیر کے سر پر ناقابلِ عمل ہونے کا الزام تھوپنے لگتے ہیں۔ آپ انسانی سعی کے امکانات کا بہت

ہی غلط اندازہ لگائیں گے اگر رائج الوقت نظام کے خلاف کسی تجویز کو بھی ناقابل عمل سمجھیں گے۔ جس دُنیا میں انفرادی ملکیت کی تنسیخ اور اجتماعی ملک کی ترویج جیسی انتہائی انقلاب انگیز تجویز کو عمل میں لاکر دکھا دیا گیا ہو وہاں یہ کہنا کس قدر لغو ہے کہ سود کی تنسیخ اور زکوٰۃ کی تنظیم جیسی معتدل تجویزیں قابلِ عمل نہیں ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ رائج الوقت نظام کو بدل کر کسی دوسرے نقشے پر زندگی کی تعمیر کرنا ہر عمرو زید کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن میں دو شرطیں پائی جاتی ہوں :-

ایک یہ کہ وہ فی الحقیقت پرانے نظام سے منحرف ہو چکے ہوں اور سچے دل سے اُس تجویز پر ایمان رکھتے ہوں جس کے مطابق نظامِ زندگی میں تغیر کرنا پیش نظر ہے۔

دوسرے یہ کہ ان میں تقلیدی ذہانت کے بجائے اجتہادی ذہانت پائی جاتی ہو۔ وہ محض اُس طرح کی سی ذہانت کے مالک نہ ہوں جو پرانے نظام کو اُس کے اماموں کی طرح چلائے جانے کے لئے کافی ہوتی ہے بلکہ اُس درجے کی ذہانت رکھتے ہوں جو پامال راہوں کو چھوڑ کر نئی راہ بنانے کے لئے درکار ہوتی ہے۔

یہ دو شرطیں جن لوگوں میں پائی جاتی ہوں وہ کیمونزم اور نازی ازم اور فاشزم جیسے سخت انقلابی مسلکوں کی تجاویز تک عمل میں لا سکتے ہیں۔ اور ان شرطوں کا جن میں فقدان ہو وہ اسلام کے تجویز کے ہوئے انتہائی معتدل تغیرات کو بھی نافذ نہیں کر سکتے۔

ایک چھوٹی سی غلط فہمی اس معاملہ میں اور بھی ہے۔ تعمیری تنقید اور اصلاحی تجویز کے جواب میں جب عمل کا نقشہ مانگا جاتا ہے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں کے نزدیک عمل کی جگہ شاید کاغذ ہے۔ حالانکہ عمل کاغذ پر نہیں زمین پر ہوا کرتا ہے۔ کاغذ پر کرنے کا اصل کام تو صرف یہ ہے کہ دلائل اور شواہد سے نظامِ حاضر کی غلطیاں اور اُن کی مضرتیں واضح کر دی جائیں اور ان کی جگہ جو اصلاحی تجویزیں ہم عمل میں لانا چاہتے ہیں اِن کی معقولیت ثابت کر دی جائے۔ اِس کے بعد جو مسائل عمل سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے بارے میں کاغذ پر اِس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں کو ایک عام تصور اِس امر کا دیدیا جائے کہ پرانے نظام کے غلط طریقوں کو کس طرح مٹایا جا سکتا ہے اور ان کی جگہ نئی تجویزیں کیونکر عمل میں لائی جا سکتی ہیں۔ رہا یہ کہ اس شکست و ریخت کی تفصیلی صورت کیا ہوگی اور اسکے جزوی مراحل

کیا ہونگے اور ہر مرحلے میں پیش آنے والے مسائل کو حل کیسے کیا جائیگا' تو ان امور کو نہ تو کوئی شخص پیشگی جان سکتا ہے اور نہ کوئی جواب دے سکتا ہے۔ آپ اگر اس امر پر مطمئن ہو چکے ہوں کہ موجودہ نظام واقعی غلط ہے اور اصلاح کی تجویز بالکل معقول ہے تو عمل کی طرف قدم اٹھائیے اور زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیجئے جو ایمان اور اجتہادی ذہانت رکھتے ہوں۔ پھر جو عملی مسئلہ جہاں پیدا ہوگا اسی جگہ وہ حل ہو جائیگا۔ زمین پر کئے جانے کا کام آخر کاغذ پر کرکے کیسے دکھایا جا سکتا ہے؟

اس توضیح کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس باب میں جو کچھ ہم پیش کریں گے وہ غیر سودی مالیات کا کوئی تفصیلی نقشہ نہ ہوگا بلکہ اس چیز کا صرف ایک عام تصور ہوگا کہ سود کو اجتماعی مالیات سے خارج کرنے کی عملی صورت کیا ہو سکتی ہے اور وہ بڑے بڑے مسائل جو اخراج سود کا خیال کرتے ہی بادی النظر میں آدمی کے سامنے آجاتے ہیں' کس طرح حل کئے جا سکتے ہیں۔

اصلاح کی راہ میں پہلا قدم

پچھلے تین ابواب میں سود کی خرابیوں پر جو تفصیلی بحث کی گئی ہے اس سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اجتماعی معیشت اور نظام مالیات میں یہ سب خرابیاں صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ قانون نے سود کو جائز کر رکھا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب ایک آدمی کے لئے سود کا دروازہ کھلا ہوا ہے تو وہ اپنے ہمسائے کو قرض حسن کیوں دے' اور ایک کاروباری آدمی کے ساتھ نفع و نقصان کی شرکت کیوں اختیار کرے' اور اپنی قومی ضروریات کی تکمیل کے لئے مخلصانہ اعانت کا ہاتھ کیوں بڑھائے' اور کیوں نہ اپنا جمع کیا ہوا سرمایہ ساہوکار کے حوالہ کر دے جبکہ اسے گھر بیٹھے ایک لگا بندھا منافع ملنے کی امید ہو۔ آپ انسانی فطرت کے بُرے میلانات کو ابھرنے اور کھُل کھیلنے کی کھُلی چھٹی دے دینے کے بعد یہ توقع نہیں کر سکتے کہ نرے وعظ و تلقین اور اخلاقی اپیلوں کے ذریعہ ہی سے آپ اُن کے نشوونما اور نقصانات کو روک سکیں گے۔ پھر یہاں تو معاملہ صرف اس حد تک بھی محدود نہیں ہے کہ آپ نے ایک برے میلان کو محض کھلی چھٹی دے رکھی ہو۔ اس سے آگے آپ کا قانون تو اُلٹا اُس کا مددگار بنا ہوا ہے اور حکومت خود اسی برائی پر اجتماعی مالیات کے نظام کو چلا اور چلوا رہی ہے۔ اس حالت میں آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ کسی قسم کی جزوی ترمیمات اور فروعی اصلاحات سے اس کی برائیوں کا سد باب کیا

جا سکے۔ اِن کا سدِّ باب اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ سب سے پہلے اس دروازے کو بند کیا جائے جس سے خرابی آ رہی ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے کوئی غیر سودی نظام مالیات بن کر تیار ہو لے، پھر سود یا تو آپ سے آپ بند ہو جائیگا، یا اسے قانوناً بند کر دیا جائے گا، وہ درحقیقت گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا چاہتے ہیں۔ جب تک کہ از روئے قانون جائز ہے، جب تک عدالتیں سودی معاہدوں کو تسلیم کر کے اِن کو بزور نافذ کر رہی ہیں، اور جب تک ساہوکاروں کے لئے یہ دروازہ کھلا ہے کہ سود کا لالچ دے کر گھر گھر سے روپیہ اکٹھا کریں اور پھر آگے اسے سود پر چلائیں، اس وقت تک یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی غیر سودی نظام مالیات وجود میں آئے اور نشو و نما پا سکے۔ لہٰذا اگر سود کی بندش اس امر پر موقوف ہے کہ پہلے ایسا کوئی مالی نظام چل کر جڑ بن چکا ہو لے جو موجودہ سودی نظام کی جگہ لے سکتا ہو، تو یقین رکھئے کہ اس طرح قیامت تک سود کے بند ہونے کی نوبت نہیں آ سکتی۔ یہ کام تو جب کبھی کرنا ہو اسی طرح کرنا پڑے گا کہ اول قدم ہی پر سود کو از روئے قانون بند کر دیا جائے۔ پھر خود بخود ایک غیر سودی نظام مالیات پیدا ہو جائیگا اور ضرورت، جو ایجاد کی ماں ہے، آپ سے آپ اس کے لئے ہر گوشے میں بڑھنے اور پھیلنے کا راستہ بناتی چلی جائے گی۔

سود نفس انسانی کی جن بری صفات کا نتیجہ ہے اُن کی جڑیں اس قدر گہری اور ان کے تقاضے اس قدر طاقتور ہیں کہ آدھی ادھوری کارروائیوں اور ٹھنڈی ٹھنڈی تدبیروں سے کسی معاشرے میں اِس بلا کا استیصال نہیں کیا جا سکتا۔ اس غرض کے لئے تو ضروری ہے کہ وہ ساری تدبیریں عمل میں لائی جائیں جو اسلام تجویز کرتا ہے۔ اُسی سرگرمی کے ساتھ اس کے خلاف نبرد آزمائی کی جائے جیسی کہ اسلام چاہتا ہے۔ اسلام سودی کاروبار کی محض اخلاقی مذمت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ایک طرف وہ اس کو مذہبی حیثیت سے حرام قرار دے کر اس کے خلاف شدید نفرت پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف جہاں جہاں اس کا سیاسی اقتدار اور حاکمانہ اثر و نفوذ جاری ہو وہاں وہ ملکی قانون کے ذریعہ سے اس کو ممنوع قرار دیتا ہے، تمام سودی معاہدوں کو کالعدم ٹھیراتا ہے، سود لینے اور دینے اور اس کی دستاویز لکھنے اور

اس پر گواہ بننے کو فوجداری جرم قابل دست اندازی پولیس قرار دیتا ہے، اور اگر کہیں یہ کاروبار معمولی سزاؤں سے بند نہ ہو تو اس کے مرتکبین کو قتل اور ضبطی جائداد تک کی سزائیں دیتا ہے۔ تیسری طرف وہ زکوٰۃ کو فرض قرار دے کر اور حکومت کے ذریعہ سے اس کی تحصیل و تقسیم کا انتظام کر کے ایک دوسرے نظام مالیات کی داغ بیل ڈال دیتا ہے۔ اور ان سب تدبیروں کے ساتھ وہ تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کے ذریعہ عامۃ الناس کی اخلاقی اصلاح بھی کرتا ہے تاکہ ان کے نفس میں وہ صفات اور رجحانات دب جائیں جو سود خواری کے موجب ہوتے ہیں اور اس کے برعکس وہ صفات اور جذبات ان کے اندر نشو و نما پائیں جن سے معاشرے میں ہمدردانہ و فیاضانہ تعاون کی روح جاری و ساری ہو سکے۔

جو کوئی فی الواقع سنجیدگی و اخلاص کے ساتھ سود کا انسداد کرنا چاہتا ہو اسے یہ سب کچھ اسی طرح کرنا ہوگا۔

انسداد سود کے نتائج سود کی یہ قانونی بندش، جب کہ اس کے ساتھ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا اجتماعی انتظام بھی ہو، مالیات کے نقطۂ نظر سے تین بڑے نتائج پر منتج ہوگی:۔

(۱) اس کا اولین اور سب سے اہم نتیجہ یہ ہوگا کہ اجتماع سرمایہ کی موجودہ فساد انگیز صورت ایک صحیح اور صحت بخش صورت سے بدل جائیگی۔

موجودہ صورت میں تو سرمایہ اس طرح جمع ہوتا ہے کہ ہمارا اجتماعی نظام بخل اور جمع مال کے اُس میلان کو جو ہر انسان کے اندر طبعاً تھوڑا بہت موجود ہے، اپنی مصنوعی تدبیروں سے انتہائی مبالغے کی حد تک بڑھا دیتا ہے اور اُسے خوف اور لالچ، دونوں ذرائع سے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ اپنی آمدنی کا کم سے کم حصّہ خرچ اور زیادہ سے زیادہ حصہ جمع کرے۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ جمع کر کیونکہ پورے معاشرے میں کوئی نہیں ہے جو تیرے برے وقت پر کام آئے، اور جمع کر کیونکہ اس کا اجر تجھے سود کی شکل میں ملیگا۔ اس دوہری تحریص کی وجہ سے معاشرے کے وہ تمام افراد جو قدر کفاف سے کچھ بھی زائد آمدنی رکھتے ہیں، خرچ روکنے اور جمع کرنے پر تُل جاتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منڈیوں میں اموال تجارت کی کھپت امکانی حد سے بہت کم ہوتی ہے۔ کھپت کی کمی روزگار کی

کمی پر اور روزگار کی کمی آمدنیوں کی کمی پر منتج ہوتی ہے - اور آمدنیاں جتنی کم ہوتی جاتی ہیں صنعت و تجارت کی ترقی کے امکانات بھی اسی کے مطابق کم اور اجتماع سرمایہ کے مواقع کم تر ہوتے چلے جاتے ہیں اس طرح چند افراد کے اندوختوں کا بڑھنا اجتماعی معیشت کے گھٹنے کا موجب ہوتا ہے ایک آدمی ایسے طریقہ سے اپنی پس انداز کی ہوئی رقموں میں اضافہ کرتا ہے۔ جس سے ہزار آدمی سرے سے کچھ کمانے ہی کے قابل نہیں رہتے کجا کہ کچھ پس انداز کر سکیں۔

اس کے برعکس جب سود بند کر دیا جائے گا اور زکوٰۃ کی تنظیم کرکے ریاست کی طرف سے معاشرے کے ہر فرد کو اس امر کا اطمینان دلا دیا جائے کہ بڑے وقت پر اس کی دست گیری کا انتظام موجود رہے تو بخل و زر اندوزی کے غیر فطری اسباب و محرکات ختم ہو جائیںگے۔ لوگ دل کھول کر خود بھی خرچ کریںگے اور نادار افراد کو بھی زکوٰۃ کے ذریعے سے اتنی قوت خریداری بہم پہنچا دیں گے کہ وہ خرچ کریں - اس سے صنعت و تجارت بڑھے گی۔ صنعت و تجارت کے بڑھنے سے روزگار بڑھیگا روزگار بڑھنے سے آمدنیاں بڑھیں گی۔ ایسے ماحول میں اول تو صنعت و تجارت کا اپنا منافع ہی اتنا بڑھ جائیگا کہ اس - خارجی سرمایہ کی اُتنی احتیاج باقی نہ رہے گی جتنی اب ہوتی ہے۔ پھر جس حد تک بھی اسے سرمایہ کی حاجت ہوگی وہ موجودہ حالت کی بہ نسبت بہت زیادہ سہولت کے ساتھ بہم پہنچ سکیگا۔ کیونکہ اُس وقت پس انداز کرنے کا سلسلہ بالکل بند نہیں ہو جائیگا' جیسا کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں' بلکہ کچھ لوگ تو اپنی پیدائشی افتادِ طبع کی بنا پر ہی اندوختہ کرتے رہیں گے' اور بیشتر لوگ آمدنیوں کی کثرت اور کمالِ آسودگی کی وجہ سے بجوراً پس انداز کریں گے۔ اس وقت یہ پس اندازی کسی بخل یا خوف یا لالچ کی بنا پر نہ ہوگی' بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوگی کہ لوگ اپنی ضرورت سے زیادہ کمائیںگے۔ اسلام کی جائز کی ہوئی مدات خرچ میں خوب دل کھول خرچ کرنے کے باوجود ان کے پاس بہت کچھ بچ رہے گا۔ اس بچی ہوئی دولت کو لینے والا کوئی محتاج آدمی بھی انکو نہ ملیگا' اس لئے وہ اسے ڈال رکھیں گے اور بڑی اچھی شرائط پر اپنی حکومت کو' اپنے ملک کی صنعت و تجارت کو' اور ہمسایہ ملکوں تک کو سرمایہ دینے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔

(۲) دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ جمع شدہ سرمایہ رُکنے کے بجائے چلنے کی طرف مائل رہیگا اور اجتماعی معیشت کی کھیتیوں کو اُن کی حاجت کے مطابق اور ضروریات کے موقع پر برابر ملتا چلا جائے گا۔ موجودہ نظام میں سرمایہ کو کاروبار کی طرف جانے کے لئے جو چیز آمادہ کرتی ہے وہ سود کا لالچ ہے، مگر یہی چیز اُس کے رُکنے کا سبب بھی بنتی ہے۔ کیونکہ سرمایہ اکثر اس انتظار میں ٹھیرا رہتا ہے کہ زیادہ شرح سود ملے تو وہ کام میں لگے۔ نیز یہی چیز سرمایہ کے مزاج کو کاروبار کے مزاج سے منحرف بھی کر دیتی ہے۔ جب کاروبار چاہتا ہے کہ سرمایہ آئے تو سرمایہ کڑ جاتا ہے اور اپنی شرائط سخت کرتا چلا جاتا ہے۔ اور جب معاملہ برعکس ہوتا ہے تو سرمایہ کاروبار کے پیچھے دوڑتا ہے اور ہلکی شرائط پر برا بھلے ہر کام میں لگنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن جب سود کا دروازہ از روئے قانون بند ہو جائیگا، اور تمام جمع شدہ رقموں پر الٹی زکوٰۃ ۲½ فی صدی سالانہ کے حساب سے لگنی شروع ہوگی تو سرمایہ کی یہ بدمزاجی ختم ہو جائے گی وہ خود اس بات کا خواہش مند ہوگا کہ معقول شرائط پر جلدی سے جلدی کاروبار میں لگ جائے اور ٹھیرنے کے بجائے ہمیشہ کاروبار ہی میں لگا رہے۔

(۳) تیسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ کاروباری مالیات اور مالیاتِ قرض کی مدیں بالکل الگ ہو جائینگی موجودہ نظام میں تو سرمایہ کی بہم رسانی زیادہ تر، بلکہ قریب قریب تمام تر ہوتی ہی صرف قرض کی صورت میں ہے، خواہ وہ پیسہ لینے والا شخص یا ادارہ کسی نفع آور کام کے لئے لے یا غیر نفع آور کام کے لئے، اور خواہ عارضی ضرورت کے لئے لے یا کسی طویل المدت تجویز کے لیے۔ ہر صورت میں سرمایہ صرف ایک ہی شرط پر ملتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک مقرر شرح سود پر اسے قرض حاصل کیا جائے۔ لیکن جب سود ممنوع ہو جائیگا تو قرض کی مد صرف غیر نفع آور اغراض کے لئے، یا جہاں تک کاروبار کا تعلق ہے عارضی ضروریات کے لئے مخصوص ہو جائے گی اور اس کا انتظام قرض حسن کے اصول پر کرنا ہوگا۔ جیسی اغراض، خواہ وہ صنعت و تجارت وغیرہ سے متعلق ہوں یا حکومتوں اور پبلک اداروں کی نفع بخش تجویزوں سے متعلق، ان سب کے لئے سرمایہ کی فراہمی قرض کے بجائے مضاربت (حصہ داری) کے اصول پر ہوگی۔

اب ہم اختصار کے ساتھ بتائینگے کہ غیر سودی نظام مالیات میں یہ دونوں شعبے کس طرح کام کر سکتے ہیں۔

غیر سودی مالیات میں فراہمی قرض کی صورتیں پہلے قرض کے شعبے کو لیجیے، کیونکہ لوگ سب سے بڑھ کر جس شک میں مبتلا ہیں وہ یہی ہے کہ سود بند ہونے کے بعد قرض ملنا بھی بند ہو جائے گا۔ لہٰذا پہلے ہم یہی دکھائینگے کہ اس ناپاک رکاوٹ کے دُور ہو جانے سے قرض کی فراہمی صرف یہی نہیں کہ بند نہ ہوگی، بلکہ موجودہ حالت سے زیادہ آسان ہوگی اور بدرجہا زیادہ بہتر صورت اختیار کرے گی۔

شخصی حاجات کے لیئے موجودہ نظام میں شخصی حاجات کے لئے فراہمی قرض کی صرف ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ غریب آدمی مہاجن سے، اور صاحب جائداد آدمی بینک سے سودی قرض حاصل کرے۔ دونوں صورتوں میں ہر طالبِ قرض کو ہر غرض کے لئے ہر مقدار میں روپیہ مل سکتا ہے اگر وہ مہاجن یا بینکر کو اصل و سود کے ملتے رہنے کا اطمینان دلا سکتا ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ گناہ گاریوں کے لئے لینا چاہتا ہو یا فضول خرچیوں کے لئے یا حقیقی ضرورتوں کے لئے۔ بخلاف اس کے کوئی طالبِ قرض کہیں سے ایک پیسہ نہیں پا سکتا۔ اگر وہ اصل و سود کے ملنے کا اطمینان نہ دلا سکتا ہو، چاہے اسکے گھر ایک مردہ لاش ہی بے گور و کفن کیوں نہ پڑی ہو۔ پھر موجودہ نظام میں کسی غریب کی مصیبت اور کسی امیر زادے کی آوارگی دونوں ہی ساہوکار کے لئے کمائی کے بہترین مواقع ہیں، اور اس خودغرضی کے ساتھ سنگ دلی کا یہ حال ہے کہ جو شخص سودی قرض کے جال میں پھنس چکا ہے اس کے ساتھ نہ سود کی تحصیل میں کوئی رعایت ہے نہ اصل کی بازیافت میں۔ کوئی یہ دیکھنے کے لئے دل ہی نہیں رکھتا کہ جس شخص سے ہم اصل و سود کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ کمبخت کس حال میں مبتلا ہے ــــــ یہ ہیں وہ "آسانیاں" جو موجودہ نظام شخصی حاجات میں فراہمی قرض کے لئے بہم پہنچاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ اسلام کا غیر سودی آفاقی نظام اس چیز کا انتظام کس طرح کریگا۔

اول تو اس نظام میں فضول خرچیوں اور گناہ گاریوں کے لئے قرض کا دروازہ بند ہو جائے گا، کیونکہ وہاں سود کے لالچ میں بے جا قرض دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس حالت میں قرض کا سارا لین دین

آپ سے آپ صرف معقول ضروریات تک محدود ہو جائیگا اور اُتنی ہی رقمیں لی اور دی جائیں گی جو مختلف انفرادی حالات میں صریح طور پر مناسب نظر آئینگی۔

پھر چونکہ اس نظام میں قرض لینے والے سے کسی نوعیت کا فائدہ اُٹھانا قرض دینے والے کے لئے جائز نہ ہوگا۔ اس لئے قرضوں کی واپسی زیادہ سے زیادہ آسان ہو جائے گی۔ کم سے کم آمدنی رکھنے والا بھی تھوڑی تھوڑی قسطیں دے کر بار قرض سے جلدی اور بآسانی سبکدوش ہو سکے گا۔ جو شخص کوئی زمین یا مکان یا اور کسی قسم کی جائداد رہن رکھے گا اس کی آمدنی سود میں کھپنے کے بجائے اصل میں وضع ہوگی اور اس طرح جلدی سے جلدی رقم قرض کی بازیافت ہو جائیگی۔ اتنی آسانیوں کے باوجود اگر شاذ و نادر کسی معاملہ میں کوئی قرض ادا ہونے سے رہ جائے تو بیت المال ہر آدمی کی پشت پر موجود ہوگا جو ادائیگی قرض میں اس کی مدد کرے گا' اور بالفرض اگر مدیون کچھ چھوڑے بغیر مر جائے تب بھی بیت المال اس کا قرض ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ ان وجوہ سے خوشحال و ذی استطاعت لوگوں کے لئے اپنے کسی حاجت مند ہمسائے کی ضرورت کے موقع پر اسے قرض دینا اُتنا مشکل اور ناگوار کام نہ رہیگا۔ جتنا اب موجودہ نظام میں ہے۔

اس پر بھی اگر کسی بندۂ خدا کو اس کے محلے یا بستی سے قرض نہ ملے گا تو بیت المال کا دروازہ اس کے لئے کھلا ہوگا۔ وہ جائیگا اور وہاں سے بآسانی قرض حاصل کرلے گا۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ بیت المال سے استمداد اِن اغراض کے لئے آخری چارۂ کار ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے شخصی حاجات میں ایک دوسرے کو قرض دینا معاشرے کے افراد کا اپنا فرض ہے اور ایک معاشرے کی صحتمندی کا معیار یہی ہے کہ اسکے افراد اپنی اِس طرح کی اخلاقی ذمہ داریوں کو خود ہی محسوس اور ادا کرتے رہیں۔ اگر کسی بستی کا کوئی باشندہ اپنے ہمسایوں سے قرض نہیں پاتا اور مجبور ہو کر بیت المال کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ صریحًا اس بات کی علامت ہے کہ اُس بستی کی اخلاقی آب و ہوا بگڑی ہوئی ہے۔ اس لئے جس وقت اِس قسم کا کوئی معاملہ بیت المال میں پہنچے گا تو وہاں صرف اُس طالب قرض کی حاجت پوری کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا جائے گا بلکہ فورًا اخلاقی حفظانِ صحت کے محکمے کو اس "واردات" کی اطلاع

دی جائیگی اور وہ اسی وقت اُس بیمار بستی کی طرف توجہ کرے گا جس کے باشندے اپنے ایک بھائی کی ضرورت کے وقت اس کے کام نہ آئے۔ اِس طرح کے کسی واقعہ کی اطلاع ایک صالح اخلاقی نظام میں وہی اضطراب پیدا کرے گی جو ہیضے یا طاعون کے کسی واقعہ کی اطلاع ایک مادّہ پرست نظام میں پیدا کیا کرتی ہے۔

شخصی حاجات کے لئے قرض فراہم کرنے کی ایک اور صورت بھی اسلامی نظام میں اختیار کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ تمام تجارتی کمپنیوں اور کاروباری اداروں پر اُن کے ملازموں اور مزدوروں کے جو کم سے کم حقوق ازروئے قانون مقرر کئے جائیں اُن میں ایک حق یہ بھی ہو کہ وہ اُن کی غیر معمولی ضرورت کے مواقع پر اُن کو قرض دیا کریں۔ نیز حکومت خود بھی اپنے اوپر ملازموں کا یہ حق تسلیم کرے اور اس کو فیاضی کے ساتھ ادا کرے۔ یہ معاملہ حقیقت میں صرف اخلاقی نوعیت ہی نہیں رکھتا بلکہ اس کی معاشی و سیاسی اہمیت بھی اُتنی ہی ہے جتنی اِس کی اخلاقی اہمیت ہے۔ آپ اپنے ملازموں اور مزدوروں کے لئے غیر سودی قرض کی سہولت بہم پہنچائینگے تو صرف ایک نیکی ہی کریں گے بلکہ اُن اسباب میں سے ایک سبب کو دور کر دینگے جو آپ کے کارکنوں کو فکر، پریشانی، خستہ حالی، جسمانی آزار اور مادّی بربادی میں مبتلا کرتے ہیں۔ اِن بلاؤں سے اُن کی حفاظت کیجئے۔ اُن کی آسودگی اُن کی قوتِ کار بڑھائے گی اور اُن کا اطمینان انہیں فساد انگیز فلسفوں سے بچائیگا۔ اِس کا نفع بہی کھاتے کی رو سے چاہے کچھ نہ ہو۔ لیکن کسی کو عقل کی بینائی میسر ہو تو وہ بآسانی دیکھ سکتا ہے کہ مجموعی طور پر پورے معاشرے ہی کے لئے نہیں، بلکہ فرداً فرداً ایک ایک سرمایہ دار و کارخانہ دار کے لئے اور ایک ایک معاشی و سیاسی ادارے کے لئے اُس کا نفع اُس سود سے بہت زیادہ قیمتی ہوگا جو آج مادّہ پرست نظام میں محض احمقانہ تنگ نظری کی بنا پر وصول کیا جا رہا ہے۔

کاروباری اغراض کے لئے اس کے بعد اُن قرضوں کا معاملہ لیجئے جو کاروباری لوگوں کو اپنی آئے دن کی ضروریات کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ان مقاصد کے لئے یا تو بینکوں سے براہ راست قلیل المدت قرضے (Short term Loans) حاصل کئے جاتے

ہیں، اور ہنڈیاں (Bills of Exchange) بھنائی جاتی ہیں[1]۔ ان دونوں صورتوں میں بینک ایک ہلکی سی شرح سود اس پر لگاتے ہیں۔ یہ تجارت کی ایک ایسی اہم ضرورت ہے جس کے بغیر کوئی کام آج تک نہیں چل سکتا۔ اس لئے جب کاروباری لوگ بندش سود کا نام سنتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے جو فکر لاحق ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ پھر روزمرہ کی ان ضروریات کے لئے قرض کیسے ملیگا؟ اگر بینک کو سود کا لالچ نہ ہو تو آخر وہ کیوں ہمیں قرض دے گا اور کیوں ہماری ہنڈیاں بھنائے گا؟

لیکن سوال یہ ہے کہ جس بینک کے پاس تمام رقوم امانت (Deposits) بلا سود جمع ہوں، اور جس کے پاس خود ان تاجروں کا بھی لاکھوں روپیہ بلا سود رکھا رہتا ہو، وہ آخر کیوں نہ ان کو بلا سود قرض دے اور کیوں نہ ان کی ہنڈیاں بھنائے؟ وہ اگر سیدھی طرح اس پر راضی نہ ہوگا تو تجارتی قانون کے ذریعہ سے اس کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے کھاتہ داروں (Customers) کو یہ سہولت بہم پہنچائے۔ اس کے فرائض میں یہ چیز شامل ہونی چاہیئے۔

درحقیقت اس کام کے لئے خود تاجروں کی اپنی رکھوائی ہوئی رقمیں ہی کافی ہوسکتی ہیں لیکن

---

[1] یہ وہی چیز ہے جس کے لئے ہماری اسلامی فقہ میں "سفاتج" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جن تاجروں کا آپس میں بھی ایک دوسرے سے لین دین ہو اور بینک کے ساتھ بھی معاملہ ہو، وہ نقد رقم ادا کئے بغیر بڑی مقدار میں ایک دوسرے سے مال قرض لے لیتے ہیں اور تین مہینے، دو مہینے، چار مہینے کے لئے فریق ثانی کو ہنڈی لکھ کر دے دیتے ہیں۔ اگر فریق ثانی اس مدت مقررہ تک انتظار کر سکتا ہو تو انتظار کرتا ہے اور وقت آنے پر قرض ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر دوران مدت میں اس کو روپے کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو وہ اس ہنڈی کو اس بینک میں داخل کر دیتا ہے جس سے دونوں فریقوں کا لین دین ہو اور اس سے رقم حاصل کر کے اپنا کام چلا لیتا ہے۔ اسی چیز کا نام ہنڈی بھنانا ہے۔

ضرورت پڑ جانے پر کوئی مضائقہ نہیں اگر بینک اپنے دوسرے مصارف پر سے تھوڑا بہت اس غرض کے لئے استعمال کرلے۔ بہر حال سوائے یہ بات بالکل واجبی بھی ہے کہ جو سود لے نہیں رہا ہے وہ سود دے کیوں؟ اور اجتماعی معیشت کے نقطۂ نظر سے یہ مفید بھی ہے کہ تاجروں کو اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لئے بلا سود قرض ملتا رہے۔

رہا یہ سوال کہ اگر اس لین دین میں بینک کو سود نہ ملے تو وہ اپنے مصارف کیسے پورے کرے گا؟ اس کا جواب یہ کہ جب چالو کھاتوں (Current Account) کی ساری رقمیں بینک کے پاس بلا سود رہیں گی تو اس کے لئے انہی رقموں میں سے دستِ گرداں قرضے بلا سود دینا کوئی نقصان دہ معاملہ نہ رہے گا۔ کیونکہ اس صورت میں حساب کتاب اور دفترداری کے جو تھوڑے بہت مصارف بینک کو برداشت کرنے ہونگے اُن سے کچھ زیادہ ہی فوائد ان رقموں سے حاصل کرلیگا جو اس کے پاس جمع ہونگی۔ تاہم اگر بالفرض یہ طریقہ قابلِ عمل نہ ہو تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ بینک اپنی اس طرح کی خدمات کیلئے ایک ماہوار یا ششماہی فیس اپنے تمام تجارت پیشہ کھاتہ داروں پر عائد کردے جو اس کے مصارف پورے کرنے کیلئے کافی ہو۔ سود کی بہ نسبت یہ فیس ان لوگوں کو زیادہ سستی پڑے گی اس لئے وہ بخوشی اسے گوارا کرلیں گے۔

حکومتوں کی غیر نفع آور ضروریات کیلئے | تیسری اہم مد اُن قرضوں کی ہے جو حکومتوں کو کبھی وقتی حوادث کے لئے، اور کبھی غیر نفع آور ملکی ضروریات کے لئے اور کبھی جنگ کے لئے لینے ہوتے ہیں۔ موجودہ نظام مالیات میں ان سب مقاصد کے لئے روپیہ تمام تر قرض اور وہ بھی سودی قرض کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام مالیات میں یہ عین ممکن ہوگا کہ اِدھر حکومت کی طرف سے ضرورت کا اظہار ہو اور اُدھر قوم کے افراد اور ادارے خود لا لا کر چندوں کے ڈھیر اس کے سامنے لگا دیں اس لئے کہ سود کی بندش اور زکوٰۃ کی تنظیم لوگوں کو اس قدر آسودہ اور مطمئن کردیگی کہ انہیں اپنے اندوختے (Savings) اپنی حکومت کو یونہی دے دینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس پر بھی اگر بقدر ضرورت روپیہ نہ ملے تو حکومت قرض مانگے گی اور لوگ دل کھول کر اسے قرضِ حسن دینگے۔ لیکن اگر اس سے بھی ضروریات پوری نہ ہوسکیں، تو اسلامی حکومت اپنا کام چلانے

کے لئے حسب ذیل طریقے اختیار کر سکتی ہے:۔

(۱) زکوٰۃ و خمس کی رقمیں استعمال کرے۔

(۲) تمام بینکوں سے ان کی رقوم امانت کا ایک مخصوص حصہ حکماً طلب کرلے جس کا اسے اتنا ہی حق پہنچتا ہے جتنا وہ افراد قوم سے لازمی فوجی خدمت (Conscription) طلب کرنے اور لوگوں سے ان کی عمارتیں اور موٹریں اور دوسری چیزیں بزور حاصل کرنے (Requisition) حق رکھتی ہے۔

(۳) بدرجۂ آخر وہ اپنی ضرورت کے مطابق نوٹ چھاپ کر بھی کام چلا سکتی ہے جو دراصل قوم ہی سے قرض لینے کی ایک دوسری صورت ہے۔

بین الاقوامی ضروریات کے لئے | اب رہے بین الاقوامی قرضے تو اس معاملہ میں یہ تو بالکل ظاہر ہی ہے کہ موجودہ سود خوار دنیا میں ہم اپنی قومی ضرورت کے موقع پر کہیں سے ایک پیسہ بلا سود قرض پانے کی توقع نہیں کر سکتے۔ اس پہلو میں تو ہم کو تمام تر کوشش یہی کرنی ہوگی کہ ہم بیرونی قوموں سے کوئی قرض نہ لیں، کم از کم اُس وقت تک تو ہرگز نہ لیں جب تک کہ ہم خود دوسروں کو اس امر کا نمونہ نہ دکھا دیں کہ ایک قوم اپنے ہمسایوں کو کس طرح بلا سود قرض دے سکتی ہے۔ رہا قرض دینے کا معاملہ تو جو بحث اس سے پہلے ہم کر چکے ہیں، اس کے بعد شاید کسی صاحب نظر آدمی کو بھی یہ تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ اگر ایک دفعہ ہم نے ہمت کر کے اپنے ملک میں ایک صالح مالی نظام بندشِ سود اور تنظیم زکوٰۃ کی بنیاد پر قائم کر لیا تو یقیناً بہت جلدی ہماری مالی حالت اتنی اچھی ہو جائیگی کہ ہمیں نہ صرف خود باہر سے قرض لینے کی حاجت نہ ہوگی بلکہ ہم اپنے گرد و پیش کی حاجت مند قوموں کو بلا سود قرض دینے کے قابل ہو جائیں گے۔ اور جس روز ہم یہ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں گے وہ دن دورِ جدید کی تاریخ میں صرف مالی اور معاشی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ سیاسی اور تمدنی اور اخلاقی حیثیت سے بھی ایک انقلاب انگیز دن ہوگا۔ اُس وقت یہ امکان پیدا ہو جائیگا کہ ہمارا اور دوسری قوموں کا تمام لین دین غیر سودی بنیاد پر ہو۔ یہ بھی ممکن ہوگا کہ دُنیا کی قومیں یکے بعد دیگرے باہم ایسے معاہدات طے کرنے شروع کر دیں کہ وہ ایک دوسرے سے سود نہیں لیں گی۔ اور بعید نہیں کہ وہ دن بھی ہم دیکھ سکیں جب بین الاقوامی رائے عام سود خوار ی

کے خلاف بالاتفاق اُسی نفرت کا اظہار کرنے لگے جس کا اظہار ۱۹۴۵ء میں بریٹن ووڈس کے معاملہ پر انگلستان میں کیا گیا تھا۔ یہ محض ایک خیالی پلاؤ نہیں ہے، بلکہ فی الواقع آج بھی دُنیا کے سوچنے والے دماغ یہ سوچ رہے ہیں کہ بین الاقوامی قرضوں پر سود لگنے سے دنیا کی سیاست اور معیشت، دونوں پر نہایت بُرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ اس طریقہ کو چھوڑ کر اگر خوشحال ممالک اپنی فاضل دولت کے ذریعہ سے خستہ حال اور آفت رسیدہ ممالک کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے قابل بنانے کی مخلصانہ و ہمدردانہ کوشش کریں تو اس کا دوہرا فائدہ ہوگا۔ سیاسی و تمدنی حیثیت سے بین الاقوامی بدمزگی بڑھنے کے بجائے محبت اور دوستی بڑھیگی۔ اور معاشی حیثیت سے ایک خستہ حال دیوالیہ ملک کا خون چوسنے کی بہ نسبت ایک خوشحال اور مالدار ملک کے ساتھ کاروبار کرنا بدرجہا زیادہ نافع ثابت ہوگا۔ یہ حکمت کی باتیں سوچنے والے سوچ رہے ہیں اور کہنے والے کہہ رہے ہیں، لیکن ساری کسر بس اس بات کی ہے کہ دنیا میں کوئی حکیم قوم ایسی نہیں ہے جو پہلے اپنے گھر سے سود خواری کو مٹائے اور پھر آگے بڑھ کر بین الاقوامی لین دین سے اس لعنت کو خارج کرنے کی عملاً ابتدا کر دے۔

نفع آور اغراض کیلئے سرمایہ کی بہم رسانی مالیاتِ قرض کے بعد اب ایک نظریہ بھی دیکھ لیجئے کہ ہمارے پیشِ نظر نظام میں کاروباری مالیات کیا شکل اختیار کریں گے۔ اس سلسلہ میں جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، سود کا انسداد لوگوں کے لئے یہ دروازہ تو قطعی بند کر دے گا کہ وہ محنت اور خطرہ (Risk) دونوں چیزوں سے بچ کر اپنے سرمائے کو تحفظ اور متعین منافع کی ضمانت کے ساتھ کسی کام میں لگا سکیں۔ اور اسی طرح زکوٰۃ ان کے لئے اس دروازے کو بھی بند کر دے گی کہ وہ اپنا سرمایہ روک رکھیں اور اس پر مارِ زریں بن کر بیٹھ جائیں۔ مزید براں ایک حقیقی اسلامی حکومت کی موجودگی میں لوگوں کے لئے عیاشیوں اور فضول خرچیوں کا دروازہ بھی کھلا نہ رہیگا کہ اُن کی فاضل آمدنیاں ادھر بہ نکلیں۔ اس کے بعد لامحالہ اُن تمام لوگوں کو جو ضرورت سے زائد آمدنی رکھتے ہوں، دو راستوں میں سے کوئی ایک راستہ ہی اختیار کرنا پڑیگا؛

اگر وہ مزید آمدنی کے طالب نہ ہوں تو اپنی بچت کو رفاہ عام کے کاموں میں صرف کریں خواہ

اس کی صورت یہ ہو کہ وہ خود کسی کار خیر پر اسے وقف کریں، یا یہ ہو کہ قومی اداروں کو چندے اور عطیے دیں، یا پھر یہ ہو کہ بے غرضانہ و مخلصانہ طریقہ سے اسلامی حکومت کے حوالہ کر دیں تاکہ وہ اسے امور نافعہ اور ترقیات عامہ اور اصلاح خلق کے کاموں پر صرف کرے۔ خصوصیت کے ساتھ آخری صورت کو زیادہ ترجیح دی جائیگی جبکہ حکومت کا نظم و نسق ایسے کارکنوں کے ہاتھوں میں ہو جن کی دیانت اور فراست پر عموماً لوگوں کو بھروسہ ہو۔ اس طرح اجتماعی مصالح اور ترقی و بہبود کے کاموں کے لئے حکومت کو اور دوسرے اجتماعی اداروں کو سرمائے کی ایک کثیر مقدار ہمیشہ مفت ملتی رہے گی جس کا سود یا منافع تو درکنار اصل ادا کرنے کے لئے بھی عوام الناس پر ٹیکس کا کوئی بار نہ پڑے گا اور اگر وہ مزید آمدنی کے خواہشمند ہوں تو ان کے لئے اس چیز کے حصول کا صرف ایک راستہ کھلا ہوگا یعنی بچائی ہوئی رقموں کو مضاربت (یعنی نفع اور نقصان میں متناسب شرکت) کے اصول پر نفع بخش کاموں میں لگائیں، خواہ براہ راست خود، یا حکومت کی توسط سے، یا بینکوں کے توسط سے۔

خود لگانا چاہینگے تو ان کو کسی کاروبار میں شرکت کی شرائط آپ طے کرنی ہونگی جن میں ازروئے قانون اس امر کا تعین ضروری ہوگا کہ فریقین کے درمیان نفع اور نقصان کی تقسیم کس تناسب سے ہوگی۔ علی ہذا القیاس مشترک سرمائے کی کمپنیوں میں بھی شرکت کی صورت [illegible] بس ایک [illegible] ہوگی کہ سیدھے سادے حصے خرید لئے جائیں۔ بانڈ اور ڈیبنچر اور اسی طرح کی دوسری چیزیں، جن کے خریدار کو کمپنی سے ایک لگی بندھی آمدنی ملتی ہے، سرے سے موجود ہی نہ ہوں گی۔

حکومت کے توسط سے لگانا چاہیں گے تو انہیں امور نافعہ سے متعلق حکومت کی کسی اسکیم میں حصہ دار بننا ہوگا۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ حکومت برق آبی کی کوئی تجویز عمل میں لانا چاہتی ہے وہ اس کا اعلان کر کے پبلک کو اس میں شرکت کی دعوت دیگی۔ جو اشخاص یا ادارے یا بینک اس میں سرمایہ دیں گے وہ حکومت کے ساتھ اس میں حصہ دار بن جائینگے اور اس کے کاروباری منافع میں سے ایک طے شدہ تناسب کے مطابق حصہ پاتے رہینگے۔ نقصان ہوگا تو اس کا بھی متناسب حصہ ان سب پر اور حکومت پر تقسیم ہو جائیگا۔ اور حکومت اس امر کی بھی حق دار ہوگی کہ ایک ترتیب کے ساتھ بتدریج لوگوں کے

حصے خود خریدتی چلی جائے یہاں تک کہ چالیس پچاس سال میں برق آبی کا وہ پورا کام خالص سرکاری ملک بن جائے۔

مگر موجودہ نظام میں بھی سب سے زیادہ قابل عمل اور مفید تیسری صورت ہی ہوگی یعنی یہ کہ لوگ بینکوں کے توسط سے اپنا سرمایہ نفع بخش کاموں میں لگائیں اسلئے ہم اس کو ذرا زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ لوگوں کے سامنے اس امر کی صاف تصویر آجائے کہ سود کو ساقط کرنے کے بعد بینکنگ کا کاروبار کس طرح چل سکتا ہے اور نفع کے طالب لوگ اس سے کس طرح متمتع ہوسکتے ہیں۔

بینکنگ کی اسلامی صورت بینکنگ کے متعلق اس سے پہلے ہم نے جو بحث کی ہے اس کا یہ مطلب نہ تھا اور نہ ہوسکتا ہے کہ یہ کام سرے سے ہی غلط اور ناجائز ہے۔ دراصل بینکنگ بھی موجودہ تہذیب کی پرورش کی ہوئی بہت سی چیزوں کی طرح ایک ایسی اہم اور مفید چیز ہے جس کو صرف ایک شیطانی عنصر کی شمولیت نے گندہ کر رکھا ہے اول تو وہ بہت سی ایسی جائز خدمات انجام دیتا ہے جو موجودہ زمانے کی تمدنی زندگی اور کاروباری ضروریات کے لئے مفید بھی ہیں اور ناگزیر بھی۔ مثلاً رقموں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنا اور ادائیگی کا انتظام کرنا، بیرونی ممالک سے لین دین کی سہولتیں بہم پہنچانا، قیمتی اشیاء کی حفاظت کرنا، اعتماد نامے (Letters of Credit) سفری چک اور گشتی نوٹ جاری کرنا، کمپنیوں کے حصوں کی فروخت کا انتظام کرنا۔ اور بہت سی وکیلانہ خدمات (Agency services) جنہیں تھوڑا سا کمیشن پر بینک کے سپرد کرکے آج ایک مصروف آدمی بہت سے جھنجھٹوں سے خلاصی پا لیتا ہے۔ یہ وہ کام ہیں جنہیں بہرحال جاری رہنا چاہیئے۔ اور ان کیلئے ایک مستقل ادارے کا ہونا ضروری ہے۔ پھر یہ بات بھی بجائے خود تجارت، صنعت، زراعت اور ہر شعبہ تمدن و معیشت کے لئے نہایت مفید اور آج کے حالات کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے کہ معاشرے کا فاضل سرمایہ بکھرا ہوا رہنے کے بجائے ایک مرکزی ذخیرے (Reservoir) میں مجتمع ہو اور وہاں سے وہ زندگی کے ہر شعبہ کو آسانی کے ساتھ ہر وقت ہر جگہ بہم پہنچ سکے۔ اور اس کے ساتھ عام افراد کے لئے

بھی اس میں بڑھتی ؟ لگ الگ بطور خود ڈھونڈتے پھرنے کے بجائے سب اس کو ایک مرکزی ذخیرے میں جمع کرا دیا کریں اور وہاں ایک قابل اطمینان طریقے سے اجتماعی طور پر ان سب کے سرمائے کو کام پر لگانے اور حاصل شدہ منافع کو ان پر تقسیم کرنے کا انتظام ہوتا رہے ان سب پر مزید یہ کہ مستقل طور پر مالیات (Finance) ہی کا کام کرتے رہنے کی وجہ سے بینک کے منتظمین اور کارکنوں کو اس شعبۂ فن میں ایک ایسی مہارت اور بصیرت حاصل ہو جاتی ہے جو تاجروں، صناعوں اور دوسرے معاشی کارکنوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ یہ ماہرانہ بصیرت بجائے خود ایک نہایت قیمتی چیز ہے اور بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ یہ محض ساہوکار کی خود غرضی کا ہتھیار بن کر نہ رہے بلکہ کاروباری لوگوں کے ساتھ تعاون میں استعمال ہو۔ لیکن بینکنگ کی ان ساری خوبیوں اور منفعتوں کو جس چیز نے الٹ کر پورے تمدن کے لئے برائیوں اور مضرتوں سے بدل دیا ہے وہ سود ہے، اور اس کے ساتھ دوسری بنائے فساد یہ بھی شامل ہو گئی ہے کہ سود کی کشش سے جو سرمایہ کھنچ کھنچ کر بینکوں میں مرتکز ہوتا ہے وہ عملاً چند خود غرض سرمایہ داروں کی دولت بن کر رہ جاتا ہے جسے وہ نہایت دشمنِ اجتماع طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ ان دو خرابیوں کو اگر دور کر دیا جائے تو بینکنگ ایک پاکیزہ کام بھی ہو جائیگا، تمدن کے لئے بھی موجودہ حالت کی نسبت بدرجہا زیادہ نافع ہوگا، اور عجب نہیں کہ خود ساہوکاروں کے لئے بھی سود خواری کی بہ نسبت یہ دوسرا پاکیزہ طریق کار مالی حیثیت سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوگا۔

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ انسدادِ سود کے بعد بینکوں میں سرمایہ اکٹھا ہونا ہی بند ہو جائیگا۔ وہ غلطی پر ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب سود ملنے کی توقع ہی نہ ہوگی تو لوگ کیوں اپنی فاضل آمدنیاں بینک میں رکھوائیںگے۔ حالانکہ اُس وقت سود کی نہ سہی، نفع ملنے کی توقع تو ضرور ہوگی، اور چونکہ نفع کا امکان غیر متعین اور غیر محدود ہوگا اس لئے عام شرح سود کی بہ نسبت کم نفع حاصل ہونے کا جس قدر امکان ہوگا اُسی قدر زیادہ اچھا خاصا زیادہ نفع ملنے کا امکان بھی ہوگا۔ اس کے ساتھ بینک وہ تمام خدمات بدستور انجام دیتے رہیں گے جن کی خاطر اب لوگ بینکوں کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ بالکل ایک یقینی بات ہے کہ جس مقدار میں اب سرمایہ بینکوں کے پاس آتا ہے اسی مقدار میں انسدادِ سود کے بعد بھی آتا رہیگا، بلکہ اُس

وقت چونکہ ہر طرح کے کاروبار کو زیادہ فروغ حاصل ہوگا، روزگار بڑھ جائے گا، اور آمدنیاں بھی بڑھ جائیں گی، اس لئے موجودہ حالت کی بہ نسبت کہیں بڑھ چڑھ کر فاضل آمدنیاں بینکوں میں جمع ہوں گی اس جمع شدہ سرمایہ کا جس قدر حصہ چالو کھاتے یا عندالطلب کھاتے میں ہوگا اس کو تو بینک کسی نفع بخش کام میں نہ لگا سکیں گے، جس طرح اب بھی نہیں لگا سکتے ہیں، اس لئے وہ زیادہ تر دو بڑے کاموں میں استعمال ہوگا۔ ایک روزمرہ کا لین دین۔ دوسرے کاروباری لوگوں کو قلیل المدت قرضے بلا سود دینا، اور ہنڈیاں بلاسود بھنانا۔ رہا وہ سرمایہ جو لمبی مدت کے لئے بینکوں میں رکھا جائیگا تو اسے وہ سودی قرض پر چلانے کے بجائے بڑی اچھی طرح مضاربت کے اصول پر تجارتی کاروبار میں، صنعتی اسکیموں میں، زراعتی کاموں میں، اور پبلک اداروں اور حکومتوں کے نفع آور کاموں میں لگا سکیں گے، اور اس سے بحیثیت مجموعی دو عظیم الشان فائدے ہوں گے۔ ایک یہ کہ ساہوکار کا مفاد کاروبار کے مفاد کے ساتھ متحد ہوجائیگا اس لئے کاروبار کی ضرورت کے مطابق سرمایہ اس کی پشتیبانی کرتا رہیگا اور وہ اسباب قریب قریب ختم ہوجائینگے جن کی بناء پر موجودہ سودخوار دنیا میں کساد بازاری کے دورے پڑا کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ساہوکار کی مالیاتی بصیرت اور کاروباری لوگوں کی تجارتی و صنعتی بصیرت جو آج باہم نبرد آزمائی کرتی رہتی ہیں اُس وقت ایک دوسرے کے ساتھ دستیاری اور تعاون کریں گی اور یہ سب ہی کے لئے مفید ہوگا۔ پھر جو منافع اِن ذرائع سے بینکوں کو حاصل ہوں گے اُن کو وہ اپنے انتظامی مصارف نکالنے کے بعد ایک مقرر تناسب کے مطابق اپنے حصہ داروں اور کھاتہ داروں میں تقسیم کردیں گے۔ اس معاملہ میں فرق صرف یہ ہوگا کہ بحالت موجودہ منافع (Dividends) حصہ داروں میں تقسیم ہوتے ہیں اور کھاتہ داروں کو سود دے دیا جاتا ہے۔ اُس وقت دونوں میں منافع ہی تقسیم ہونگے اب کھاتہ داروں کو ایک متعین شرح کے مطابق سود ملا کرتا ہے۔ اس وقت شرح کا تعین نہ ہوگا بلکہ جتنے بھی منافع ہوں گے، خواہ کم ہوں یا زیادہ، وہ سب ایک تناسب کے ساتھ تقسیم ہوجائینگے۔ نقصان اور دیوالیہ کا جتنا خطرہ اب ہے اُتنا ہی اس وقت بھی ہوگا۔ اب خطرہ اور اس کے بالمقابل غیر محدود نفع کا امکان، دونوں صرف بینک کے حصہ داروں کے لئے مخصوص ہیں۔ اُس وقت یہ

دونوں چیزیں کھاتہ داروں اور حصّہ داروں میں مشترک ہو جائیں گی۔

رہ گیا بینکنگ کا یہ نقصان کہ نفع کی کشش سے جو سرمایہ اُن کے پاس اکٹھا ہوتا ہے اس کی مجتمع طاقت پر عملاً صرف چند ساہوکار قابض و متصرف ہوتے ہیں تو اس کے تدارک کے لئے ہم کو یہ کرنا ہوگا کہ مرکزی ساہوکاری (Central Banking) کا سارا کام بیت المال یا اسٹیٹ بینک خود اپنے ہاتھ میں رکھے اور قوانین کے ذریعہ سے تمام پرائیویٹ بینکوں پر حکومت کا اقتدار اور دخل وضبط اس حد تک قائم کر دیا جائے کہ ساہوکار اپنی مالیات طاقت کا بیجا استعمال نہ کر سکیں۔

غیر سودی مالیات کا یہ مجمل نقشہ جو ہم نے پیش کیا ہے کیا اسے دیکھنے کے بعد بھی اس شبہ کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ سود کا انسداد قابلِ عمل نہیں ہے؟

سود کے مباحث میں ایک ترمیم

ربا الفضل کی حقیقت اور اس کے احکام

اپنی تالیف "سود" میں جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "سود کے متعلقات" کے زیر عنوان ربا الفضل کے متعلق جو بحث سپرد قلم فرمائی تھی، اس پر موصوف نے نظر بندی کے زمانے میں دوبارہ نگاہ ڈالی تو اس میں ترمیم کرنا ضروری معلوم ہوا۔ دراصل مولانا موصوف ملتان جیل میں احادیث کا تحقیقی مطالعہ فرما رہے تھے، اس مطالعہ کے دوران میں ربا الفضل کے بارے میں ان کے سامنے کچھ ایسی تصریحات آئیں کہ مولانا کو اپنی سابق رائے سے رجوع کرنا پڑا۔ چنانچہ اس موضوع پر جو بحث "سود" میں درج تھی اسے (صفحہ ۱۴۱ تا صفحہ ۱۵۰) آپ نے بالکل بدل دیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا باب کو ترمیم شدہ شکل میں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ربٰو دراصل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو راس المال سے فائدہ اٹھانے کے لئے مہلت دے کر محض وقت کے معاوضہ میں وصول کی جاتی ہے۔ اصطلاح شرع میں اس کو ربا النسیئہ کہا جاتا ہے یعنی وہ ربٰو جو قرض کے معاملہ میں لیا اور دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اسی کو حرام کیا گیا ہے، اس کی حرمت پر تمام امت کا اتفاق ہے اور اس میں کبھی کسی شک و شبہ نے راہ نہیں پائی ہے۔

لیکن شریعت اسلامی کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جس چیز کو حرام کیا جاتا ہے، اس کی طرف جانے کے جتنے راستے ممکن ہیں ان سب کو بند کر دیا جاتا ہے، بلکہ اس کی طرف پیش قدمی کی ابتدا جس مقام سے ہوتی ہے وہیں روک لگا دی جاتی ہے تاکہ انسان اس کے قریب بھی نہ جانے پائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قاعدے کو ایک لطیف مثال میں بیان فرمایا ہے۔ عرب کی اصطلاح میں حمیٰ اس چراگاہ کو کہتے ہیں جو کسی شخص نے اپنے جانوروں کے لئے مخصوص کر لی ہو اور جس میں دوسروں کے لئے اپنے جانور چرانا ممنوع ہو۔ حضور فرماتے ہیں کہ ہر بادشاہ کی ایک حمیٰ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمیٰ اس کے وہ حدود ہیں جن سے باہر

قدم نکالنے کو اس نے حرام قرار دیا ہے۔ جو جانور حمیٰ کے اردگرد چرتا پھرتا ہے، بعید نہیں کہ کسی وقت چرتے چرتے وہ حمیٰ کے حدود میں بھی داخل ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کی حمیٰ یعنی ان حدود کے اطراف میں چکر لگاتا رہتا ہے اس کے لئے ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ کب اس کا پاؤں پھسل جائے اور وہ حرام میں مبتلا ہو جائے۔ لہٰذا جو امور حلال و حرام کے درمیان واسطہ ہیں ان سے بھی پرہیز لازم ہے تاکہ تمہارا دین محفوظ رہے۔"

یہی مصلحت ہے جس کو مدنظر رکھ کر شارع حکیم نے ہر ممنوع چیز کے اطراف میں حرمت اور کراہیت کی ایک مضبوط باڑھ لگا دی ہے، اور ان ممنوعات کے ذرائع پر بھی ان کے قرب و بعد کے لحاظ سے مختلف پابندیاں عاید کردی ہیں۔

سود کے مسئلہ میں بھی ابتدائی حکم صرف یہ تھا کہ قرض کے معاملات میں جو سودی لین دین ہوتا ہے وہ قطعاً حرام ہے۔ چنانچہ اسامہ بن زید سے جو حدیث مروی ہے اس میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ انما الربا فی النسیئة (وفی بعض الالفاظ لا ربا الا فی النسیئة) یعنی سود صرف قرض کے معاملات میں[۱] ہے۔ لیکن بعد میں آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کی اس حمیٰ کے اردگرد بندشیں لگانا ضروری سمجھا، تاکہ لوگ اس کے قریب بھی نہ پھٹک سکیں۔ اسی قبیل سے وہ فرمان نبوی ہے جس میں سود کھانے اور کھلانے کے ساتھ سود کی دستاویز لکھنے اور اس پر گواہی دینے کو بھی حرام کیا گیا ہے۔ اور اسی قبیل سے وہ احادیث ہیں جن میں ربوا الفضل کی تحریم کا حکم دیا گیا ہے۔

ربوا الفضل کا مفہوم: ربوا الفضل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دیا، کیونکہ اس سے زیادہ ستانی کا دروازہ کھلتا ہے

---

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس نے ابتداءً اسی حدیث کی بنا پر فتویٰ دیا تھا کہ سود صرف قرض کے معاملات میں ہے نقد میں نہیں ہے۔ لیکن جب بعد میں ان کو متواتر روایات سے معلوم ہوا کہ حضورؐ نے نقد معاملات میں بھی تفاضل کو منع فرمایا ہے تو انھوں نے اپنے پہلے قول سے رجوع کر لیا چنانچہ حضرت جابر کی روایت ہے کہ رجع ابن عباس عن قوله فی الصرف وعن قوله فی المتعة۔ اسی طرح حاکم نے حیان العدوی کے طریق سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے بعد میں اپنے سابق فتوے پر توبہ و استغفار کی اور نہایت سختی کے ساتھ ربوا الفضل سے منع کرنے لگے۔

اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جس کا آخری ثمرہ سود خواری ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے خود ہی اس مصلحت کو اس حدیث میں بیان فرما دیا ہے جس کو ابو سعید خدری نے بدیں الفاظ نقل کیا ہے۔ کہ لا تبیعوا الدرھم بدرھمین فانی اخاف علیکم الرماء والرماء ھو الربا یعنی ایک درہم کو دو درہموں کے عوض نہ فروخت کرو کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم سود خواری میں نہ مبتلا ہو جاؤ۔

ربا الفضل کے احکام: سود کی اس قسم کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام منقول ہیں ان کو یہاں لفظ بلفظ نقل کیا جاتا ہے۔

عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواء يداً بيد فاذا اختلفت هذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم اذا كان يداً بيد (احمد ومسلم والنسائي وابن ماجه وابي داؤد نحوه وفي آخره) وامرنا ان نبيع البر بالشعير والشعير بالبر يداً بيد كيف شئنا

عبادہؓ بن صامت سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سونے کا مبادلہ سونے سے اور چاندی کا چاندی سے اور گیہوں کا گیہوں سے اور جَو کا جَو سے اور کھجور کا کھجور سے اور نمک کا نمک سے اس طرح ہونا چاہیے کہ جیسے کا تیسا اور برابر سرابر اور دست بدست ہو۔ البتہ اگر مختلف اصناف کی چیزوں کا ایک دوسرے سے مبادلہ ہو تو پھر جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو جائے۔ (مسند احمد و صحیح مسلم۔ یہی حدیث نسائی اور ابن ماجہ اور ابوداؤد میں بھی آئی ہے اور اس کے آخر میں اتنا اضافہ اور ہے۔) اور آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم گیہوں کا مبادلہ جو سے اور جو کا گیہوں سے دست بدست جس طرح چاہیں کریں۔

عن ابي سعيد الخدري قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل يداً بيد فمن زاد

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سونے کا مبادلہ سونے سے چاندی کا چاندی سے گیہوں کا گیہوں سے، جو کا جو سے، کھجور کا کھجور سے، نمک کا نمک سے جیسے کا تیسا اور دست بدست ہونا

استزاد فقد اربیٰ الآخذ والمعطی فیہ سواء (البخاری واحمد ومسلم واللفظ) لا تبیعوا الذھب بالذھب ولا الورق بالورق الا وزناً بوزن مثلاً بمثل سواء بسواء (احمد ومسلم)

چاہیے جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا اس نے سودی معاملہ کیا لینے والا اور دینے والا دونوں گناہ میں برابر ہیں (بخاری، احمد، مسلم)۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے، سونے کو سونے کے عوض اور چاندی کو چاندی کے عوض فروخت نہ کرو مگر وزن میں مساوی یعنی کانٹوں اور برابر برابر (احمد و مسلم)

وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تبیعوا الذھب بالذھب الا مثلاً بمثل ولا تشفوا بعضھا علی بعض ولا تبیعوا الورق بالورق الا مثلاً بمثل ولا تشفوا بعضھا علی بعض ولا تبیعوا منھا غائباً بنا جز (البخاری ومسلم)

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سونے کو سونے کے عوض نہ بیچو مگر جوں کا توں۔ کوئی کسی کو زیادہ نہ دے۔ اور چاندی کو چاندی کے عوض نہ بیچو مگر جوں کا توں کوئی کسی کو زیادہ نہ دے۔ اور نہ غائب کا تبادلہ حاضر سے کرو۔ (بخاری و مسلم)

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال التمر بالتمر والحنطۃ بالحنطۃ والشعیر بالشعیر والملح بالملح مثلاً بمثل یداً بید فمن زاد او استزاد فقد اربیٰ الا ما اختلفت الوانہ (مسلم)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کھجوروں کا مبادلہ کھجور سے، گیہوں کا گیہوں سے جو کا جو سے اور نمک کا نمک سے جوں کا توں اور دست بدست ہونا چاہیے جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا اس نے سودی معاملہ کیا، سوائے اس صورت کے جبکہ ان اشیا کے رنگ مختلف ہوں

عن سعد بن ابی وقاص قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن شراء التمر بالرطب فقال اینقص الرطب اذا یبس فقال نعم فنھاہ عن ذالک (مالک والترمذی و

سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اور میں سن رہا تھا کہ خشک کھجور کا تر کھجور کے ساتھ مبادلہ کس طریقہ پر کیا جائے۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا تر کھجور سوکھنے کے بعد کم ہو جاتی ہے؟ سائل نے عرض کیا

(ابو داؤد والنسائی وابن ماجه)

ہاں تب آپ نے سرے سے اس مبادلہ ہی کو منع فرما دیا

(مالک، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

عن ابی سعید قال کنا نرزق تمر الجمع وهو الخلط من التمر وکنا نبیع صاعین بصاع فقال النبی صلی الله علیه وسلم لا صاعین بصاع ولا درهمین بدرهم (البخاری)

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو بالعموم اجرتوں اور تنخواہوں میں مخلوط قسم کی کھجوریں ملا کرتی تھیں اور ہم دو صاع مخلوط کھجوریں دے کر ایک صاع اچھی قسم کی کھجوریں لے لیا کرتے تھے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ دو صاع کا مبادلہ ایک صاع سے کرو اور نہ دو درہم کا ایک درہم سے

عن ابی سعید وابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم استعمل رجلاً علی خیبر فجاءه بتمر جنیب فقال اکلّ تمر خیبر هکذا؟ قال لا والله یا رسول الله انا لنأخذ الصاع من هذا بالصاعین والصاعین بالثلاث فقال لا تفعل بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنیباً وقال فی المیزان مثل ذلک (البخاری ومسلم)

ابوسعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا تحصیلدار مقرر کر کے بھیجا۔ وہ وہاں سے (مالگزاری میں) عمدہ قسم کی کھجوریں لے کر آیا۔ آں حضرت نے پوچھا کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ اس نے کہا، نہیں یا رسول اللہ، ہم جو ملی جلی کھجوریں وصول کرتے ہیں انہیں کبھی ۲ صاع کے بدلے ایک صاع کے حساب سے، کبھی ۳ صاع کے بدلے ۲ صاع کے حساب سے ان اچھی کھجوروں سے بدل لیا کرتے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا ایسا نہ کیا کرو، پہلے ان مخلوط کھجوروں کو درہموں کے عوض فروخت کر دو پھر اچھی قسم کی کھجوریں درہموں کے عوض خرید لو۔ یہی بات آپ نے وزن کے حساب سے مبادلہ کرنے کی صورت میں بھی ارشاد فرمائی (بخاری، مسلم)

عن ابی سعید قال جاء بلال الی النبی

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بلال نبی صلی اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم بتمر برنی فقال له
النبی صلی اللہ علیہ وسلم من این ھذا
قال کان عندنا تمر ردیّ فبعت منه
صاعین بصاع فقال اوّہ عین الربا عین الربا
لا تفعل ولکن اذا اردت ان تشتری
فبع التمر ببیع آخر ثم اشتریه

(البخاری ومسلم)

عن فضالة بن عبید قال اشتریت
قلادة یوم خیبر باثنی عشر دینارا فیها
ذھب وخرز ففصلتها فوجدت فیها
اکثر من اثنی عشر دینارا فذکرت
ذالک للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال
لا یباع حتی یفصّل (مسلم، نسائی، ابو
داؤد، ترمذی)

عن ابی بکرة قال نھی النبی صلی
اللہ علیہ وسلم عن الفضة بالفضة
والذھب بالذھب الا سواء بسواء
وامرنا ان نشتری الفضة کیف شئنا

(البخاری ومسلم)

علیہ وسلم کی خدمت میں برنی کھجوریں لے کر آئے (جو کھجور
کی ایک بہترین قسم ہوتی ہے)۔ آپ نے پوچھا یہ کہاں سے
لے آئے ہو؟ انھوں نے عرض کیا ہمارے پاس گھٹیا قسم
کی کھجوریں تھیں میں نے وہ دو صاع دے کر یہ ایک صاع خرید
لی۔ فرمایا ہائیں! قطعی سود! قطعی سود! ایسا ہرگز نہ کیا کرو
جب تمہیں اچھی کھجوریں خریدنی ہوں تو اپنی کھجوریں درہم یا کسی
اور چیز کے عوض بیچ دو پھر اس قیمت سے اچھی کھجوریں خرید لو

فضالہ بن عبید کہتے ہیں کہ میں نے جنگ خیبر کے
موقع پر ایک سونے کا جڑاؤ ہار ۱۲ دینار میں خریدا پھر جو
میں نے اس ہار کو توڑ کر نگ اور سونا الگ الگ کیا تو
اس کے اندر ۱۲ دینار سے زیادہ کا سونا نکلا۔ میں نے اسکا
ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپ نے فرمایا آئندہ سے کبھی
کا جڑاؤ زیور سونے کے عوض نہ بیچا جائے جب تک کہ نگ
سونے کو نگ الگ الگ نہ کر دیا جائے۔ (مسلم، نسائی، ابو داؤد، ترمذی)

ابوبکرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ
چاندی کا چاندی سے اور سونے کا سونے سے مبادلہ
نہ کیا جائے مگر برابری کے ساتھ۔ نیز آپ نے فرمایا کہ چاندی
کو سونے سے اور سونے کو چاندی سے جس طرح چاہو بدل
سکتے ہو (بخاری و مسلم)

؎ یہ خیال رہے کہ اس زمانے میں درہم و دینار خالص چاندی اور سونے کے ہوتے تھے۔ ان کی قیمت ان کی چاندی اور سونے کی
وزن کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ لہذا اس زمانے میں دینار کے عوض سونا اور درہم کے عوض چاندی خریدنا بالکل یہی معنی رکھتا تھا کہ آدمی نے
سونے کے عوض سونا خریدا اور چاندی کے عوض چاندی حاصل کی۔

احکام بالا کا ماحصل (۱) یہ ظاہر ہے کہ ایک ہی جنس کی دو چیزوں کو بدلنے کی ضرورت صرف انہی صورتوں میں پیش آتی ہے جب کہ اتحادِ جنس کے باوجود ان کی نوعیتیں مختلف ہوں مثلاً چاول، اور گیہوں کی ایک قسم اور دوسری قسم، عمدہ سونا اور گھٹیا سونا، یا معدنی نمک اور سمندری نمک وغیرہ۔ ان مختلف اقسام کی ہم جنس چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بدلنا، اگرچہ بازار کے نرخ ہی کو ملحوظ رکھ کر ہو، بہرحال ان میں کمی بیشی کے ساتھ مبادلہ کرنے سے اس ذہنیت کے پرورش پانے کا اندیشہ ہے جو بالآخر سود خواری اور ناجائز نفع اندوزی تک جا پہنچتی ہے اس لئے شریعت نے قاعدہ مقرر کر دیا کہ ہم جنس اشیاء کے مبادلہ کی اگر ضرورت پیش آئے تو لازماً حسب ذیل دو شکلوں میں سے ہی کوئی ایک شکل اختیار کرنی ہوگی: ایک یہ کہ ان کے درمیان قدر و قیمت کا جو تھوڑا سا فرق ہو اُسے نظر انداز کر کے برابر سرابر مبادلہ کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ چیز کا چیز سے براہِ راست مبادلہ کرنے کے بجائے ایک شخص اپنی چیز روپے کے عوض بازار کے بھاؤ بیچ دے اور دوسرے شخص سے اس کی چیز روپے کے عوض بازار کے بھاؤ خرید لے۔

(۲) جیسا کہ ابھی ہم بیان کر چکے ہیں، قدیم زمانے میں تمام سکے خالص چاندی سونے کے ہوتے تھے اور ان کی قیمت دراصل ان کی چاندی اور ان کے سونے کی قیمت ہوتی تھی۔ اس زمانے میں درہم کو درہم سے اور دینار کو دینار سے بدلنے کی ضرورت ایسے مواقع پر پیش آتی تھی جبکہ مثلاً کسی شخص کو عراقی درہم کے عوض رومی درہم درکار ہوتے یا رومی دینار کے بدلے ایرانی دینار کی حاجت ہوتی۔ ایسی ضرورتوں کے موقع پر یہودی ساہوکار اور دوسرے ناجائز نفع کمانے والے لوگ کچھ اسی طرح کا ناجائز منافع وصول کرتے تھے جیسا موجودہ زمانے میں بیرونی سکوں کے مبادلہ پر بٹاون لی جاتی ہے یا اندرونِ ملک میں روپیہ کی ریزگاری مانگنے والوں، یا دس اور پانچ روپے کے نوٹ تُڑانے والوں سے کچھ پیسے یا آنے وصول کیے جاتے ہیں۔ یہ چیز بھی چونکہ سود خوارانہ ذہنیت ہی کی طرف لے جانے والی ہے اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ نہ تو چاندی کا تبادلہ چاندی سے اور سونے کا تبادلہ سونے سے کمی بیشی کے ساتھ کرنا جائز ہے اور نہ ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنا درست ہے۔

(۳) ہم جنس اشیاء کے درمیان مبادلہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شخص کے پاس ایک چیز خام شکل میں ہو اور دوسرے کے پاس اسی جنس سے بنی ہوئی کوئی شے ہو، اور دونوں آپس میں ان کا مبادلہ کرنا

چاہیں۔ اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ آیا صنعت نے اس شے کی ماہیت بالکل ہی تبدیل کر دی ہے یا اس کے اندر صنعت کے تصرف کے باوجود ابتدائی خام صورت کی بہ نسبت کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ پہلی صورت میں تو کمی بیشی کے ساتھ مبادلہ ہو سکتا ہے لیکن دوسری صورت میں شریعت کا منشا یہ ہے کہ یا تو سرے سے مبادلہ ہی نہ ہو یا اگر ہو تو برابری کے ساتھ ہو تاکہ زیادہ ستانی کے مرض کو غذا نہ مل سکے۔ مثال کے طور پر ایک تو وہ عظیم الشان تغیرات ہیں جو روئی سے کپڑا اور لوہے سے انجن بننے کی صورت میں رونما ہوتے ہیں اور دوسرے وہ خفیف تغیرات ہیں جو سونے سے ایک چوڑی یا ایک کنگن بنائے جانے کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلی صورت میں تو کوئی مضائقہ نہیں اگر ہم زیادہ مقدار میں روئی دے کر کم مقدار میں کپڑا اور بہت سے وزن کا خام لوہا دے کر تھوڑے سے وزن کا ایک انجن خرید لیں۔ لیکن دوسری صورت میں یا تو سونے کے کنگن کا تبادلہ ہم وزن سونے ہی سے کرنا ہوگا[1]، یا پھر سونے کو بازار میں بیچ کر اس کی قیمت سے کنگن خریدنے پڑیں گے۔

ہم مختلف اجناس کی چیزوں کا باہم مبادلہ کمی بیشی کے ساتھ ہو سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ معاملہ دست بدست ہو جائے۔ اس شرط کی وجہ یہ ہے کہ دست بدست جو لین دین ہوگا وہ تو لامحالہ بازار کے نرخوں ہی پر ہوگا مثلاً جو شخص چاندی دے کر سونا لے گا، وہ نقد سودے کی صورت میں سونے کے بالمقابل اتنی ہی چاندی دے گا جتنی اسے بازار کے بھاؤ کے لحاظ سے دینی چاہیے۔ لیکن قرض کی صورت میں کمی بیشی کا معاملہ اس اندیشہ سے خالی نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر سود کا غبار شامل ہو جائے۔ مثال کے طور پر جو شخص آج ۸۰ تولہ چاندی دے کر یہ طے کرتا ہے کہ ایک مہینہ بعد ۸۰ تولہ چاندی کے بجائے ۲ تولہ سونا لے گا۔ اس کے پاس درحقیقت یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ایک مہینہ بعد ۴۰ تولہ چاندی ایک تولہ سونے کے برابر ہوگی۔ لہٰذا اس نے چاندی

---

[1] یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اس طرح تو پھر سنار کا سارا کاروبار بند ہو جائے گا کیونکہ اسے سونے کی بنی ہوئی چیزیں ہم وزن سونے کے عوض فروخت کرنی ہوں گی اور وہ اپنی صنعت کی کوئی اجرت نہ لے سکے گا۔ یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ سنار سے دراصل ہم مبادلہ کا معاملہ نہیں کرتے ہیں بلکہ اس سے اپنے سونے کی کوئی چیز بنواتے ہیں لہٰذا وہ اس طرح اپنی اجرت لینے کا حق دار ہے جس طرح ایک درزی یا ایک نانبائی۔ البتہ اگر ہم کسی زیور فروش سے بنا ہوا کوئی زیور خریدیں تو یقیناً اسے قیمت میں زیادہ سونا دینا جائز نہ ہوگا بلکہ ہمیں اس کا چاندی یا کاغذ کے سکے ہی میں قیمت دینی ہوگی۔

اور سونے کے درمیان مبادلے کی اس نسبت کا جو پیشگی تعین کر لیا یہ بہرحال ایک طرح کی سود خورانہ اور قمار بازانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے، اور قرض لینے والے نے جو اسے قبول کیا تو اس نے بھی گویا جوا کھیلا کہ شاید ایک مہینہ بعد سونے اور چاندی کی باہمی نسبت ۴۰ = ۱ کے بجائے ۵۰ = ۱ ہو۔ اسی بنا پر شارع نے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ مختلف اجناس کا مبادلہ کمی بیشی کے ساتھ کرنا ہو تو وہ صرف دست بدست ہی ہو سکتا ہے۔ رہا قرض تو وہ لازماً دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر ہونا چاہیے۔ یا تو جو چیز جتنی مقدار میں قرض دی گئی ہے وہی چیز اسی مقدار میں واپس قبول کی جائے یا پھر معاملہ اجناس اور اشیا کی شکل میں طے کرنے کے بجائے روپے کی شکل میں طے کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ آج زید نے بکر سے ۲۰ روپے یا ۴۰ روپے کے گیہوں قرض لئے اور ایک مہینہ بعد وہ بکر کو ۲۰ روپے یا ۴۰ روپے کے جو واپس دے گا۔ اس قانون کو ابوداؤد کی اس روایت میں بالکل واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

ولا باس ببیع الذهب بالفضة والفضة اکثرهما یدا بید واما النسیئة فلا۔ ولا باس ببیع البر بالشعیر والشعیر اکثرهما یدا بید واما النسیئة فلا	اور کوئی مضائقہ نہیں اگر سونے کو چاندی کے عوض بیچا جائے اور چاندی زیادہ ہو بشرطیکہ معاملہ دست بدست ہو جائے۔ رہا قرض تو وہ جائز نہیں ہے۔ اور کوئی مضائقہ نہیں اگر گیہوں کو جو کے عوض بیچا جائے

حضرت عمرؓ کا قول۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ احکام مجمل ہیں اور معاملات کی تمام جزئی صورتوں کی ان میں تصریح نہیں ہے۔ اس لئے بہت سے جزئیات ایسے پائے جاتے ہیں جن میں شک کیا جا سکتا ہے کہ آیا وہ ربٰو کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں۔ یہی بات ہے جس کی طرف حضرت عمرؓ نے ارشاد کیا ہے کہ:۔

ان آیة الربا من آخر ما نزل من القرآن وان النبی صلعم قبض قبل ان یبینه لنا فدعوا الربا والریبة	آیت ربٰو قرآن کی ان آیات میں سے ہے جو آخر زمانہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا قبل اس کے کہ آپ ہمارے لئے اس کے احکام پوری طرح واضح فرماتے

لہٰذا تم اس چیز کو بھی چھوڑ دو جو یقیناً سود ہے اور اس چیز کو بھی جس میں سود کا شبہ ہو۔

فقہا کے اختلافات۔ احکام کا یہ اجمال ہی ان اختلافات کا مبنیٰ ہے جو سودی اجناس کے تعین، اور ان میں تحریم کی علت، اور حکم تحریم کے اجرا میں فقہائے امت کے درمیان ہوئے ہیں۔

ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ ربٰو صرف ان چھ اجناس میں ہے جن کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا ہے یعنی سونا، چاندی، گیہوں، جَو، خرما، اور نمک، ان کے سوا دوسری تمام چیزوں میں تفاضل کے ساتھ بلا کسی قید کے لین دین ہو سکتا ہے۔ یہ مذہب قتادہ۔ اور طاؤس اور عثمان البتی، اور ابن عقیل حنبلی اور ظاہریہ کا ہے

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم تمام ان چیزوں میں جاری ہوگا جن کا لین دین وزن اور پیمانہ کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ یہ عمار اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے، اور ایک روایت کی رو سے امام احمد ابن حنبل کی بھی یہی رائے ہے۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم سونے چاندی اور کھانے کی ان چیزوں کے لئے ہے جن کا لین دین پیمانہ اور وزن کے لحاظ سے ہوتا ہے یہ سعید بن المسیّب کا مذہب ہے اور ایک ایک روایت اس باب میں امام شافعی اور امام احمد سے بھی منقول ہے۔

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم مخصوص ہے ان چیزوں کے ساتھ جو غذا کے کام آتی ہیں اور ذخیرہ کر کے رکھی جاتی ہیں یہ امام مالک کا مذہب ہے۔

درہم و دینار کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا مذہب یہ ہے کہ ان میں علت تحریم ان کا وزن ہے۔ اور شافعی و مالک اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کی رائے یہ ہے کہ قیمت اس کی علت ہے۔

مذاہب کے اس اختلاف سے جزئی معاملات میں حکم تحریم کا اجراء بھی مختلف ہو گیا ہے۔ ایک چیز ایک مذہب میں سرے سے سودی جنس ہی نہیں ہے اور دوسرے مذہب میں اس کا شمار سودی اجناس میں ہوتا ہے ایک مذہب کے نزدیک ایک شے میں علت تحریم کچھ ہے اور دوسرے مذہب کے نزدیک کچھ اور۔ اس لئے بعض معاملات ایک مذہب کے لحاظ سے سود کی زد میں آجاتے ہیں اور دوسرے مذہب کے لحاظ سے نہیں آتے لیکن یہ تمام اختلافات ان امور میں نہیں ہیں جو کتاب سنت کے صریح احکام کی رو سے "ربٰو" کے حکم میں داخل ہیں۔ بلکہ ان کا تعلق صرف مشتبہات سے ہے اور ایسے امور سے ہے جو حلال و حرام کی درمیانی سرحد پر واقع ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان اختلافی مسائل کو حجت بنا کر ان معاملات میں شریعت کے احکام کو مشتبہ ٹھہرانے کی کوشش کرے جن کے سود ہونے پر نصوص صریحہ وارد ہو چکی ہیں، اور اس طریق استدلال سے رخصتوں، و حیلوں کا دروازہ کھولے اور پھر ان دروازوں سے بھی گذر کر امت کو سرمایہ داری کے راستوں پر چلنے کی ترغیب دے وہ خواہ اپنی جگہ نیک نیت اور خیر خواہ ہی کیوں نہ ہو حقیقت میں اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جنہوں نے کتاب و سنت کو چھوڑ کر ظن و تخمین کی پیروی کی خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا

تفہیم القرآن کے متعلق اعلان

اس سے پیشتر جو اعلان تفہیم القرآن کی پہلی جلد کے متعلق کئے گئے ہیں۔ ان کے مطابق جلد تیار نہ ہو سکی۔ اس سلسلہ میں بکثرت خطوط موصول ہو رہے ہیں جن سے ظاہر ہے۔ کہ تفہیم القرآن کا کس بے صبری سے انتظار ہو رہا ہے۔ فرداً فرداً ہر خط کا جواب ناممکن ہے۔ لہٰذا ترجمان القرآن کے ذریعہ اس وقت کی صحیح کیفیت پیش کی جا رہی ہے۔ اور جس مقام پر ہم تفہیم القرآن کو لیکر پہنچے ہیں پیش خدمت ہے۔ پہلی جلد کی کتابت تقریباً ختم ہے۔ اس کا معمولی سا کام باقی ہے۔ بقیہ گراف کے بلاک بھی اس وقت تک بن سکے ہیں۔ ان پر کاپیاں جمانے کیساتھ ساتھ پروف بھی نکل رہے ہیں۔ بقیہ بلاک بھی عنقریب ملنے کی توقع ہے۔ کاغذ کی تلاش شروع ہی سے جاری ہے۔ پہلے براہ راست منگوانے کیلئے کئی قسم کی دشواریاں تھیں۔ جو ہمارے امکان سے باہر تھیں۔ کاغذ کی فرموں نے بتایا تھا کہ جولائی اگست میں اچھا کاغذ مل سکے گا جس کا انتظار ہے۔ اب چونکہ براہ راست بھی منگوانے پر لائسنس و... کی قیود نہیں رہیں۔ اس لئے براہ راست بھی منگوانے کے انتظامات مکمل ہو رہے ہیں۔ تاکہ اگر خدانخواستہ اگست میں بھی کاغذ نہ مل سکا۔ تو فوراً کو فرمائش جا چکی ہوگی۔ اور اگر مل گیا۔ تو فوراً ہی طباعت شروع ہو جائیگی۔ اور اچھا کاغذ دوسری جلد کیلئے محفوظ کر لینگے۔

اس دیری تاخیر سے ہم خود پریشان ہیں لیکن اسکے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس میں بھی حکمت ہے۔ اس دوران مزید تصحیح کا کام جاری ہے۔ اور یہ تاخیر یقیناً خیر ہی ہوگی۔

تفہیم القرآن کی پہلی جلد سورۃ فاتحہ سے سورۃ مائدہ تک ۲۲×۲۹ کے چھ سو سے زاید صفحات پر مشتمل ہو رہی ہے۔ اور اس میں ایک سے زاید نقشے ہوں گے۔ کاغذ کے موجودہ نرخوں اور لوگوں کے تقاضوں کی وجہ سے قیمت مقرر کر دی گئی ہے۔

قیمت قسم اول -/۱۲ قسم دوم -/۹ قسم سوم -/۱۵ اپنی فرمائش میں وضاحت سے تحریر فرمائیں۔ کہ کونسی قسم آپکے لئے محفوظ کی جائے۔ علاوہ ازیں کسی بھی قسم کیلئے فرمائش کے ہمراہ عدد پیشگی فی جلد کے حساب سے روانہ فرمائیے۔ بقیہ قیمت روانگی پر وصول کی جائے گی۔ ہندوستان کی فرمائش اور پیشگی مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور۔ یو۔پی اور پاکستان کیلئے براہ راست فرمائش اور پیشگی ہمارے پتہ۔ شیخ محمد قمرالدین پبلشر گوجر گلی موچی دروازہ لاہور کے پتہ پر روانہ کریں۔

دونوں جگہ پیشگی جس ترتیب سے وصول ہوگا اسی ترتیب سے فرمائشوں کی تعمیل ہوگی کاغذ اگست میں مل گیا تو انشاءاللہ اکتوبر یا دسمبر میں یقینی ہوگی

نیاز مند قمرالدین

سُنت و بدعت کی کشمکش

یہ وہ تقریر ہے ۔ جو محترم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان نے ۳ جولائی سنہ ۵۵ء کو باغ بیرون دہلی دروازہ لاہور کے جلسۂ عام میں جو جماعت اسلامی شہر لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا ۔ پیش فرمائی ۔ ۲۶ ماہ کی نظربندی کے بعد پبلک سے موصوف کا یہ پہلا خطاب عام تھا ۔ راقم الحروف نے تقریر کے جو نوٹ لیے تھے ۔ ان کو بطور خود مرتب کر کے اشاعت کے لئے دیا جا رہا ہے مولانا موصوف اس کی نظرثانی کرنے سے پہلے ہی دورے پر تشریف لے گئے ۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ لفظی ردوبدل پایا جائے تاہم مطالب جوں کے توں ہیں ۔ (ن ۔ ص)

بعد حمد و ثنا فرمایا ۔

حاضرین و حاضرات ! آپ سب لوگ اس بات کو جانتے ہیں ۔ اور ہر مسلمان کا یہ زندہ ایمان ہے ۔ کہ ہمارے لئے حقیقی عہد سعادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین کا عہد ہے ۔ اس عہد کی خصوصیات اور اس کی برکات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا تو یہ موقع نہیں ، کیونکہ جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے اس کا اصل موضوع یہ نہیں ہے ۔ لیکن چونکہ ہماری تمام کوششوں کا ہدف اور اصل مقصود وہی عہد ہے اس لئے سب سے پہلے میں مختصر طور پر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس عہد کی خصوصیات اور برکات کیا تھیں ۔

<u>عہد سعادت کی خصوصیات</u> اس کی اولین خصوصیت یہ تھی ۔ کہ اس عہد میں ہمارے اندر پوری پوری وحدت فکر موجود تھی اللہ تعالیٰ کی توحید ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ۔ قرآن مجید کو اپنی زندگی کا قانون تسلیم کرنا ، آخرت کی جوابدہی و مسئولیت کا یقین —— یہ وہ چیزیں تھیں جن پر تمام لوگ جو اس عہد کی مسلم سوسائٹی میں شامل تھے ، پوری طرح متحد تھے ۔ اگر کچھ فرق تھا تو اس لحاظ سے کہ ایک دیہاتی کا فہم کچھ اور تھا اور صاحب فکر کا فہم اور تھا ۔ فہم کے مدارج میں ضرور فرق تھا ۔ لیکن اس لحاظ سے کوئی فرق نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہے ۔ یا نہیں اور محمد صلعم کی ہدایت اصل ہدایت ہے یا نہیں ۔ ایسا نہیں تھا ، کہ کوئی ان باتوں کو مانتا ہو ۔ اور کوئی ان میں شک رکھتا ہو ۔

اسی طرح دنیوی زندگی کے بارے میں ہر شخص یہ سمجھتا تھا۔ کہ یہ ایک عارضی زندگی ہے جس کے بارے میں ایک دن جوابدہی کرنی ہوگی۔ اور اس زندگی کے نتائج آخرت میں ملیں گے۔ اور وہی اصلی اور حقیقی نتیجے ہیں۔

یہ وحدتِ فکر پوری مسلم سوسائٹی میں قائم تھی۔

پھر اس دورِ سعادت میں وحدتِ مقصد بھی تھی۔ پوری جماعت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ کہ اس کا مقصود اللہ کا بول بالا کرنا۔ معروف کو پھیلانا اور منکر کو مٹانا ہے۔ ایک ایک فرد جانتا تھا۔ کہ اس کے علاوہ اس کی زندگی کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہے۔ اس بارے میں بھی کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں تھا۔

پھر ان لوگوں کے اندر وحدتِ جماعت بھی تھی۔ پوری جماعت ایک صالح اقتدار کی مطیع فرمان اور ایک مرکز سے وابستہ تھی۔ کسی قسم کا انتشار اور تفرقہ نہ تھا۔ اور جماعت میں کوئی ابتری نہ تھی۔

اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی۔ کہ بہ حیثیت مجموعی اخلاقِ عامہ کا معیار بلند تھا۔ اور احترام کی بنا اخلاق پر ہی۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ جرم اور گناہ کا ارتکاب کرنے والے سرے سے تھے ہی نہیں۔ اور سب اخلاقی حیثیت سے ایک ہی بلند ترین معیار پر قائم تھے۔ بلکہ سوادِ اعظم کا اخلاق بلند تھا۔ گرے ہوئے اخلاق کے نمونے بہت ہی قلیل تعداد میں پائے جاتے تھے۔ نیز اس دور میں قیادت کی باگیں صالح ہاتھوں میں تھیں۔ اس معاملے میں عوام کی نگاہیں ان لوگوں پر جمتی تھیں۔ جو ان میں سے پاکیزہ ترین لوگ تھے۔ ملک میں جو بگڑے ہوئے لوگ پائے جاتے تھے۔ وہ گرے اور دبے ہوئے تھے۔ وہ آگے چلنے والے نہیں تھے۔ آگے صرف وہ لوگ آتے تھے۔ جو اخلاقی لحاظ سے بہترین اور پاکیزہ اخلاق رکھنے والے تھے۔

عہدِ سعادت کی برکات | اس عہدِ سعادت کی برکات میں سے اولین چیز امن و اطمینان تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ ایسی سوسائٹی جس میں صداقت، دیانت اور راستبازی اور انصاف کے اوصاف موجود ہوں۔ اس میں ہر آدمی دوسرے شخص سے معاملہ کرے گا تو پورے اطمینان سے کرے گا کہ وہ ایک ایماندار شخص سے معاملہ کر رہا ہے۔ جو امانت میں خیانت نہیں کرے گا جھوٹا قول و قرار نہیں کرے گا۔ اور بے انصافی سے کام نہیں لے گا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس طرح کی سوسائٹی میں کتنا امن اور اطمینان ہوگا۔

پھر ایک عظیم الشان برکت یہ تھی۔ کہ اس دور میں سوسائٹی کا نظام تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا

علی الاثم والعدوان کے اصول پر قائم تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی کا ہر وہ کام جو کیا جا رہا ہو، لازم ہے کہ اسے پروان چڑھانے میں سب کے سب شریک ہوں۔ لیکن اگر کوئی بدی سر اٹھائے تو کوئی اس کا ساتھ دینے کے لئے نہ اٹھے۔ بلکہ سب کے سب مل کر اس کے روکنے اور دبانے کے لئے زور لگائیں۔ اس چیز نے ایک صالح تمدن پیدا کیا جس میں بھلائیاں پروان چڑھتی تھیں، اور برائیاں دبتی تھیں۔

یہ تو تھیں اندرونی برکات۔ لیکن جب سوسائٹی اعلائے کلمۃ اللہ کے ابتدائی مراحل کو طے کر کے ملک کی اندرونی اصلاح سے فارغ ہوئی تو اٹھ کے یہ ساری دنیا کی اصلاح کے لئے نکل کھڑی ہوئی۔ آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ چند ہی سال میں وہ آدھی دنیا کے اوپر پوری طرح چھا گئی۔ اس کے کارکن اور کارفرما جہاں پہنچے انہوں نے برائیوں کو مٹایا بھلائیوں کو پروان چڑھایا۔ انصاف کی حکومت قائم کی اور اسی صالح تمدن کو نشو و نما دی جس کی برکات سے وہ خود بہرہ یاب ہو چکے تھے۔

عہد سعادت کے بعد امت کے دو گروہ

جب یہ عہد سعادت گزر گیا تو اس کے بعد مسلمانوں کی امت دو بڑے حصوں میں تقسیم ہو گئی ایک حصہ اہل بدعت کا، دوسرا حصہ اہل سنت کا۔

میں بدعت کا لفظ ان محدود معنوں میں نہیں بول رہا ہوں، جن میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کے اصل معنی یہ ہیں کہ اسلام کے نظام اور اسلامی زندگی میں اسلام سے باہر کی کوئی ایسی چیز لے آنا جو اس کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ مدرسے کا ایک خاص نظام اور اس کی ایک خاص فضا ہوتی ہے جس کا لحاظ ہیڈ ماسٹر کو رکھنا پڑتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنے بچے کو مدرسے میں داخل کرائے۔ اور وہاں اس کے بیٹھنے کے لئے صوفہ لا کے رکھ دے اور ایک خادم کھڑا کر دے۔ جو اسے پنکھا جھلتا رہے تو مدرسے کا ہیڈ ماسٹر صاف صاف کہے گا، کہ اس نظام میں ان چیزوں کی گنجائش نہیں۔ یہاں کسی اجنبی چیز کو لا داخل کرنے کی حرکت نہیں کی جا سکتی۔ بخلاف اس کے اگر ایک لنگڑا بچہ مدرسے میں داخل ہو تو باوجودیکہ مدرسے میں لاٹھی اور لکڑی لے کے آنا قاعدے کے خلاف ہے۔ لیکن لنگڑے بچے کو اجازت دی جائیگی۔ کہ وہ لکڑی کا سہارا لے سکے کیونکہ یہ اس کی ایک حقیقی ضرورت ہے۔ لیکن صوفے اور پنکھا جھلنے والے خادم کے لئے مدرسے کے نظم میں کوئی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی۔ اس مثال سے آپ بدعت کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ اسلام میں کسی ایسی چیز کو لا کے داخل کر

دینا جو اس کے اصولوں اور اس کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ بدعت کی تعریف میں آتی ہے

سنت کا مطلب اس طریقہ کے مطابق کام کرنا ہے جس پر نبی صلعم نے اسلام کے نظام کو قائم کیا تھا۔ اسلام میں جن معاملات کے لیے صاف صاف حکم نہ ملتا ہو، ان کے بارے میں اصولوں کو سامنے رکھ کر اور ان کے تقاضوں کو سمجھ کر کوئی حکم نکالنا بدعت نہیں، اجتہاد ہے۔ اور یہ عین سنت کے مطابق ہے۔ یہی سنت کا طریقہ تھا جس پر دورِ سعادت کے لوگ قائم تھے۔

یہیں جب بدعت کا آغاز ہوا تو امت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک اہل بدعت تھے جو بیرونی فلسفوں اور بیرونی مذہبوں سے متاثر ہوئے اور انہوں نے باہر سے کچھ چیزیں لا کر اسلام میں کھپانے کی کوشش کی۔ انہوں نے اسلامی نظام پر بیرونی تہذیب و تمدن کا رنگ چڑھانا چاہا۔

دوسری طرف ایک گروہ اہل سنت کا تھا۔ جو صدق دل سے اس بات کو مانتا تھا کہ ہمارے اصول، ہمارا نظام اور ہمارا تمدن وہ ہے۔ جو نبی صلعم اور خلفائے راشدین کے وقت میں تھا۔ اس گروہ کی پوری کوشش یہ تھی کہ زندگی ٹھیک انہی اصولوں پر قائم رہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے تھے۔

اہل سنت اور اہل بدعت کی کشمکش | ان دونوں گروہوں میں کشمکش بنی امیہ کے دور میں شروع ہو گئی اور آج تک چلی آ رہی ہے۔ بنو امیہ نے ملوکیت اور قیصریت کی بدعت کو لا کے اسلام میں داخل کر دیا۔ اہل سنت نے اسے روکنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی، کوڑے کھائے، بال بچے کٹوا دیئے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، انہوں نے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ تاکہ بدعت کا یہ سیلاب پھیلنے نہ پائے۔ پھر آگے چل کر بنو عباس کے زمانے میں بیرونی فلسفے بیرونی مذاہب اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن کے اثرات داخل ہونے شروع ہوئے۔ اہل بدعت وہ سارے کام کرنا چاہتے تھے۔ جن سے اسلامی زندگی مسخ ہو۔ دوسری طرف اہل سنت برابر کوشش کرتے رہے کہ یہ رخنے جو ڈالے جا رہے ہیں بند ہوں۔ اور صحیح اسلام اپنی اصلی صورت میں قائم رہ سکے۔

اسلامی سوسائٹی میں بدعت کا ظہور اصل سبب انتشار ہے۔ لفظ انتشار اجتماع کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی میں اجتماع کی بنیاد محمد صلعم کی پیروی، قرآن کے اتباع، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے تحت چلنے پر ہے۔ اس لئے ہر وہ چیز جو اس بنیاد سے ہٹانے والی ہو، سبب انتشار ہے

تاریخ شاہد ہے کہ اللہ کے فضل سے مسلمان کبھی بدعت پر جمع نہیں ہوئے۔ گمراہیاں ضرور پھیلیں لیکن یہ بات کبھی نہیں ہوئی کہ ساری امت بدعت پر جمع ہو جاتی۔ امت کی اکثریت اور اس کا سواد اعظم ہمیشہ سنت کو ہی مرکز مانتا رہا، اور اسی کا احترام اگرچہ اپنے سامنے بگاڑ کے باوجود مسلمانوں نے بدعت کو کبھی پسند نہیں کیا۔ آج بھی دیکھ لیجئے کہ اگرچہ پچھلی تاریخ میں بڑے بڑے بادشاہ، بڑے بڑے سپہ سالار اور جرنیل اور بڑے بڑے امیر اور دولت مند گزر چکے ہیں لیکن کہ ان میں سے کسی کی عقیدت بھی مسلمان عوام میں اس حد تک نہیں ہے جتنی امام ابو حنیفہ، امام احمد بن حنبل اور شاہ ولی اللہ جیسے اکابر کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان چاہے کتنے ہی بگڑ گئے ہوں۔ بہر حال وہ بدعت کو ناپسند کرتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بڑی دردناک ہے کہ اگرچہ ہماری اکثریت ہمیشہ بدعت پیدا کرنے والوں پر ناک بھوں چڑھاتی ہی رہی ہے، بہرحال زمام سیاسی اور معاشی اقتدار کی باگیں صدیوں سے اہل بدعت ہی کے ہاتھوں میں چلی آ رہی ہیں۔ اس وجہ سے نظام زندگی درست ہو کر عہد سعادت کی طرف نہ پلٹ سکا۔

فرنگی غلبے کا دور اور اہل بدعت کی اقسام | اس کے بعد وہ دور آیا کہ اہل مغرب ساری دنیا پر چھا گئے۔ کہیں تو مسلمان ملکوں پر ان کی حکومتیں براہ راست قائم ہو گئیں۔ اور کہیں مغرب کے عالمگیر غلبے کے اثر سے وہ قومیں جو آزاد سمجھی جاتی تھیں علمی و ذہنی اور معاشی حیثیت سے غلام بن گئیں۔

(۱) **متجددین** | اس دور میں اہل بدعت کی دو قسمیں سامنے آئیں۔ مسلمان ملکوں میں پھیل گئیں۔ ایک قسم ان اہل بدعت کی تھی جو اسلام سے کلیۃً کھلم کھلا منحرف ہو گئے۔ ان کو تعلیم اور اقتدار نے یہ سبق دیا۔ کہ تم اسلام پر چل کر ترقی نہیں کر سکتے چنانچہ انہیں اس میں شک ہو گیا کہ خدا ہے یا نہیں۔ اور رسول کو خدا نے بھیجا تھا۔ یا قرآن آنحضور صلعم نے خود ہی گھڑ لیا تھا۔ انہیں یہ یقین بھی نہ رہا کہ فی الواقع اسلام زندگی کا نظام بننے کے قابل ہے بھی۔

عملی حیثیت سے اہل بدعت کی اس قسم نے غیر اسلامی طور طریقوں اور غیر اسلامی انداز کو پوری طرح قبول کر لیا۔ اور حلال و حرام کی تمیز کو تار زح اور بحث قرار دیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اپنے گھروں کو اور اپنی اولاد کو سراسر غیر اسلامی تہذیب میں رنگ دیا۔ اور پھر پوری کوشش شروع کی کہ ان کی ساری قوم اسی رنگ میں رنگ جائے۔

اہل بدعت کی یہ قسم تمام مسلمان ممالک میں پیدا ہوئی اور کوئی ملک اس سے بچ نہیں سکا۔

(۲) **متحرفین** | دوسری قسم اہل بدعت کی وہ ہے جن کے نزدیک ساری اقدار کا اصل معیار خیر و شر، تہذیب

کے اصول اور مروجہ افکار کی حقیقتیں قابلِ قبول وہی ہیں۔ جو حضرات آئی ہیں بلکہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے کی وجہ سے انہیں اسلام سے جو پیدائشی عقیدت ہے، اسے یہ چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ یہ جدھر جائیں اسلام بھی ان کے پیچھے پیچھے ادھر گھومتا جائے۔ اس مقصد کے لئے یہ نیا اسلام تصنیف کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ جو ان کی پسندیدہ اقدار کے مطابق ہو۔ اس نئے اسلام کو قرآن و حدیث اصل بنیادیں نہیں ہیں، بلکہ اصل بنیادیں وہ مغربی افکار ہیں جو فضا میں چھائے ہوئے ہیں۔ ان حضرات میں سے بعض نے حدیث کو تو نظامِ دین میں سے بالکل خارج کر دیا ہے۔ اور اگر بعض نے حدیث اور فقہ کو لیا بھی ہے۔ تو اس طرح کہ وہ چیزیں جو ان کا ساتھ دے سکیں، ان کو اختیار کر لیا جائے اور بقیہ کو چھوڑ دیا جائے۔

اہلِ بدعت کی یہ قسم بھی تمام مسلمان ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ اور خود ہمارے ملک میں بھی موجود ہے لیکن اب تک کسی ملک میں بھی عام مسلمانوں کی اکثریت نے ان اہلِ بدعت کو پسند نہیں کیا اور نہ کسی جگہ کی اکثریت ان کے حق میں ہموار ہو سکی ہے۔ ترکی، ایران، مصر وغیرہ میں سے کوئی جگہ بھی ایسی نہیں جہاں عوام نے اہلِ بدعت کی رہنمائی کو حقیقی معنوں میں تسلیم کیا ہو اور اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھال لیا ہو۔ یہ گروہ ہر جگہ اقلیت میں ہے۔ اور اس کے خلاف ہر جگہ کشمکش جاری ہے، کہیں نمایاں طور پر اور کہیں دبی دبی۔

یہ البتہ بدقسمتی کی بات ہے کہ کوئی ایک مسلمان ملک بھی ایسا نہیں ہے جس کے آزاد سیاسی نظام میں اقتدار کی باگیں اہلِ سنت کے ہاتھ میں ہوں۔ ہر جگہ اقتدار پر قبضہ اہلِ بدعت ہی کا ہے۔ اور چونکہ یہ لوگ اپنی سوسائٹی کے لوگ ہیں۔ اپنے گھر کے ہیں۔ اس لئے پوری ہے باکی کے ساتھ تعلیم کی طاقت کو، پولیس اور فوج کی طاقت کو اور معاشی طاقت کو اس مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ کہ سوسائٹی کے مزاج کو بہ حیثیتِ مجموعی (Convert) کر لیا جائے یہ صورتِ احوال سارے ملکوں میں ہے۔ اور اس کی وجہ سے ایک کشمکش سارے ملکوں میں ہو رہی ہے۔

اب میں مختصر طور پر یہ بتاؤں گا کہ خود ہمارے ملک میں تقسیم سے پہلے کی صورتِ حالات کیا تھی۔

<u>تقسیم سے پہلے کی صورتِ حالات</u> تقسیم سے پہلے یہاں بعض ایسے اسباب کارفرما تھے۔ کہ اس ملک میں سارے ملکوں سے اسلام کا اثر زیادہ گہرا تھا۔ گزشتہ تین سو برس میں اسلام کو از سرِ نو زندہ اور تازہ کرنے کی جتنی معقول تحریکیں اٹھیں ان میں سے سب سے زیادہ اسی ملک میں اٹھیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک اسی ملک میں

اٹھی۔ پھر شاہ ولی اللہؒ اور اُن کے خاندان کی طرف سے اسلام کو زندہ کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد بھی متعدد کوششیں نہایت معقول اور زبردست طریق سے کی گئیں۔ کسی دوسرے ملک حتیٰ کہ مصر میں بھی اس پایہ کی اور اس قدر معقول کوششیں نہیں ہوئیں۔

یہ ایک بڑا سبب تھا کہ اسلام سے عقیدت، اسلام کا فہم اور اس کے بارے میں زندگی کے لئے رہنمائی کے قابل ہونے کا یقین جتنا اس ملک میں تھا اور کہیں نہیں تھا۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ اس ملک پر باہر کی ایک قوم حکمران تھی جس کے مٹھی بھر آدمی حکومت کر رہے تھے۔ وہ اس بات کی جرأت بھی نہ رکھتے تھے اور ان کے پاس ایسے ذرائع بھی نہ تھے کہ ہماری اندرونی زندگی میں پوری طرح گھس کر اسے اندر سے مسخ کر سکیں۔ انہوں نے چاہے ہر طرح کے طریقے اختیار کر کے تعلیم، معاشرت اور تمدن پر اثر ڈالا کہ ان کی تہذیب سے مطابقت رکھنے والی جتنی بدعات ہیں ان کو فروغ حاصل ہو۔ اور ان بدعات کے علمبرداروں کو چھانٹ چھانٹ کر اوپر لایا جائے۔ یہ ساری کوششیں اس بیرونی قوم نے کیں۔ لیکن سوسائٹی میں گھس کر اندر سے تبدیل کرنے کا موقع اس کو نہ ملا تاہم یہ واقعہ ہے۔ کہ انگریز کی سرپرستی اور پشتیبانی کے تحت اس ملک میں زندگی کے ہر شعبے کی قیادت و رہنمائی اہل بدعت ہی کو حاصل رہی۔ وہی پیش پیش رہے۔ معاملات کی باگیں انہیں نے سنبھالیں اور وہی ذریعہ بنے حاکم اور محکوم کے درمیان رابطے کا۔ حاکم نے آسمان فرماں روائی سے جو نعمتیں بھی نازل کیں انہی اہل بدعت کی وساطت سے کیں۔ اور محکوم نے جتنی دعائیں خداوندان مجازی سے کیں۔ انہیں کی وساطت سے کیں اس طرح سیاست و معیشت میں قیادت انہیں کے ہاتھ رہی۔

اہل بدعت کا تیسرا گروہ۔ منافقین انگریز قوم چونکہ اسلام کی معتقد تھی اس لئے یہاں اہل بدعت کا ایک تیسرا گروہ بڑے پیمانے پر پیدا ہو گیا ہے۔ یہ گروہ منافقین کا گروہ ہے۔ یہ لوگ تھے تو متغربین اور دراصل مغربی کے ہم خیال، لیکن انہوں نے چولا بدلا اور دعویٰ کیا۔ کہ تجدید و احیائے اسلام کا کام ہمارے ہاتھوں سے ہوگا۔ چنانچہ اس گروہ کو سب سے زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔ اور یہی گروہ تقسیم سے پہلے کی مخصوص حالات میں قوم کی سیاسی امامت پر قابض ہو گیا۔

مسلمان قوم نے جب یہ محسوس کیا۔ کہ ہندو قوم کے اقتدار کے نیچے ان کی کوئی زندگی نہیں ہے۔ تو ان میں پاکستان کا مطالبہ پیدا ہوا۔ اور اس مطالبے کے لئے سیاسی تحریک نمودار ہوئی۔ اس وقت جس چیز نے تمام مسلمانوں

کو متحد کیا وہ صرف یہ چیز ہے۔ کہ ان کو امید دلائی گئی کہ پاکستان اگر قائم ہوگا تو اس میں اصل اسلام کو پھر تازہ اور زندہ کیا جائیگا۔ پورا نظام زندگی اسلامی بنیادوں پر پھر قائم کیا جائیگا۔ سوسائٹی کا مقصد زندگی وہی ہوگا جو مسلمان کا مقصدِ زندگی ہے۔ اس امید پر قوم من حیث القوم مطالبۂ پاکستان کے لئے میدان میں نکل آئی۔ اس کے لئے جو جدوجہد کی گئی اس میں مخلص اہل سنت اور دین سے محبت رکھنے والے عوام، دین سے منحرف اور منافقین سب متفق ہو گئے۔

یہاں ایک افسوسناک صورت حالات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں جو اہل خلوص تھے انہوں نے تو صرف کام سے غرض رکھی اور جو منحرف اور منافق تھے انہوں نے نام سے غرض رکھی اور جاہ کے حصول پر توجہ کی چنانچہ اس تحریک کے دوران میں اہل خلوص پیچھے رہ گئے کیونکہ وہ جاہ طلب اور اقتدار کے لئے جدوجہد کرنے والے نہ تھے۔ لیکن منافقین نے پوری کوشش کی کہ پاکستان بنے تو پورا نظم و نسق ہمارے ہاتھوں میں آجائے۔ انہی حالات میں ۴۷ء کا انقلاب واقع ہوا۔

یہ انقلاب ابھی آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے۔ کہ جس گروہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اس انقلاب کے دوران میں اس کا رویّہ کیا تھا جتنی لوٹ کھسوٹ ہوئی ہے انہی کے ہاتھوں ہوئی ہے اموال متروکہ پر ناجائز قبضے حاصل کرنے اور اپنے عزیزوں دوستوں کو دلوانے کے لئے انہی نے تگ و دو کی ہے، معاشی ذرائع پر بھی یہی قابض ہوئے ہیں۔ اقتدار کی کنجیوں پر انہی کو قبضہ حاصل ہوا۔ قوم لٹ رہی تھی۔ اور یہاں گِدھ اڑ رہے تھے۔ مخلص کارکن جن کی قربانیوں سے فی الاصل یہ انقلاب ہوا تھا۔ وہ دودھ کی مکھی کی طرح الگ نکال پھینکے گئے اور ان کو وہ کچھ بھی نہ ملا جس کے وہ واقعی مستحق اور حاجت مند تھے۔

انقلاب ۴۷ء کے بعد اس کے بعد جب انقلاب کا دور گزر گیا۔ تو جیسا کہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے۔ اس گروہ نے عجیب و غریب رویّہ اختیار کیا۔ وہ تمام مواعید جو تحریک پاکستان کے دوران میں اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے کئے گئے تھے انہیں کھلم کھلا جھٹلا دیا گیا۔ صاف صاف کہا گیا کہ کون کہتا ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا؟ پاکستان تھیوکریٹک سٹیٹ نہیں ہوگا۔ بلکہ ٹھیک غیر مذہبی (Secular) اسٹیٹ ہوگا۔ لوگوں کی طرف سے جب ان باتوں کو سن کر پرانے وعدے یاد دلائے جانے لگے تو یہ سوال اٹھایا گیا کہ کونسا

ممکن نہ رہا کہ عوام کو مسلسل Confuse کیا جا سکے۔

جب حالات یہاں تک پہنچ گئے۔ تو ان حضرات کو یہ غلط فہمی لاحق ہوئی کہ یہ ساری شرارت ایک جماعت کی ہے اور اس جماعت میں بھی ایک شریر شخص ایسا ہے جو ان حرکتوں کا اصل ذمہ دار ہے چنانچہ جھوٹ اور مکر کی تمام توپوں کا رخ اُس ایک جماعت اور اُس ایک شخص کی طرف پھیر دیا گیا۔ آپ شاہد ہیں۔ کہ ان حضرات نے کیا کیا طوفان اٹھائے پھر انہوں نے اپنی غلط فہمی کی بنا پر اُس ایک شخص اور اس کے دو مددگاروں کو میدان سے ہٹا دیا۔ لیکن بعد میں یہ غلط فہمی رفع ہو گئی۔ کہ یہ ساری شرارت ایک شخص اور اس کے چند ہم نواؤں کی ہے۔ بلکہ ان پر یہ واضح ہو گیا۔ کہ مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت اس مطالبہ کی پشت پر ہے۔ کہ پاکستان کا نظام اسلامی ہونا چاہئے۔ تمام اہل سنت یعنی وہ لوگ جو قرآن اور رسولؐ کو حجت مانتے ہیں مطالبے کے پیچھے تھے۔ اور یہ ان کے دلوں کی آواز تھی۔ ان کا زور برابر بڑھتا گیا جس کے نتیجے میں قرار دادِ مقاصد پاس کرنی پڑی۔

قرار دادِ مقاصد کی آئینی حیثیت قرار دادِ مقاصد کی دو حیثیتیں ہیں، ایک آئینی، دوسری عملی۔ لوگ ان دونوں حیثیتوں کو بالعموم گڈمڈ کر دیتے ہیں۔

اس قرار داد کی آئینی حیثیت یہ ہے۔ کہ تمام باشندگان پاکستان کی طرف سے ان کے مطالبے کی بنا پر دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونے والے نمائندوں نے یہ قرار داد پاس کی ہے۔ انہوں نے پوری قوم کی طرف سے کلمۂ اسلام پڑھا ہے۔ یہ اسمبلی درحقیقت قوم کی زبان ہے۔ پس دستوری حیثیت سے قوم اگر کلمہ پڑھ سکتی تھی۔ تو اپنی اسی زبان سے پڑھ سکتی تھی۔ چنانچہ قوم نے جب کلمہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو اپنی زبان کو مجبور کیا۔ کہ وہ کلمۂ طیبہ پڑھے۔ دستور یہ کے کلمہ پڑھ لینے سے اب ریاست کی اصولی حیثیت متعین ہو گئی ہے۔

اس قرار داد کے ذریعے پہلی چیز جس کا اقرار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا فرماں روا اللہ تعالیٰ ہے۔ اگرچہ صاف صاف طریقے سے یہ نہیں کہا گیا کہ وہ پاکستان کا بادشاہ ہے۔ لیکن پاکستان بہرحال کائنات کا جزو ہے اور اللہ تعالیٰ کی سلطنت کا ایک حصہ ہے۔

دوسری چیز جو کہی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اختیارات باشندگان ملک کی وساطت سے اُن کے منتخب نمائندوں کے ذریعے حدود اللہ کی پوری پابندی میں استعمال کرنے کے لیے تفویض کئے ہیں، وہ ایک مقدس امانت

ہیں۔ اس قرارداد میں حسبِ ذیل تین پہلو اہم ہیں:۔

(۱) ریاست کے اختیارات مستقل بالذات نہیں ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے تفویض کردہ ہیں۔ خلافت کا تصور ٹھیک یہی ہے۔ کہ حکومت تفویض کردہ اختیارات کی حامل ہوتی ہے۔

(۲) یہ اختیارات کسی شخص یا خاندان کو تفویض نہیں کئے۔ بلکہ باشندگانِ ملک کی وساطت سے اِن لوگوں کو عطا کئے ہیں جو منتخب کئے جائیں۔ یہ تصورِ اسلامی جمہوریت کو مغربی جمہوریت اور تھیوکریسی دونوں سے ممیز کرتا ہے۔ مغربی جمہوریت میں باشندگانِ ملک خود حاکم ہوتے ہیں۔ تھیوکریسی میں ایک طبقہ حاکم ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں حاکم اللہ تعالیٰ ہے اور اسی نے نیابتی اختیارات پورے باشندگانِ ملک کو سونپے ہیں۔ اور باشندگانِ ملک انہیں ریاست کے حوالے کرتے ہیں۔ اسلامی جمہوریت عمومی خلافت (Popular Vicegerency) ہے۔ یہ یورپ کی مذہبی حکومت اور لادین جمہوریت دونوں سے الگ ایک تیسری چیز ہے۔

(۳) مقدس امانت کے الفاظ حکومت اور اس کے مناصب اور اختیارات کی حیثیت کو پوری طرح واضح کرتے ہیں اِنہی الفاظ کی تشریح یہ ہے کہ اختیارات کو خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک مسلمان حدود اللہ کا کوئی تصور اس کے سوا نہیں رکھتا کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت نے جو حدیں مقرر کر دی ہیں ان کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

ان باتوں کی وجہ سے اس قرار کے وہی معنی ہیں۔ جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے ہیں پس اس کلمے کو ادا کرنے کی وجہ سے ہماری ریاست اصولی حیثیت سے اسلامی ہو گئی ہے۔

قراردادِ مقاصد کی عملی حیثیت | اب اس قرارداد کی عملی حیثیت کو لیجئے۔ درحقیقت یہ ایک ایسی بارش تھی کہ نہ جس کے پہلے کوئی گھٹا اٹھی اور نہ جس کے بعد کوئی روئیدگی پیدا ہوئی۔ اس قرارداد کے پاس ہونے کے دو چار روز پہلے تک بھی اس بات کے کوئی آثار نہ تھے۔ کہ کوئی واقعہ ہونے والا ہے۔ اس بارش سے پہلے ٹھنڈی ہوا تک نہیں چلی تھی پس نے برس جانے کے بعد معلوم ہوا کہ ایک اچانک حادثہ تھا۔ جو آیا اور گزر گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرارداد اس طرح پاس کی گئی ہے جس طرح ایک ہارا ہوا جواری اپنا آخری داؤں پھینکتا ہے جس زمانے میں یہ پاس ہوئی۔ اس زمانے میں میں تو جیل کی کھڑکیوں ہی سے جھانک سکتا تھا۔ لیکن

آپ حاضر تھے۔ کیا ان لوگوں میں اس واقعہ کے ایک ہفتہ قبل، بلکہ ایک دن پہلے بھی کوئی ایسی تبدیلی پائی گئی جس سے آپ سمجھتے ہوں۔ کہ ان کی اقدار میں یا ان کے نقطۂ نظر میں کچھ فرق آرہا ہے؟ ایک شخص اسلام قبول کرتا ہے تو اس میں یہ تبدیلی یکایک ایک منٹ میں نہیں آتی۔ وہ پہلے سے کچھ بدلنے لگتا ہے۔ اسے اسلام کی طرف آہستہ آہستہ رغبت ہوتی ہے۔ وہ اسے سمجھنے اور معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ الغرض اس میں کوئی تمہیدی فرق رونما ہوتا ہے جس کے بعد وہ ارتقا کرتے کرتے جا کر کسی سے کہتا ہے کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ پھر اس میں کچھ بھی اخلاص ہوتا ہے تو وہ جاکر خود معلوم کرتا ہے کہ مجھے نماز سکھاؤ۔ وہ لباس کو بدلتا ہے۔ نام کو بدلتا ہے۔ اپنی دستیوں کو بدلتا ہے۔ یہ ساری چیزیں وہ کرتا ہے۔ دنیا میں اور کسی جگہ آپ نہ دیکھیں گے کہ کوئی واقعہ ایسا اچانک ہو جائے کہ نہ پہلے سے اسکے کچھ آثار موجود ہوں۔ نہ بعد میں اس سے کوئی نتائج نمودار ہوں۔ حکومت کے سیٹ میں قرارداد مقاصد سے ایک دن پہلے تک بھی کوئی تغیر نہیں آیا۔ ایک آدمی اگر کوئی عمارت بنانے کا اعلان کرتا ہے تو اور کچھ نہیں کرتا۔ تو کم سے کم اینٹ، چونا، لکڑی، کنڈیاں تلاش کرتا ہے راج مزدوروں کی تلاش کرتا ہے۔ لیکن یہاں اسلامی نظام کی تعمیر کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اور اس کے لئے کسی طرح کی کوئی تیاری نہیں کی جاتی۔ نہ اس کے پہلے، نہ اس کے بعد۔

میں نے اور میرے رفقاء نے جب اخبارات میں یہ خبر پڑھی تو ہم سب کو قرارداد مقاصد کے پاس ہو جانے سے بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم بڑے اچنبھے میں مبتلا ہوا کہ اخبارات کے ذریعے اس قسم کے کوئی آثار معلوم نہ ہوتے تھے کہ کسی طرح کے تمہیدی تغیرات ہو رہے ہیں۔ پھر اس کے پاس ہونے کے بعد برابر انتظار رہا کہ اب تغیر شروع ہوتا ہے، اب تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ لیکن جب کچھ نہ ہوا تو میرے دل نے گواہی دی کہ ان حضرات کے قرارداد مقاصد پاس کرنے کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہے۔ جیسے کوئی میم صاحبہ کسی مسلمان نواب یا رئیس زادے سے نکاح کرانا چاہے۔ اور وہ اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لیے وراثت کے حقوق اور مسلمان سوسائٹی میں برابری کے حقوق حاصل کرنے کے لئے کلمۂ اسلام پڑھ لے۔ لیکن نہ اس کلمے سے پہلے اسکی زندگی میں کوئی تغیر آئے نہ اس کے بعد کوئی تبدیلی رونما ہو۔ جیسی میم صاحبہ وہ پہلے تھیں ویسی ہی میم صاحبہ وہ بعد میں رہیں۔

ہمارے قرارداد مقاصد پاس کرنے والوں کا حال بھی ان میم صاحبہ کا سا ہے۔

دستور سازی: اب اگر اعتراض کیا جاتا ہے۔ تو کہا جاتا ہے کہ صاحب ابھی تو نیا آئین بن رہا ہے۔ اس سے

مکمل ہو جانے دیجئے، پھر دیکھئے گا۔ کہ یہ کیا کیا کرامتیں دکھاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ اس کی کوئی تیاری تو معلوم ہو۔ اگر یہ لوگ مخلص ہیں۔۔ تو نئے آئین کے انتظار میں بیٹھے رہنے کی ضرورت کیا ہے۔ مکان کا نقشہ مکمل ہونے میں اگر دیر ہے۔ تو اینٹ چونے کی فراہمی کی کچھ فکر تو شروع کر دیں۔ لیکن آثار اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ساری تر مغربی تہذیب کو فروغ دینے کے لئے کی جا رہی ہے۔ اور سرکاری خرچ پر سرکاری سرپرستی میں پوری کوشش ہو رہی ہے۔ کہ اسلامی اخلاق کی جڑیں کھوکھلی کر دی جائیں۔ جس طرح قرارداد مقاصد سے پہلے لوگوں کے ذہن میں انتشار پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں۔ اسی طرح اب قرارداد مقاصد کے بعد عوام میں ذہنی انتشار پھیلانے کے لئے اسلام کی عجیب عجیب تاویلیں کی جا رہی ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں۔ کہ بجائے اس کے کہ لوگ اسلام کا واضح تصور حاصل کریں اور متحدہ طاقت سے اسلامی زندگی کی تعمیر میں حصہ لیں۔ ان کے دماغوں میں الجھنیں پیدا ہو جائیں۔

دستور سازی کا کام جس کے جلد انجام پانے کی امیدیں دلائی جا رہی ہیں۔ وہ کن لوگوں کے سپرد کیا گیا ہے؟ آپ خود جانتے ہیں۔ کہ جن لوگوں نے قرارداد مقاصد کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ وہ سب دستوریہ کی سب کمیٹیوں میں شریک ہیں۔ ان میں وہ لوگ شامل ہیں۔ جو اسلام کے متعلق اتنا نہیں جانتے کہ وہ ہے کس چیز کا نام، جو نہیں جانتے کہ اسلامی حکومت کیا ہوتی ہے۔ جنہیں نہ قرآن سے تعلق ہے۔ نہ حدیث سے، جو یہ کہتے پھرتے ہیں۔ کہ اسلام کا نظام امریکہ کے نظام سے ملتا جلتا ہے۔ اسلامی دستور سازی کے لئے اس کام کے جاننے والوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ لے دے کے ایک مولانا شبیر احمد عثمانی رح تھے۔ لیکن ان کی وفات پر کسی ایک عالم دین کی خدمات بھی حاصل نہیں کی گئیں۔

اسلامی دستور کا علم رکھنے والوں کو دستوریہ میں شریک کرنے کے بجائے ایک مجلس ادارۂ تعلیمات اسلامیہ کے نام سے قائم کی گئی ہے۔ اس ادارے کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہ اس کے ذریعے قوم کو دھوکا دیا جائے۔ اور اسے بہلایا جا سکے۔ یہ مجلس دستوریہ سے علیحدہ ایک کمرے میں بیٹھتی ہے۔ اور اس سے جو سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ یہ ان کے جوابات لکھ دیتی ہے۔ یہ سب کچھ درپردہ ہوتا ہے۔ پبلک کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ سوال کیا پوچھے گئے۔ جواب کیا دیئے گئے۔ اور جوابات میں سے کن حصوں کو قبول کیا گیا۔ اور کن کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا۔ ان وجوہ سے اس ادارے کی آئینی اور قانونی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ صرف ایک ڈھونگ ہے۔ اور

اگر کچھ علماء خود دستوریہ کے اندر موجود ہوں تو ان کی رائے پبلک کو بھی معلوم ہو۔ لیکن ایک الگ کمرے میں بیٹھ کر کچھ لوگ سوالات کے جوابات جو چاہیں لکھتے رہیں۔ ان کی دستوری حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ کس قسم کا دستور بنا ڈالیں۔ اور وہ کہاں تک اسلامی نظام کے مطابق ہو۔ اور کہاں تک اس کے خلاف ہو۔ ایسی حالت میں اس دستور ساز اسمبلی پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ اسلام کے جاننے والے اس میں شریک نہیں ہیں۔

عوام کو بے بس کرنے کے انتظامات اس سے بھی زیادہ تشویشناک موجودہ حال یہ ہے۔ کہ حکومت مسلسل اپنے آپ کو ایسے ہتھیاروں سے مسلح کر رہی ہے۔ کہ اگر وہ کوئی ایسا غلط دستور پاس کرکے قوم کے سر منڈھ دے جس کو ملک کی اکثریت قبول کرنے پر تیار نہ ہو، تو قوم اس پوزیشن میں نہ ہو کہ ایسے بدلنے کی کوشش کر سکے۔ بلکہ حکومت کے ہاتھ اتنے مضبوط ہوں۔ کہ وہ جتنے لوگوں کو چاہے پکڑ کے جیلوں میں بند کر دے۔ اس مقصد کے لئے ایک طرف تو سیفٹی ایکٹ اور سرحد کرائمز ریگولیشن ایکٹ وغیرہ جیسے قوانین موجود ہیں۔ اور دوسری طرف اسی مدعا کے لئے ایک ایسا قانون بنایا گیا ہے۔ جس کی رو سے حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ کہ وہ اپنے جس عہدہ دار ملازم کو چاہے۔ راستے سے ہٹا دے۔ اس قانون کو اخباری زبان میں پروڈا ایکٹ کہا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر کسی وزیر، گورنر یا کسی سرکاری عہدہ دار کے متعلق یہ شبہ ہو کہ یہ خیانت اور بددیانتی کا ارتکاب کرتا ہے۔ تو اس پر مقدمہ چلا دیا جائے گا۔ لیکن ہائی کورٹ معاملے کی تحقیقات کرنے کے بعد جو فیصلہ دیگا۔ وہ فیصلہ نہیں ہوگا۔ بلکہ محض ایک رپورٹ ہوگی۔ یہ رپورٹ بھی پبلک کے سامنے نہیں لائی جائیگی۔ بلکہ چپکے سے گورنر جنرل کو بھیج دی جائے گی۔ اور گورنر جنرل کو اختیار ہے کہ وہ چاہیں تو قبول کریں۔ چاہیں تو رد کر دیں۔

اس ایکٹ کو جو شکل دی گئی ہے وہ صاف صاف شہادت دیتی ہے۔ کہ یہ دراصل اس غرض کے لئے بنایا گیا ہے۔ کہ جو عہدہ دار منشاء عالی کے مطابق کام نہ کریں۔ ان کو دھر لیا جائے۔ اور جن کی روش منشاء عالی کے مطابق ہو وہ چاہے۔ کتنی ہی خیانتیں کریں۔ ان کو نہ چھیڑا جائے۔ یہ ایکٹ دراصل نظام حکومت کو خیانتوں اور بددیانتیوں سے پاک کرنے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ صرف وزراء اور عہدے داروں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ چنانچہ آپ جانتے ہیں۔ کہ کن کن بڑے لوگوں نے کیا کیا خیانتیں کی ہیں۔ لیکن کسی کو پوچھا تک نہیں گیا

اور اگر کسی کی طرف سے رضاءِ عالی کے خلاف پتہ تک ہلا تو اسے فوراً جکڑ لیا گیا۔ یہ صرف اس لئے ہے۔ کہ ہر وسنز کو مٹھی میں لے لیا جائے اور جس طرح چاہیں۔ ان کو مجبور کیا جا سکے۔

یہ ساری تدابیر اسلئے اختیار کی جا رہی ہیں۔ کہ ہمارے اہل بدعت ایک شدید قسم کی ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے عوام پر جو کچھ مسلط کریں۔ وہ اسے برداشت کر لیں۔ اور گاڑی جدھر چل رہی ہے۔ اسے چلنا دیا جائے۔

اب میں آپ کو بتاؤں گا۔ کہ ان حالات میں ہم نے اپنا پروگرام کیا بنایا ہے۔

عام انتخابات کا مطالبہ | ہمارے ہاں اس بات کو سوچ سمجھ کر بطور اصول کے اختیار کیا گیا ہے۔ کہ صحیح نظام وہی ہے۔ جو جمہوری طریقوں سے بنایا جائے۔ نہ کہ انقلابی ذرائع سے۔ انقلابی ذرائع سے میری مراد خفیہ سازشیں اور مار دھاڑ کے طریقے ہیں۔ کسی نظام کو بدلنے کے لئے یہ نہایت غلط طریقے ہیں۔ اگر کوئی حکومت عوام پر زبردستی مسلط کر کے طاقت کے بل پر چلائی بھی جائے۔ تو ذہنوں کو اس کے مطابق ڈھلے نہ ہونے کی وجہ سے لازماً خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ آپ کسی نظام کے اصول، اس کے مزاج اور اس کے منشا کو لوگوں کے ذہن میں اتار دیں۔ اور عوام کی نظر انتخاب خود اسے پسند کرنے لگے۔ تو اس طرح کا تغیر پائیدار اور صحیح ہوگا۔ بس ہم چاہتے ہیں۔ کہ سابق نظریے کے اوپر جو نظام قائم ہے اس کو بدلنے کے لئے اور ہم جو نظام چاہتے ہیں۔ اسے قائم کرنے کے لئے سیدھے اور صاف جمہوری طریقوں سے کام کریں۔ ہم خود بھی اس اصول کے پابند ہیں۔ اور حکمرانوں سے بھی درخواست کرتے ہیں۔ کہ براہ کرم ایسے حالات کو ملک میں برقرار رہنے دیجئے کہ سیدھے اور صاف طریقوں سے کام کرنا ممکن رہے۔ ایسے حالات پیدا نہ کیجئے کہ برسر اقتدار لوگ عوام کی مرضی کے خلاف جیسا نظام چاہیں۔ چلا دیں۔ اس میں ملک، قوم، حکومت کسی کی بھلائی نہیں جہاں ایسے حالات قائم رہنے دیئے جائیں کہ عوام کا تبدیل ہو جانا حکومت کے تبدیل ہو جانے کے لئے کافی ہو۔ وہاں بغیر کسی خون خرابے کے، بغیر کسی افراط و تفریط کے، اور بغیر کسی انتہا پسندی کے تغیرات پر سکون طریقے سے ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں ان انقلابی ذرائع کو استعمال کرنے کی ضرورت پیدا نہیں ہوتی جو قومی زندگی کو الٹ پلٹ کے رکھ دیں۔ بلکہ اس قسم کے حالات میں تبدیلیاں ایسے فطری طریق سے آتی ہیں۔ جیسے ایک نابالغ بچہ بلوغ کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ بہرحال قوم، ملک، حکومت اور اسلام سب کی خیر اسی میں ہے۔ کہ ملک میں جمہوری انقلاب کے لئے راستہ کھلا رکھا جائے اور قوم کو تہ و بالا کر دینے والے انقلاب کی راہ پر چلنے کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔

اس مقصد کے پیش نظر ہماری پہلی کوشش یہی ہے۔ کہ پاکستان بھر میں نئے انتخابات کا مطالبہ کیا جائے ہیں موجودہ دستور یہ پر یہ اعتماد نہیں کہ وہ اسلامی دستور تیار کر سکتی ہے۔ اس نے اپنی نالائقی کو پوری طرح ثابت کر دیا ہے۔ وہ پارلیمنٹ کی حیثیت میں موجودہ حکمرانوں پر بندش CHECK لگانے کے قابل بھی نہیں ہے۔ بلکہ الٹا ان کی خواہشات کی آلہ کار بن کر رہ گئی ہے۔ وہ حکمرانوں سے یہ بھی پوچھنے کی جرأت نہیں رکھتی کہ ملک کا خزانہ کس طرح خرچ کیا جا رہا ہے لیے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ کہ ہمارے حکمران دوسرے ملکوں سے کیا معاملات کر رہے ہیں۔ اور کیسی کیسی ذمہ داریاں قوم کے سر لے رہے ہیں موجودہ دستور یہ میں اتنی جان نہیں ہے۔ کہ وہ ان سے اتنا ہی پوچھ لے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو آخر کس سے پوچھ کر رہے ہو۔

پس ہم چاہتے ہیں۔ کہ عام انتخابات ہوں۔ جن کے ذریعے ایسے لوگوں کو منتخب کیا جائے جو اسلامی دستور کو بنانے اور چلانے کے اہل ہوں۔ اور اس کا عزم رکھتے ہوں۔ ان انتخابات کے نتیجہ میں ایک بہتر قسم کی دستور ساز اسمبلی بھی بنے۔ اور ایک بہتر قسم کی حکومت قائم ہو جو قرارداد مقاصد کے منشا کے مطابق لوگوں کو تعمیری طور پر تیار کرے۔

مرکزی انتخابات کے ساتھ ساتھ ہم چاہتے ہیں کہ تمام صوبوں میں بھی نئے انتخابات ہوں کیونکہ اسلامی نظام زندگی کو قائم کرنے کا کام تنہا مرکز کے کرنے کا نہیں بلکہ صوبوں کی حکومتوں کو بھی اس میں بہت بڑا حصہ لینا ہوگا۔

انتخابات میں جماعت اسلامی کا فیصلہ شرکت دوسرا فیصلہ ہم نے یہ کیا ہے۔ کہ پنجاب کے انتخابات میں ہم پوری قوت سے شریک ہوں۔ اور اس بات کی کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ صالح لوگ منتخب ہوں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم خود امیدوار نہیں ہیں کہ ذاتی اقتدار کے حصول کیلئے کوشش کریں۔ اور نہ ہم پارٹی ٹکٹ پر اپنا کوئی آدمی کھڑا کریں گے۔ جن لوگوں نے ہمارے متعلق اس طرح کی بدگمانی سے کام لیا ہے ان کی بدگمانی غلط ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ عوام کو اس طرح تربیت دی جائے۔ کہ ان کی نگاہ انتخاب اچھے اور صالح آدمیوں ہی پر اُٹھے اور ان کے اندر یہ تلاش پیدا ہو جائے۔ کہ صالح آدمی کون ہے۔

اب تک تلاش وہ یہ کرتے رہے ہیں۔ کہ ان کی برادری کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ اندھوں کی طرح ان لوگوں کو ووٹ دیتے رہے ہیں جن کو کسی برسر اقتدار رہبر دلعزیز گروہ نے ٹکٹ دے دیا ہے۔ لیکن انہوں نے یہ جائزہ

کبھی نہیں لیا۔ کہ جسے وہ ووٹ دے رہے ہیں۔ وہ آدمی کس قسم کا ہے۔ اس کا کیریکٹر کیسا ہے۔ اس نے ماضی میں کیا کیا۔ اس کا حال کس طرح کا ہے۔ اور اس سے مستقبل کے بارے میں کیا امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

اب تک ہمارے عوام نے دھوکے کھائے ہیں۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو منتخب کیا ہے جنہوں نے امانت داری کا ثبوت نہیں دیا۔ بلکہ قوم سے خیانت کی ہے عہدوں سے ناجائز فائدے اٹھائے ہیں اور قوم کی خدمت کے بجائے ذاتی فائدہ پیش نظر رکھا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کے اندر ایسے لوگوں کو منتخب کرنے کی طلب پیدا ہو جو صالح ہوں اور بھروسے کے قابل ہوں ہم بجائے اس کے کہ ان سے یہ کہیں کہ ہمیں ووٹ دو۔ یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ یہ نظام زندگی جو قائم کرنا ہے اس کے لئے آدمی تلاش کرو۔ اب ہندوؤں اور انگریزوں سے لڑنے کا سوال درپیش نہیں ہے کہ چالاک لوگوں کی ضرورت ہو بلکہ اب تو سوال یہ ہے۔ کہ آپ کی زندگی کا نظام قرارداد مقاصد کے مطابق تعمیر کرنے کے لئے موزوں ترین لوگ کون سے ہیں۔

صالح نمائندے کی تعریف اس وقت جو متعین مقصد ہمارے سامنے ہے۔ اس کے مطابق ہی صالح نمائندے کی تعریف کی جاسکتی ہے۔ پیش نظر مقصد کے لحاظ سے دیکھنے کی چیزیں چار ہیں۔

مقصد جب متعین ہے تو اب اس مقصد کے نقطہ نظر سے دیکھئے کہ اسے پورا کرنے والے لوگ کون ہوسکتے ہیں

(۱) اس کی اپنی ذاتی زندگی اور گھر کی زندگی اس پر گواہ ہے کہ وہ حقیقت میں اسلام کو مانتا ہے۔ اور سچے دل سے اس کا پیرو ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ ایک کندۂ ناتراش تک اس بات کو نہ جان سکے۔ کہ کون شخص ایسا ہے جس کی زندگی بتا رہی ہے کہ وہ اسلام کا سچا پیرو ہے اور دھوکے کے طور پر اسلام کا نام لیتا ہے۔

۲- گردوپیش کے جن لوگوں سے اس کے معاملات ہوں، جن سے اس کا لین دین ہو، دن رات کے سابقہ ہو، معاشرت اور ہمسائیگی کا تعلق ہے۔ وہ اس کی ایمانداری کے گواہ ہوں اور وہ اس پر اس حیثیت سے بھروسہ کرتے ہوں کہ وہ جھوٹا آدمی نہیں ہے۔ وہ ناجائز انتفاع کرنے والا نہیں ہے۔ وہ رشوت نہیں لیتا بلکہ اس کے کیریکٹر پر عام لوگ اعتماد کرتے ہیں۔

کیا فی الواقع لوگ یہ نہیں جانتے ہیں کہ سوسائٹی میں جھوٹے اور حرام خوری کرنے والے لوگ کون ہیں۔ اور سچے اور

دیانتدار کون ہیں! اگر کوئی مرض کا علاج کرانے کے لئے یہ جان سکتے ہیں کہ فلاں ڈاکٹر اچھا ہے۔ مقدمہ لڑنے کے لئے یہ جان سکتے ہیں کہ فلاں وکیل قابل ہے اور خرید و فروخت کرنے کے لئے یہ معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ فلاں تاجر بھروسے کے لائق ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ یہی بات نہ جان سکیں کہ اسلامی نظام زندگی کی تعمیر کے لئے ان کے درمیان کونسے لوگ ایسے ہیں کہ جن پر بھروسہ کیا جائے۔

(۳) وہ دین اسلام کو بھی جانتا ہو۔ اور دنیا کو بھی سمجھتا ہو۔ دونوں آنکھیں رکھتا ہو۔ ایک آنکھ کا اندھا نہ ہو۔ وہ جانتا ہو۔ کہ اسلام کے تقاضوں کے مطابق دنیا کے معاملات کس طرح چلائے جا سکتے ہیں۔

(۴) وہ خود امیدوار نہ ہو۔ اور حصولِ منصب کے لئے خود کسی طرح کی کوشش نہ کرے۔

کوئی شخص ذرا سا بھی غور کرے تو سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص اقتدار کی کرسیوں کے لئے خود کوشش کرتا ہے وہ ذمہ داریوں پر نگاہ نہیں رکھتا، بلکہ ان کے ذریعے حاصل ہونے والے فوائد پر نگاہ رکھتا ہے۔ اپنے فائدے کے لئے وہ پبلسٹی کرتا ہے، موٹریں دوڑاتا ہے، دعوتیں کھلاتا ہے، خوشامدیں کرتا ہے، وہ اگر پچاس ہزار لگاتا ہے تو اس لئے کہ اس تجارت سے پچاس لاکھ کماؤں گا۔

اس معاملہ میں نبی صلعم کے واضح احکام موجود ہیں جیسے کہ آپ نے فرمایا:۔

اُس کام (یعنی حکومت) میں ذمہ داری کا منصب کسی ایسے شخص کو نہ دیا جائے جو خود اس کی درخواست یا حرص رکھتا ہو۔

پھر حدیث میں ہے کہ حضرت ابو موسےٰ اشعری کے ساتھ دو آدمی نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان دونوں نے درخواست کی کہ ان کو کوئی عہدہ دیا جائے اس پر نبی صلعم نے صاف صاف الفاظ میں فرمایا:۔

ان اخونکم عندنا من یطلبہ — تم میں سے خائن ترین وہ ہے جو اس (عہدے) کی درخواست کرے۔

اس پر حضرت ابو موسےٰ اشعری سخت شرمندہ ہوئے کہ میں ان کو کیوں ساتھ لایا۔

اس حدیث نبوی کے مطابق ہم عوام الناس کو تیار کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خود اپنے حلقے یا اس کے باہر ان صفات کے لوگوں کو خود تلاش کریں اور ان سے خود کہیں کہ ہماری نمائندگی کرو۔ پھر تعارف (CONVASSING) اور جدوجہد

"وہ نہ کریں بلکہ یہ کریں۔"[1]

دوسری جماعت کے امیدوار

گزشتہ مہینے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے میں نے ایک بات کہی تھی کہ ہمیں دوسری جماعتوں کے آدمیوں سے جماعتی تعصب نہیں، بلکہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کی بنا پر ہمیں اس میں تامل ہے کہ ہم ان کا ساتھ دیں۔

ایک تو یہی امیدواری (CANDIDATURE) کا فتنہ ہے۔ لوگ بنی پارٹیوں کے اندر ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے خاص جدوجہد کرتے ہیں، اور پھر پارٹیاں بھی غیر جانبداری سے ٹکٹ نہیں دیتیں۔ کہ ایماندارانہ طریق سے جائزہ لیں اور اپنے اندر سے بہتر لوگوں کو چھانٹ کر سامنے لائیں۔ پھر ان کے سامنے چھانٹنے کا جو بھی اور کوئی سا بھی معیار ہو، لیکن اسلامی معیار اب تک تو کبھی نہیں تھا

دوسرے ہماری مختلف جماعتوں میں پارٹی ڈسپلن کا ایک بالکل غلط تصور پایا جاتا ہے۔ جو شخص پارٹی ٹکٹ لیتا ہے، وہ پرونے معاہدہ (PARTY PLEGE) ایسے ڈسپلن میں بندھا ہوتا ہے کہ جس چیز کو اس کا ضمیر حق کہتا ہے وہ زبان سے اس کے خلاف رائے دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کی مضحکہ خیز مثالیں ہماری دستوریہ میں متعدد بار سامنے آچکی ہیں۔ پچھلے دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک شخص اٹھتا ہے اور ایک چیز کے خلاف دھواں دھار تقریر کرتا ہے لیکن پورے اجلاس میں شروع سے آخر تک اس کی مخالفت کرنے کے بعد جب ووٹ دیتا ہے تو دوسروں کی طرح اس کے حق میں ووٹ دیتا ہے۔ جس پارٹی ڈسپلن میں وہ بندھا ہوا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے وہ کچھ اور کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس کی رائے ضمیر کی آواز کے مطابق نہیں ہے، بلکہ وہ بہرحال پارٹی کے حق میں ہے، چاہے پارٹی راستی پر ہو یا نہ ہو۔ بنابریں جو لوگ اس طرح کے کسی پارٹی ڈسپلن میں بندھے ہوئے ہوں، وہ چاہے شخصی حد تک صالح بھی ہوں اور لوگ بھی انہیں صالح ہی کہیں، تب بھی ہم ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

---

[1] تقریر کے دوران میں ایک سائل کی حیثیت سے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ:۔

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ عوام الناس یعنی کسی حلقے کے لوگ خود جس آدمی کے متعلق یہ کہیں گے کہ ہم اس کو مذکورہ بالا معیار کے مطابق صالح قرار دیتے ہیں تو ہم عوام کا ساتھ دیں گے۔ ان کی نگاہیں اگر جماعت اسلامی کے اندر کے کسی آدمی پر پڑیں تو ہم اسی آدمی کی حمایت کریں گے۔ ہمارے دل اقتدار طلبی سے خالی ہیں، البتہ تم اگر کہے کہ تم یہ خدمت انجام دو تو ہم انکار نہیں کریں گے۔

اس سلسلے میں جو دوسرے عملی سوالات پیش آئیں گے وہ جیسے جیسے سامنے آتے جائیں گے، ان کو ہم حل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ بہرحال یہ ایک نیا تجربہ ہے جو ہم کرنے لگے ہیں

غنڈہ پن کا مقابلہ یہ ہم کو خوب معلوم ہے کہ انتخابی جدوجہد کس چیز کا نام ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ میدان کتنا گندہ کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے شرکتِ انتخاب کے ارادے کے اظہار کے ساتھ ہی ہر طرف سے کیچڑ اچھالی جانے لگی ہے۔ شریف آدمی کے لیے اس میدان میں داخل ہونا ناممکن بنا دیا گیا ہے اور جو کوئی اس میں داخل ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ گندی کیچڑ میں سے ہو کر ہی چلے اور اس پر بہرحال کیچڑ پڑے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا ہے کہ گندے کیرکٹر کے لوگ ہی آگے بڑھیں اور شرافت کو ادھر رخ کرنے کی جرأت نہ ہو سکے۔

اب جب کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ غنڈہ گردی کی گندگیوں کو ایسی کوششوں کی راہ میں مستقل رکاوٹ بنا دیا گیا ہے جن کا مقصد حکومت کو صالح ہاتھوں میں منتقل کرنا ہو تو ہم بہرحال یہ قربانی بھی دیں گے کہ ان ساری گندگیوں کو برداشت کریں۔ موجودہ غیر اسلامی اقتدار کو گوارا کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں، لہٰذا اسے بدلنے کے لیے لعن طعن کرنے والی زبانوں کی بھی کوئی پروا نہیں کریں گے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کامیاب ہوں گے یا ناکام، لیکن ہم یہ ضرور دکھانا چاہتے ہیں کہ شریف آدمی غنڈہ پن کا کس طرح مقابلہ کرتا ہے۔

معاشی مسائل کا اسلامی حل ہمارا تیسرا اہم فیصلہ یہ ہے کہ ہم معاشی مسائل کو اسلامی طریقہ پر حل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ معاشی مسائل کو حل کرنے میں اربابِ حکومت جس کوتاہی سے کام لے رہے ہیں اس کی وجہ سے طبقاتی آگ بھڑکنے کے آثار ہر طرف شروع ہو گئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کو نہ بھڑکنے دیا جائے۔ ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری کہ ہماری قوم ہندو مسلم کشمکش کے زخم کھا کر نڈھال ہو چکی ہے۔ اس کشمکش کی وجہ سے جیسی کچھ تباہی آئی سب کو معلوم ہے۔ آپ میں کم ہی ایسے لوگ ہوں گے جو اس کے زخم خوردہ نہ ہوں۔ اب ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے اندر طبقاتی جنگ کی آگ بھڑکے اور قوم کو پھر کشمکش اور جنگ کی سی حالت میں مبتلا کر دیا جائے۔

پھر جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ ایک ایسا کامل نسخہ ہمارے پاس موجود ہے جس کے ذریعے آپریشن کئے بغیر صحت ہو سکتی ہے تو اسے کیوں نہ سب سے آزما کر دیکھا جائے، اور خواہ مخواہ آپریشن ہی پہ اصرار کیا جائے۔ ہم اس نسخے کو آزما کر دیکھنا چاہتے ہیں

یہ واقعہ ہے کہ معاشی مسئلے کا حل اسلامی طریق پر صحیح معنوں میں اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ سیاسی اقتدار

صالح ہاتھوں میں موجود ہو۔ سیاسی اقتدار کے بغیر اس مسئلے کو پوری طرح حل نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم موجودہ حالات میں جب کہ اقتدار صالح ہاتھوں میں موجود نہیں ہے اور جن کے ہاتھ میں اقتدار ہے وہ یا تو کرنا چاہتے نہیں یا کرنا جانتے نہیں، ہم اپنی استطاعت کے مطابق سیاسی طاقت کے بغیر اصلاح کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں اس پر پوری طرح توجہ دیں گے۔

اس وقت ہمارے سامنے بڑے دو مسائل ہیں

جاگیرداری و زمینداری

پہلا مسئلہ جاگیرداری و زمینداری کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے مہینے ڈیڑھ مہینے کے دوران میں ہمارے مسلک کو نہایت غلط طریقے سے پیش کیا گیا ہے کہ ہم جاگیرداری کو جوں کا توں قائم رکھنا چاہتے ہیں اور ہم جاگیرداروں کے پشت پناہ ہیں۔ بعض لوگوں نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ اطلاعات نشر کیں کہ بڑے بڑے جاگیردار جماعت کے مرکز میں آکر ہم سے مل رہے ہیں ــــــ شاید گھر سے چلتے ہوئے وہ ان حضرات کے نام پوسٹ کارڈ لکھ کر ڈال دیتے ہوں گے کہ ہم فلاں لوگوں سے ملنے جا رہے ہیں!

حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ آئندہ جاگیریں اور زمینداریاں قائم کی جائیں یا نہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ پہلے سے جو جاگیریں اور زمینداریاں چلی آرہی ہیں ان کا کیا ہو۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ جاگیریں اسلام کا شعار کن ہیں، اور وہ ضرور قائم کی جائیں۔ یہ تو حکومت کا حق ہے اور وہ چاہے تو آئندہ کے لئے اسے جاری نہ رکھے۔

سوال صرف اتنا ہے کہ پہلے سے جو جاگیریں اور زمینداریاں چلی آرہی ہیں ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ اس معاملے میں محض یہ بات کہ اخبارات کسی طبقے کے خلاف لکھ رہے ہیں یا عوام شور مچا رہے ہیں اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ کسی طبقے کے حقوق ختم کر دیئے جائیں اور اس کی املاک ضبط کر لی جائیں۔ اس اصول کو اگر ایک دفعہ مان لیا جائے تو پھر معاملہ جاگیروں پر ہی ختم نہیں ہوگا بلکہ اس کے بعد اور مطالبے ہوں گے۔ کچھ عجب نہیں کہ کل اس بات کے لئے شور مچے کہ فلاں شخص کی آزادی سلب کر لی جائے اور پھر یہ بھی اس بات کے لئے ہنگامہ برپا کیا جائے کہ فلاں کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ جہاں کوئی اصول و قانون نہ ہو، بلکہ محض شور اور ہنگامے کو اصول مان لیا جائے وہاں تو انسانی حقوق میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ کوئی معاملہ کرنے کے لئے یہ بھی کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے کہ پچھلا نظام چونکہ غلط تھا اس لئے اس کے کئے ہوئے سارے معاملات کالعدم قرار پانے چاہئیں۔ اس بنیاد کو اگر صحیح تسلیم کیا جائے تو ایک ایک

کپڑا جو آپ پہنے ہوتے ہیں اس کی تاریخ کا کھوج لگانا ہوگا، اور پھر زمین ہی نہیں، ساری ملکیتوں ——— مکانوں موٹروں، کپڑوں کے متعلق یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ یہ سب کا سب چھین لینا چاہیئے۔ دراصل عوام کو دھوکہ دینے کے لئے اس قسم کی مبالغہ انگیز باتیں کی جاتی ہیں۔

کوئی معقول آدمی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ بجائے خود یہ فعل کہ حکومت خدمت یا کام کے بدلے میں کسی کو زمین عطا کرے، فی نفسہٖ جائز ہے۔ اگر ایک حکومت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ خدمت کے معاوضے میں روپیہ سواری یا مکان کسی کو دے تو کوئی معقول دلیل اس امر کے حق میں نہیں ہے کہ حکومت زمین نہ دے، اگرچہ زمین دینا کوئی فرض بھی نہیں ہے۔ محض اس بنا پر کہ کسی حکومت نے کسی زمین کو دیا ہے اسے ناجائز قرار نہیں دیا جا سکتا جو کام خود نبی صلعم نے کیا ہو، اکابر صحابہ نے کیا ہو اسے ناجائز کہنے میں کچھ تو تامل کرنا چاہیئے۔

جاگیروں کی تحقیق کیلئے تین اصول

البتہ سوال یہ اٹھانے کا ہے کہ اگر حکومت نے اگر عطیہ دیا ہے تو وہ جائز قسم کا ہے یا ناجائز قسم کا۔ جیسا کہ میں بار بار کہتا رہا ہوں اور جیسے مجلس شوریٰ نے بھی اپنے ریزولیوشن میں بیان کر دیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جائز اور ناجائز کی تحقیق کی جائے اور اس تحقیق کے لئے تین اصول ہیں۔

۱:۔ حکومت نے جو عطیہ کسی کو دیا ہے وہ کس قسم کی زمینوں میں سے دیا ہے۔ آیا غیر مملوکہ افتادہ (موات) زمینوں میں سے یا سرکاری مقبوضہ (خالصہ) زمینوں میں سے۔ یا کیا لوگوں کی مملوکہ زمینیں چھین کر کسی کو عطیہ دیا ہے اور اصل مالکوں کو کاشتکار بنا دیا ہے۔

اگر پہلی دو قسم کی زمینوں میں سے دیا ہے تو اس پہلے اصول کی حد تک معاملہ جائز ہے۔ لیکن اگر تیسری قسم کی زمینوں میں سے دیا ہے تو وہ قطعاً ناجائز ہے اور اسے منسوخ ہونا چاہیئے۔ یہی کام حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کیا تھا۔

۲:۔ جاگیروں کو جانچنے کے لئے دوسرا اصول یہ ہے کہ حکومت نے عطیہ کن خدمات اور کس قسم کی اغراض کے لئے دیا ہے آیا پبلک کی حقیقی خدمات کے صلے میں دیا یا پبلک مفاد کے خلاف؟ اگر پبلک مفاد کے لئے کوئی صلہ دیا گیا ہو اور وہ "موات" اور "خالصہ" زمینوں میں سے دیا گیا ہو تو وہ جائز ہوگا، لیکن پبلک مفاد کے لئے بھی اگر لوگوں کی مملوکہ زمینوں کو زبردستی کسی کے لئے جاگیر بنا دیا گیا ہو تو جائز اغراض کے لئے دیا ہوا عطیہ بھی ناجائز ہوگا۔ رہے وہ عطیے جو پبلک کے مفاد کے خلاف حکمراں طاقت نے اپنے مفاد کے لئے دیئے ہوں وہ سراسر ناجائز ہیں ——— چاہے جائز قسم کی زمینوں میں

سے کیوں نہ دیئے گئے ہوں۔

۴:۔ کسی عطیہ کے جائز ہونے کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ وہ جائز زمین میں سے جائز پبلک خدمات کے لئے دیا گیا ہو، بلکہ تیسری بات تحقیق کرنے کی یہ بھی ہے کہ اعتدال سے دیا گیا ہو، بے اعتدالی سے نہ دیا گیا ہو۔ میں یہ واضح کر دوں کہ اسلام میں اعتدال کی شرط کے معنی یہ ہیں کہ اصول کفالت کے مطابق عطیہ اس حد تک دیا گیا ہو کہ متوسط درجہ کی صالح زندگی گذاری جا سکے۔ نہ یہ کہ ایک شخص بیس بیس موٹریں رکھ سکے اور اس کے ایک ایک کتے کو دودھ پلانے کے لئے ایک ایک گائے بندھی ہو۔ کفالت کی حد سے زائد اگر عطیہ دیا گیا ہو تو وہ بے اعتدالی کی تعریف میں آتا ہے، اور اس میں سے صرف معتدل حد تک کہ جتنا ایک شخص کی کفالت (PROVIDE) کرنے کے لئے کافی ہو، باقی رکھ کر بقیہ کو واپس لے لینا چاہیئے۔

میں اور میری جماعت یہ چاہتی ہے کہ اس مسئلے کو اس طرح حل کیا جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہماری دانست میں ملک میں کوئی عالم دین ایسا نہیں ہے جو اس اصول کو تسلیم نہ کرتا ہو کہ اسلام کے دیئے ہوئے بنیادی حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ کسی شخص کے قبضے سے کوئی چیز اس وقت تک نہ نکالی جائے جب تک قبضہ ناجائز ثابت نہ ہو یا کوئی ایسا جرم نہ عائد ہو جائے جس کی وجہ سے حکومت کو اس کی ملکیت کے سلب کرنے کا حق پہنچتا ہو۔ اس اصول کے ہوتے ہوئے جب تک کہ باقاعدہ تحقیقات سے ثابت نہ کر دیا جائے کہ فلاں فلاں عطیات ناجائز ہیں، میں آخر کس بنا پر چند اخبارات کے شور مچانے پر اسلام کے اصولوں کو بدل دوں[1]۔

زمینداروں اور مزارعان کے تعلقات کی اصلاح اس کی چھان بین کے بعد جن لوگوں کے پاس بھی زمینیں رہ جائیں ان کو مطلق العنان نہیں چھوڑا جا سکتا کہ وہ اپنے مزارعوں پر جس طرح چاہیں ظلم و ستم کرتے رہیں جس طرح اب تک کرتے

[1] اس مرحلے پر تقریر کے دوران میں یہ سوال کیا گیا کہ جو جاگیریں جائز مقاصد کیلئے دی گئی تھیں لیکن ان کا استعمال اب اصل مقاصد کے لئے ہو ہی نہیں رہا تو ان کا کیا ہوگا؟ اس پر مولانا نے فرمایا کہ ایسی جاگیریں جو خدمات کا صلہ نہ ہوں بلکہ کسی جائز خدمت کو جاری رکھنے کے لئے دی گئی ہوں، ان کے بارے میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس خدمت کو اب بھی جاری رکھنا مطلوب ہے یا نہیں؟ اگر مطلوب نہ ہو یا ان کا استعمال صحیح نہ ہو رہا ہو تو ان کو واپس لیا جا سکتا ہے۔

رکھے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ان کو اسلامی حدود کا پابند بنایا جائے اور ان سے وہ تمام حقوق ساقط کر دیئے جائیں جو انہوں نے زبردستی قائم کر رکھے ہیں۔

اسلامی حدود کا مطلب یہ ہے کہ سیدھی طرح صفائی سے زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان شرکت کا معاملہ ہونا چاہیئے۔ اگر بٹائی اور لگان کے معاملہ میں افراط و تفریط ہو رہی ہے تو حکومت کو چاہیئے کہ وہ قانونی طور پر افراط و تفریط کو روک دے اور جائز منصفانہ شرح مقرر کر دے۔ اس مقررہ شرح سے زائد ایک حبہ وصول کرنے کی جرات کسی کو نہ ہو اس کے علاوہ عشر و زکوٰۃ کی تحصیل کا باقاعدہ انتظام کیا جائے تاکہ اس سے مستحقین کی ضروریات پوری ہوں۔ وراثت کا اسلامی قانون جاری ہو اور زمینوں کو بانٹ کر مستحقین تک ان کے حق پہنچائے جائیں۔

زمینداریوں کا جائزہ یہی معاملہ زمینداریوں سے بھی کرنا پڑے گا۔ ان پر بھی باقاعدہ نگاہ ڈال کر دیکھا جائے کہ ان کی نوعیت کیا ہے۔ زمینداریوں کی لحاظ سے ہاں دو قسمیں پائی جاتی ہیں

ایک وہ جو یا تو کسی نے خود خریدی ہوں یا وراثت میں پائی ہوں اور یہ پتہ چلنا ممکن ہی نہ ہو کہ ان کی اصل کیا ہے۔

دوسری وہ جن کی حیثیت مالگذاری کی ایجنسیوں کی تھی اور بعد میں ان کے مالکانہ حقوق دیدیئے گئے۔ اس قسم کے زمیندار دراصل تحصیل کے ایجنٹ تھے انہوں نے حقوق ملکیت بے جا طور پر حاصل کئے ہوئے ہیں، لہٰذا یہ منسوخ ہو جانے چاہئیں۔ اس قسم کی زمینداریوں کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جائز ملکیتیں صرف وہ ہیں جن کو یا تو خود کسی نے خریدا ہو یا میراث میں پایا ہو۔

اسلام میں جاگیرداریوں اور زمینداریوں کی اصلاح کے لئے ان اصولوں پر باقاعدہ کارروائی کئے بغیر اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ قرآن اور احادیث کے سوا اور کسی چیز کو حجت ماننے کے لئے میں ہرگز تیار نہیں ہوں جو لوگ باہر کے نظریات سے مرعوب ہیں اور باہر کے نظریات لا کر میرے سامنے رکھتے ہیں، ان سے میں صاف صاف کہتا ہوں کہ اسلام سے باہر کے نظریات کو میں قبول نہیں کر سکتا۔ میرے لئے صرف قرآن اور احادیث حجت ہیں۔

محنت پیشہ طبقے دوسری طرف ہمارے سامنے محنت پیشہ اور محنت کش طبقہ کا مسئلہ ہے۔ ہم اس اصول کے قائل ہیں کہ جو کوئی محنت پیشہ اور محنت کش طبقوں سے محنت لیتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ محنت کرنے والے کی ضروریات کو پورا کرے چاہے وہ محنت کش کسی کارخانہ کا مزدور ہو یا حکومت کے کسی محکمہ کا ملازم۔ ہم اس کو جائز ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ایک

شخص تو دو ہزار، چار ہزار روپے ماہانہ وصول کرے، چاہے وہ ایک بیوی اور ایک ہی بچے کی کفالت کا ذمہ دار ہو، اور دوسری طرف وہ محنت کش جس کی پوری قوتیں آپ لیتے ہیں اس کے کنبے کے افراد چاہے کتنے ہی زیادہ ہوں، پچیس روپے ماہوار پر کام کرے۔ یہ بالکل کھلی کھلی زیادتی ہے۔ قابلیتوں میں تفاوت ہو سکتا ہے اور اس کا جائز حد تک لحاظ کیا جا سکتا ہے یہ بلاشبہ زیادتی ہوگی کہ ایک کام میں جس میں زیادہ قدر و قیمت کی محنت کرنی پڑتی ہو اسے، اس کام کے برابر قرار دیا جائے جس میں کم قدر و قیمت کی محنت کرنی پڑے۔ لیکن یہ بھی غلط ہے کہ کسی کا پورا وقت لینے کے بعد اس کی ضروریات کی کفالت نہ کی جائے

ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ کی تقسیم اور وصولی کا باقاعدہ انتظام کیا جائے اور حکومت اس امر کی ذمہ دار ہو کہ کوئی شخص حقیقی ضروریات سے محروم نہ رہنے پائے۔

فوری پروگرام

ظاہر بات ہے کہ جب تک سیاسی اقتدار نہ ہو اس پروگرام پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت ایسی ہونی چاہیے جو ان اصلاحات کو عملاً نافذ کرے۔ حکومت کے ذرائع و وسائل کو ہاتھ میں لئے بغیر نہ تو جاگیروں اور زمینداریوں کی چھان بین کا کام ہمارے لئے ممکن ہے نہ محنت کش طبقے اور سرکاری ملازمین کے حقوق کو اسلام کے مطابق بحال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا، ہم چاہتے ہیں کہ غیر سیاسی اور غیر سرکاری حیثیت سے جو کچھ ممکن ہو وہ کریں۔

ہم دیہات میں جا کر زمیندار اور مزارع کے درمیان اسلام کے مقرر کردہ حقوق کا احترام پیدا کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ غلط اور ناجائز چیزوں کو رضاکارانہ طور پر چھوڑ دیں اور صرف جائز اور صحیح کو قائم رکھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جو مالکان زمین اصلاح پذیری پر تیار نہ ہوں، ان کو ظلم سے روکنے کے لئے ہم کاشتکاروں کو اسلامی طریق پر منظم کرنا چاہتے ہیں، تاکہ دباؤ ڈالنے کی ممکن جائز صورتیں اختیار کر سکیں۔

دباؤ ڈالنے کے معاملے میں ہمارے اور غیر اسلامی نظریات رکھنے والوں کے درمیان ایک فرق ہے۔ ان کا مقصد دباؤ ڈالنے سے یہ ہوتا ہے کہ طبقاتی کشمکش کی آگ مشتعل ہو اور ایک مسئلہ حل ہو تو کوئی اور خرابی پیدا ہو جائے اور کسی صورت میں جھگڑا نمٹنے نہ پائے۔ ہم دباؤ اس لئے ڈالنا چاہتے ہیں کہ جائز حقوق اور جائز مطالبات تسلیم کر لئے جائیں اور جو مسائل درپیش ہیں وہ حل ہوں تاکہ آگ بھڑکنے کی بجائے بجھے۔ دباؤ ڈالنے میں ہمارے اور ان کے درمیان فرق ضرور ہوگا، لیکن دباؤ ڈالنا انہیں کا اجارہ نہیں۔

کاشتکاروں کے علاوہ محنت کش طبقوں کو بھی ہم منظم کرنا چاہتے ہیں، اور کوشش یہ کریں گے کہ دو الگ طبقوں کی دو

جداگانہ تنظیموں کے بجائے مشترک تنظیمیں قائم ہوں، جن کے ماتحت ایسے مصالحتی بورڈ بنائے جائیں جو مستاجروں کو آمادہ کریں کہ وہ بغیر پولیس اور قانون کے زور کے انصاف کو قبول کریں۔ لیکن اگر یہ لوگ مصالحانہ طریقوں سے اصلاح پر آمادہ نہ ہوں تو ان پر بھی ہم تمام ممکن اور جائز طریقوں سے دباؤ ڈالیں گے۔

اخلاقی فیاضی کی اہمیت | میں اس بات کی تشریح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم اخلاق کی اہمیت پر کیوں زور دیتے ہیں۔ دراصل روزمرہ کے انسانی معاملات میں کا جتنا دخل اخلاقی فیاضی کو ہے اتنا قانون کو نہیں ہے۔ اگر ایک میاں بیوی یہ طے کر لیں کہ وہ صرف قانون کے دیئے ہوئے حقوق پر معاملہ کریں گے اور ہر وقت وہ قانون کی کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے ہوں تو دو دن سے زیادہ نباہ ممکن نہیں ہے۔ انسانی زندگی اگر درست ہو سکتی ہے اور معاملات اگر درستی سے طے پا سکتے ہیں تو صرف اخلاقی فیاضی کے بل پر۔ اخلاقی فیاضی سے صالح تمدن پیدا ہوتا ہے جس میں کش مکش نہیں ہوتی بلکہ تعاون کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ قانون کے زور سے صالح تمدن پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سوسائٹی میں اخلاقی فیاضی پیدا کرنے کے لئے مسلسل کوشش کرنا چاہتے ہیں تاکہ لوگ صرف قانون کی کتاب اور لکھے ہوئے معاہدوں پر ہی ہر معاملے کا فیصلہ نہ کریں بلکہ باہم مصالحانہ طریقوں سے کام لیں۔ یہ سپرٹ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک خدا ترسی اور اخلاقی فضیلت لوگوں میں پیدا نہ ہو۔ پس ہماری اولین کوشش یہ ہے کہ جھگڑے جلدی سے جلدی نمٹیں اور لوگوں میں مصالحانہ تعلقات پیدا ہوں اور تمام معاملات زیادہ سے زیادہ صالح بنیادوں پر استوار ہوں۔

حضرات! یہ ہے وہ کام جسے ہم کرنا چاہتے ہیں

حرف آخر | اگر آپ کو یہ یقین ہے کہ یہ کام صحیح ہے تو پھر آپ کا اپنی جگہ پر بیٹھا رہ جانا غلط ہے۔ صدیوں سے یہ ایک کشمکش ہے جو سنت اور بدعت کے درمیان چلی آ رہی ہے اب ہر شخص کو فیصلہ کرنا چاہیئے کہ اس کا تعاون کس کے ساتھ ہے۔ یہ کشمکش اگر یونہی جاری رہی اور اہل سنت کے مقابلے میں بدعت کو پورے اختیارات اور اس کی جڑیں مضبوط ہو گئیں تو پھر یہاں بھی ترکی کے سے حالات رونما ہونگے کہ وہاں فریضۂ حج ۲۰ سال تک بند رہا اور اہل دین دم بخود بیٹھے رہے۔ مسلمان عورتیں غسل کے لباس میں علانیہ سمندروں کے کنارے غسل کرنے لگیں۔ اور مسلمان علماء کچھ نہ کر سکے۔

جن لوگوں کی ہمدردیاں بدعت کے ساتھ ہیں وہ پورے انشراح کے ساتھ اس کا ساتھ دیں لیکن جو لوگ سنت کے مسلک کو صحیح سمجھتے ہوں اور یہ بھی جانتے ہوں کہ ہم سنت ہی کو قائم کرنے کیلئے اٹھے ہیں ان کا فرض ہے کہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو اس مقصد پر صرف کریں

(مرتبہ فہیم صدیقی)

ہمیں کس مقام پر لا کے کھڑا کر دیا گیا ہے؟

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

مولانا نے اپنی یہ تقریر لاہور کے جلسۂ عام میں ۲۴- جولائی سنہ ۱۹۵۰ء کو پیش فرمائی تھی۔ اسے نوٹس کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ لیکن مولانا کو نظرثانی فرمانے کا وقت نہیں ملا۔ الفاظ میں ممکن ہے کہ کچھ تصرف ہو گیا ہو، لیکن مفہوم کو جوں کا توں پیش کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ مولانا کے اپنے الفاظ اور اسلوب کو زیادہ سے زیادہ حد تک برقرار رکھا جائے۔

(ن-ص)

بعد حمد و ثنا فرمایا:

حاضرین و حاضرات! ایک طویل مدت کے بعد پہلی مرتبہ موقع مل رہا ہے کہ آپ کے سامنے میں کچھ اظہارِ خیال کروں۔ قدرتی طور پر اس پہلے موقع کے تقاضے کی وجہ سے بیشمار باتیں دماغ کے سامنے ہیں، اور ہر بات مطالبہ کر رہی ہے کہ اسے آپ تک پہنچایا جائے۔ ان بیشمار باتوں میں سے اس مختصر سی فرصت میں تھوڑی سی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ بظاہر میرے لئے یہ انتخاب کرنا بھی مشکل ہے کہ کیا باتیں کہی جائیں اور کونسی باتیں نظرانداز کی جائیں۔ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ میرے بیان کے اندر آپ کو کچھ پریشانی اور انتشار محسوس ہو، لیکن طویل غیرحاضری کے بعد صورتِ حال کا یہ قدرتی تقاضا ہے۔

ایک معقول، سنجیدہ اور صحیح الدماغ آدمی کے لئے، صحیح اور معقول رویہ یہ ہے کہ کفر و ایمان اور اسلام اور جاہلیت میں سے جس پر اس کا قلب مطمئن ہو جائے، اپنی زندگی کی رہنمائی کے لئے اسی کو اختیار کر لے، اور پھر پوری عزیمت، پورے استقلال اور پوری مردانہ جرأت کے ساتھ اپنے آپ کو اس کی رہنمائی میں دے دے۔ وہ جس چیز کو

بھی قبول کرے، اس کے جو جو کچھ تقاضے اور مطالبے اس کے سامنے آئیں، انھیں جان کی بازی کھیل کر بھی پورا کرے۔ اخلاقی جرأت رکھنے والے آدمی کے لئے اس کے سوا اور کوئی رویہ نہیں ہو سکتا۔

حق و باطل سے قطع نظر یکسوئی خود ایک عظیم الشان طاقت ہے۔ دنیا میں اگر کسی مقصد کے حصول میں قابلِ ذکر کامیابی حاصل ہو سکتی ہے تو یکسوئی، استقلال اور عزیمت ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ آدمی اگر خدانخواستہ کفر کو بھی اختیار کرے، لیکن اس کفر کے مطالبے پورے کرنے کے لئے صحیح جرأت کا ثبوت دے، تو کفر اگرچہ کفر ہے اور خدا کو ناپسند ہے، لیکن استقلال و یکسوئی کے ساتھ اگر اسے اختیار کیا گیا ہو تو کفر بھی اس دنیا میں وہ سب کچھ دے سکتا ہے جو آج اس نے دنیا کی کافر قوموں کو دے رکھا ہے۔ لیکن اگر آپ آخری دین اسلام جیسی مبارک نعمت کو بھی اختیار کریں، مگر یکسوئی سے نہ کریں ——— تذبذب اور نفاق کے ساتھ اختیار کریں، پورے اعتماد کے ساتھ نہ کریں ——— تو اسلام جیسی نعمت کے ساتھ بھی نہ دنیا میں فائدہ ہو سکتا ہے، نہ آخرت میں! یہ طریقہ خسر الدنیا والآخرۃ کا طریقہ ہے۔ اس طریقے پر چلنے والے دنیا میں بھی ذلیل اور غیروں کے محکوم اور حاشیہ بردار ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ان کے لئے ذلت و نامرادی ہے۔

یہ شک اور عدم یکسوئی، یہ تھڑدلا پن اور بزدلی، اسے اگر آپ اسلامی اصطلاح میں سمجھنا چاہیں تو قرآن و حدیث میں اسے "نفاق" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آپ میں سے جو لوگ اسلامی اصطلاحات کی قدر و قیمت سے واقف ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ نفاق فرد میں پایا جائے یا جماعت میں، بدترین مہلک اور خطرناک بیماری ہے، لیکن یہ ان عام بیماریوں میں سے ہے جس میں ہر قوم کے بزدل افراد مبتلا ہوتے رہے ہیں۔

زندہ قوموں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جیسے وہ اپنے آپ کو سل اور دق کی بیماریوں سے بچانے کی کوشش کرتی ہیں، اسی طرح وہ نفاق، بزدلی اور عدم یکسوئی سے اپنے افراد کو بچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہیں۔ وہ اپنی ساری تمدنی، سیاسی، اور تعلیمی طاقتوں کو اس بات پر مرتکز کر دیتی ہیں کہ بزدل افراد کے اندر سے نفاق کی بیماری کو اکھیڑ دیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ دنیا کے پردے پر کوئی ایک قوم بھی ایسی مل سکتی ہے جو نفاق کو اپنا دین اور مسلک بنا کے چل رہی ہو، اسی کو وہ عین اپنی قومی پالیسی قرار دے اور اس کے سارے معاملات نفاق ہی کی رہنمائی میں انجام پائیں۔ میرا مطالعۂ تاریخ مجھے یہی بتاتا ہے کہ ایسی کوئی قوم کبھی نہیں گزری۔ ہر زندہ قوم نے نفاق اور تھڑدلے پن کی

بیماری کو دور کرنے اور یکسوئی اور یک جہتی پیدا کرنے کے لئے اپنی پوری کوششیں وقف کی ہیں۔

لیکن میں بڑے دکھ اور قلبی رنج کے ساتھ یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ اس آسمان کے نیچے اگر کوئی ایسی قوم ہے جس کے لیڈروں نے قومی پالیسی کو نفاق پر چلانے کا فیصلہ کیا ہے تو یہ سن کر دلوں کو پارہ پارہ ہو جانا چاہیے کہ وہ ہماری ہی قوم ہے۔ یہ درد اور غم شاید میری طرح آپ کو بھی بے چین کر دے گا، لیکن ہم پوری مستعدی اور یکجہتی کے ساتھ حالات کا جس طرح مطالعہ کر رہے ہیں وہ اسی کی شہادت دیتا ہے کہ اتنی بڑی ذلت اور اتنی بڑی مہلک بیماری کو ہمارے لیڈروں نے قومی پالیسی کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہے۔ میں آج آپ کے سامنے یہی چیز واضح کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں کہ آپ کے لیڈر آپ کے لئے کس چیز کو قومی پالیسی کی حیثیت سے سوچ رہے ہیں اور قوم کو کدھر ہانک کر لے جانا چاہتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ہمارے لیڈروں نے —— جنھیں آپ ہی نے لیڈر بنایا ہے —— من حیث الجماعت ٹھنڈے دل سے یہ طے کیا ہے کہ وہ زبان سے تو اسلام اسلام پکارتے چلے جائیں اور جگہ جگہ تقریروں میں یہ کہتے پھریں کہ اسلام ہی میں تمام مصیبتوں سے نجات ہے اور دنیا کی ساری مشکلات اسلام ہی سے حل ہوتی ہیں، پوری قوتِ بیان کے ساتھ بزرگ اسلاف کی مدح سرائی کریں، دنیا میں قرآن کا جھنڈا اونچا کرنے کا اعلان کرتے پھریں، اور قوم کو بھی یہی بلاوا دیں کہ اے قوم آ اور اسلام کی علمبرداری کر —— لیکن دوسری طرف اپنی قومی پالیسی اور سیاسی جدوجہد کا پورا زور اس مہم میں صرف کر دیں کہ قوم کو جاہلیت کی طرف، غیر اسلام کی طرف اور باطل کی طرف دھکیلا جائے۔

اس صورتِ حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ پوری قوم ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جس کے ایک کنارے کچھ لوگ ہیں جو اسے اسلام کی طرف بلا رہے ہیں اور دوسری طرف اس قوم کے لیڈر ہیں جو اسلام کے نام سے اسے جاہلیت اور کفر کی طرف دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ یہ جو کچھ ان حضرات نے شروع کیا ہے یہ ایک طرح کی اسلام بازی ہے۔ آپ کے لیڈروں کی کوشش یہ ہے کہ قوم پر اسلام کی دھونس جمائی جائے۔ چنانچہ ہر شخص اٹھ اٹھ کے اسلامی روایات کا حوالہ دیتا ہے، پورے جوش و خروش سے تاریخی واقعات یاد دلائے جا رہے ہیں اور پھر نہایت درجے کی بغزری اور غمگینی کے ساتھ اسلامی روایات کے تحفظ و بقا کا عہد کیا جاتا ہے، لیکن عملی پہلو کو اگر آپ دیکھیں تو

ہر معاملے میں ملک و ملت کو صریح جاہلیت کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ کیا اس سے زیادہ ذہنی انتشار پھیلانے والی کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ایک طرف سے وہ اسلام کی دعوت سن کر ایک قدم بڑھاتی ہے تو دوسری طرف سے زبردستی اس کا اٹھا ہوا قدم کفر کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔ جو قوم اس طرح سے ایک دوراہے پر تذبذب میں مبتلا کر دی گئی ہو اس مرحلے میں اگر اس پر کوئی نازک وقت آ گیا تو وہ آخر کس طرح خطرے کا مقابلہ کرے گی۔ ایک قوم جو کفر ہی پر یکسوئی سے قائم ہو وہ بہرحال بڑی سے بڑی آفت کا مقابلہ عزیمت کے ساتھ کر سکتی ہے۔ لیکن اگر اسلام کا نام لینے والوں کا حال یہ ہو کہ وہ ذہنی انتشار اور تذبذب میں مبتلا ہوں تو ان کا کسی خطرے سے عہدہ برآ ہونا مشتبہ ہے۔ یہ نہایت درجے افسوس کا مقام ہے کہ ہماری قوم کو اسی مقام پر لا کھڑا کر دیا گیا ہے۔

یہ صورتِ حالات جس میں آپ گھرے ہوئے ہیں، تقاضا کرتی ہے کہ آپ یکسو ہو کر سوچیں کہ کہاں کھڑے ہیں اور جانا کدھر ہے؟

اگر پوری صورتِ حالات کا ایمانداری کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور دل کو غلط فہمیوں سے الگ کر کے سوچا جائے تو یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ پاکستان جو آپ کا محبوب ملک ہے، اس کے لئے مطالبہ جو اٹھا تھا اس کو کشمیر سے راس کماری تک ہمہ گیر مقبولیت کیسے حاصل ہوئی تھی اور راس کا رمز کیا تھا کہ پوری قوم مل جل کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک ایک زبان سے پھر یہی صدا بلند ہونے لگی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مسلمان قوم کو اس کے لیڈروں نے متواتر یقین دلایا تھا کہ ہم اپنے دین اور ایمان کو باقی نہیں رکھ سکتے جب تک کہ ایک آزاد خطۂ زمین ہمیں حاصل نہ ہو۔ اس آزاد خطۂ زمین کو ہم اس لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں قرآن کا بتایا ہوا اسلامی نظام قائم کریں۔ یہی وہ جادو تھا جس نے پوری قوم کو مطالبۂ پاکستان کے لئے جمع کر دیا، اور پھر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوا کہ یہ مطالبہ مان لیا گیا اور پاکستان وجود میں آ گیا۔

لیکن جب پاکستان بن گیا تو ہمارے لیڈروں کی نیتیں بدل گئیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اب تک اسلام کا جو نام ہم لیتے رہے ہیں اور جو نعرے ہم لگاتے رہے ہیں وہ ہمارے لئے آفت بن جائیں گے۔ چنانچہ پاکستان بننے کے بعد اونچے درجے کے لیڈروں نے سیکولر اسٹیٹ کے قیام کا اظہار کرنا شروع کیا۔ لیکن قوم کے دل میں اسلام سے جو ہم سی محبت تھی اس کی وجہ سے وہ اس قسم کی چالوں کے ذریعے اپنے مقصد سے منحرف

ہونے والی نہیں تھی۔ اس طرح کے اعلانات پر صدائے احتجاج بلند ہوئی اور قوم نے دباؤ ڈال کر لیڈروں کو اپنا نظریہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔

شروع شروع میں قوم کو منحرف کرنے کے لئے طرح طرح کے بہانے گھڑے گئے۔ مثلاً کبھی کہا گیا کہ پاکستان ایک نوزائیدہ سلطنت ہے، یہ ایک طفلِ شیر خوار ہے اور ابھی اس پر بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔ یہ مضبوط ہو جائے تو پھر اسلامی نظام کا سوال چھیڑا جا سکتا ہے۔ کبھی کہا گیا کہ ملک کو نہ جانے کیا کیا سیاسی و معاشی الجھنیں درپیش ہیں اور ان کے حل ہونے سے پہلے اسلامی نظام کا مطالبہ ایک بے ہنگم چیز ہے۔ کبھی مہاجرین کے مسئلے کو عذر بنایا گیا، کبھی کشمیر کے مسئلے کی آڑ لی گئی اور کبھی پٹھانستان کے شوشے کو پیشِ نظر رکھ کے کہا گیا کہ ان خطرات کے ہوتے ہوئے نظامِ اسلامی کی راگنی بے وقت کی راگنی ہے۔

لیکن قوم ان باتوں سے مرعوب نہیں ہوئی بلکہ اپنے مطالبے پر اڑی رہی اور اس نے جواب میں صاف صاف کہا کہ ہم نے پہلے بھی کئی خطرات بھگت لئے ہیں، اور اب اگر کوئی اور خطرہ موجود ہے تو اس سے بھی نمٹ لیں گے آپ اسلامی نظام قائم تو کیجئے۔

پھر کہا گیا کہ اگر یہاں اسلامی نظام قائم کیا گیا تو ہندوستان جس میں کئی کروڑ مسلمان بستے ہیں، ان پر ہندو راج مسلط کر دیا جائے گا۔ لوگوں نے اسے بھی اہمیت نہیں دی بلکہ یہ کہا کہ جب ہم ایک مقصد کے لئے لاکھوں بھائی بہنوں کی جانوں اور ناموس کو قربان کر چکے ہیں تو اب کیا ان موہوم خطرات کی بنا پر اس سے دستبردار ہو جائیں۔

جب یہ افسوں بھی کارگر نہ ہوا تو دوسری نکتہ آفرینیاں شروع کی گئیں۔ کہا گیا کہ پہلے لائق بنو، پھر اسلامی نظام قائم کر کے دیا جا سکتا ہے (FIRST DESERVE, THEN DESIRE) ان حضرات کے اندازِ تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو اپنی جگہ مثیلِ فاروقؓ اور نمونۂ صدیقِ اکبرؓ بن چکے ہیں اور اسلام جو کچھ چاہتا ہے اسے پورا کرنے کے لئے ان کی بیقراریوں اور پریشانیوں کی کوئی حد نہیں، لیکن ان کی اصل مشکل یہ ہے کہ قوم اسلامی نظام کے قابل نہیں۔ جس دن قوم اس لائق بن جائے گی اس دن اسلامی نظام [illegible] قائم ہو جائے گا۔

ان حضرات نے خود اپنی فاسقانہ زندگیوں کا جائزہ لے کر نہیں دیکھا کہ ہم اور ہمارے اہل و عیال دینِ حق سے کتنی دور ہیں۔ انگریزی تہذیب و تمدن کی پرستش میں کس حد تک مبتلا ہیں اور اسلامی روایات کو پامال کرنے میں

کتنے بیباک ہیں۔

دراصل ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارے سینما گھر تو یونہی رہیں گے، ہم بے پردگی کی تحریکیں یونہی چلاتے رہیں گے، ہمارے زیرِ اہتمام مردوں اور عورتوں کے مخلوط اجتماعات یونہی ہوتے رہیں گے اور ہم مبل چوہدری کے رقص کی سرپرستی یونہی کرتے رہیں گے ــــــ لیکن قوم سے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ تم جاؤ اور صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے نمونے بن کر دکھاؤ، تو پھر اس کے بعد ہمارے پاس اسلامی نظام کا مطالبہ لے کر آنا۔

اس پر ہم نے کہا کہ حضرت! ہوش کے ناخن لیجئے۔ قوم میں اگر دس فی صدی خرابیاں ہیں تو آپ میں نوے فی صدی ہیں۔ آپ اپنی فکر کیجئے۔ قوم میں جو کچھ خرابیاں ہیں وہ نتیجہ ہیں جہالت کا، لیکن آپ تو جان بوجھ کر اپنے لئے اسلام سے انحراف کا راستہ پسند کر رہے ہیں۔ پھر قوم اپنی اصلاح کرنا چاہتی ہے، لیکن آپ اس پر مسلسل غلط پرتو ڈال رہے ہیں۔ براہِ کرم اپنے آپ کو درست کیجئے۔

وہ نکتہ آفرینیاں کرتے رہے اور ہم جواب دیتے۔ بالآخر حق غالب آیا اور رائے عام نے دباؤ ڈال کر قرار دادِ مقاصد ان حضرات کے حلق سے اگلوا لی۔ یہ اقرار در حقیقت برضا و رغبت نہ تھا، یہ ان سے اگلوایا گیا ہے۔ قوم نے تابڑ توڑ مطالبے کئے، وہ اپنی بات پر ڈٹ گئی اور اکابر کو مجبور کر کے کہا کہ قرار دادِ مقاصد پاس کرو۔ یہ ان کی طرف سے بادلِ ناخواستہ مجبورانہ اقرار تھا، لیکن فی الواقع ہم یہی چاہتے تھے کہ یہ لیڈر لوگ درست ہو جائیں، اپنی اصلاح کریں، انہی کے ہاتھوں سے اسلامی نظام قائم ہو اور یہی آئندہ مرحلوں میں بھی قوم کی قیادت کریں۔ ہم نے اپنا فرض سمجھا کہ پورے شرحِ صدر اور پورے حسنِ ظن کے ساتھ ان کے اس اعلان کا خیر مقدم کریں۔ جس دن انھوں نے یہ کام کیا اس دن سے ہم نے ان کی مدح سرائیاں کیں، ان کی تعریف کے پُل باندھے اور دل و جان سے ان کو مبارکباد دی۔ ملتان کے جیل خانے میں جب ہم کو اول اول یہ خبر ملی تو ہم نے یہی محسوس کیا کہ اس سے مبارک کوئی کام نہیں کہ قوم نے دستوریہ کی زبان سے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ پڑھا۔ ہم نے پوری خوش گمانی کے ساتھ اس اعلان میں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے وہ معنی نکالے کہ جن سے ان کا حسنِ نیت ثابت ہو۔ اگرچہ بار بار ہمارے کانوں میں یہ بات ڈالی گئی کہ یہ اعلان منافقانہ ہے اور ایسے لوگوں نے قرار دادِ مقاصد پاس کی ہے جن کی اپنی زندگیاں اس قرار داد کے صریحاً منافی ہیں، لیکن ہم نے کہا کہ کیا عجب ہو خدا انہی سے یہ کام کرالے۔ اگر ایسا ہو تو ہم سے

زیادہ خوش کون ہوگا۔ ہم ان کی رکابیں تھام کے چلیں گے اور ان کے احکام کی اس طرح تعمیل کریں گے جیسے شریعت اسلامی کی رو سے امیر المومنین کی کرنی چاہیے۔ ہم اپنی اطاعت کی باگیں دینِ حق کی حدود میں ان کے حوالے کرکے مطمئن ہو جائیں گے۔

لیکن یہ ایک دردانگیز حقیقت ہے کہ قرارداد مقاصد پاس کرنے کے بعد بھی ان حضرات کی نیتیں نہیں بدلیں۔ کیا بعد کے واقعات نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ قرارداد مقاصد ان کے حلق سے زبردستی اگلوائی گئی تھی؟ اس قرارداد کا کوئی پرتو ان کی زندگیوں پر نہیں پڑا۔ بلکہ اسے پاس کرنے کے بعد پھر انہوں نے طرح طرح کے شگوفے چھوڑنے شروع کیے اور پھر نکتہ آفرینیوں میں نئے نئے لطائف کے، سلسلے ہونے لگے۔

ایک نکتۂ بدیع و لطیف یہ پیش کیا گیا کہ اسلام تو متحرک ہے۔ ہم حیران تھے کہ اس اشارے کا مطلب کیا ہے؟ اول اول کچھ سمجھ میں نہیں آیا جب ان حضرات کی طرف سے اس کی تشریح کی گئی تو ہم حیران رہ گئے۔ مبتدا کیا تھا اور خبر کیا نکلی۔ معلوم ہوا کہ اسلام کے متحرک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ حضرات اپنی فاسقانہ زندگی میں جس کا ایک ایک شعبہ اسلام سے ہٹا ہوا ہے، جو جو حرکتیں کرتے ہیں اسلام ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور ان حرکتوں کے لئے سندِ جواز بنتا جاتا ہے۔ اگر یہ شراب پینے لگیں تو اسلام ان کے ساتھ جا کر عرض کرتا ہے کہ حضور مجھے آپ کی طرف سے ذرہ بھر بھی ملالِ خاطر گوارا نہیں، یہ تو میں نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ایک مرتبہ کہہ دیا تھا کہ شراب حرام ہے، لیکن اب اگر آپ آگے بڑھ گئے ہیں تو ان پرانی باتوں پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ اگر زنا کرنا چاہیں تو اسلام ہاتھ باندھے ہوئے ان سے درخواست کرتا ہے کہ حضور سوئے ظن میں مبتلا نہ ہوں، میں کوئی جامد ملا تھوڑی ہوں کہ اس روشن زمانے میں آپ سے کہوں کہ زنا حرام ہے۔ میں تو متحرک ہوں، جہاں آپ جائیں، ایک غلام کی طرح میں ساتھ ہوں۔ آپ شوق سے شغل فرمایئے۔

اسلام کو جب اس طرح متحرک بنا دیا گیا تو آپ کو معلوم ہے کہ بے پردگی کی تحریک کے لئے ان مفتیانِ دین نے جو جو فتوے دیئے اور جس جس طرح کے نکتے نکالے ان سب کو کس طرح عینِ اسلام قرار دیا گیا۔

لیکن جب ان کو یہ اندازہ ہوا کہ اگرچہ اسلام کا متحرک ہونا ثابت کیا جا چکا ہے۔ تاہم قوم نے ہماری حرکتوں کو جائز تسلیم نہیں کیا تو پھر ان کے اندر سے نئے نئے جغادری مفتی اور نکتہ آفریں فلسفی اٹھے اور انہوں نے کہنا شروع کیا کہ اسلامی نظام بڑی مبارک چیز ہے، لیکن جانتے ہو کہ اسلام کی تاریخ کا سب سے زیادہ مبارک دور کونسا ہے؟

ـــــــــ وہ بنو امیہ کا دور ہے! اسی دور میں اسلام اپنے اصل عروج کو پہنچا۔ یہ وہ دور ہے جس کی روایات کو نمونہ بنانا چاہیے۔

آج تک تو ہم یہ جانتے تھے کہ بنو امیہ کا دور وہ دور ہے جس میں اسلام کی بنیادیں ہلا دی گئی تھیں۔ یہ بنو امیہ ہی کا دور تھا جس میں اسلامی حکومت اور فرمانروائی کے سارے اصول مٹ گئے۔

اب آپ سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے آپ کی اسلامی تہذیب کا زرین دور۔ یہ دعوے آپ کے اعزام نے بھرے بھولاں بن گئے ہیں۔ ان باتوں کے کہنے کے لئے باہر سے بڑے بڑے جغادری مرشد درآمد (IMPORT) کئے گئے ہیں تاکہ وہ قوم کے سامنے اسلامی تہذیب کے وعظ ارشاد فرمائیں۔

بنی امیہ کا دور جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی، اور جسے "ملکِ عضوض" کے لفظ سے تعبیر کیا جس میں حجاج اور ابن جبیرہ جیسے درندے اقتدار پر آئے اور انھوں نے خاندانِ رسالت کے خیمے اکھیڑ کر ہوا میں اڑا دیئے اور خلافتِ راشدہ کی مقدس تاریخ کے ایک ایک نشان کو مٹا دیا، اس دور کے متعلق ہمیں آج یہ سکھایا جاتا ہے کہ تاریخ اسلام کا روشن زرین دور کوئی ہو سکتا ہے تو یہی ہے۔ کیونکہ ان کی نگاہ میں اسی دور میں اسلام کی بنیادیں مضبوطی اور وسعت کے ساتھ رکھی گئی تھیں اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ریسرچ اکاڈمیوں کو ہدایت کریں کہ وہ دستور متعین کرنے کے لئے اپنی ساری توجہات اسی دور پر مرتکز کریں۔

یہ ایک دوسری چال تھی، لیکن ظاہر ہے کہ ہماری مسلمان قوم کتنی ہی جاہل اور دین سے نابلد کیوں نہ ہو ـــــــ ہمارے اکابر کے سوا ـــــــ سب لوگ اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ یہ دور وہ ہے جس نے اسلامی نظام کے سارے مبارک نقوش مٹا ڈالے۔

چنانچہ جب یہ افسوں بھی نہ چلا تو بعض حلقوں سے یہ نکتہ اچھالا گیا کہ اسلام میں تو قانون کے ماخذیں سے ایک اہم ماخذ اجماع ہے جو قانون سازی کا بنیادی اصول ہے۔ مسلمان قوم کے منتخب نمائندے جس بات پر اتفاق رائے کرلیں ـــــــ چاہے وہ پورے قرآن کو منسوخ کر دیں اور پورے دفترِ حدیث پر قلم پھیر دیں ـــــــ

وہ فیصلہ بہر حال شرعی قانون ہے۔ یہ اس درجے کی جرأت ہے کہ ایسی جرأت ابلیس بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن الحمد للہ کہ اس زمین میں ایمان کا نمک کچھ نہ کچھ موجود ہے جس کی وجہ سے یہ فتنہ جڑ نہیں پکڑ سکا۔

اس کے بعد جب یہ لوگ بے بس ہو گئے تو پھر انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ گھبرائیے نہیں، اسلامی نظام تو قائم ہو گا ہی، مگر کچھ خبر بھی ہے کہ اسلامی نظام اور امریکہ و برطانیہ کی جمہوریت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ آپ کی دستوریہ کے اکابر اٹھے اور انھوں نے امریکہ اور برطانیہ کی طرف جھانکنا شروع کیا اور تحقیق ہونے لگی کہ یہ نظام اسلام سے قریب تر ہے یا وہ نظام۔ اسلامی دستور بنانے کے لئے ان کی نگاہیں قرآن و حدیث کی طرف نہیں اٹھیں، خدا کے گھر کی طرف ان کا منہ نہیں مڑا۔ اسلامی تاریخ کی روایات کی طرف توجہ نہیں ہوئی، بس لے دے کے اسلامی دستور کا سرچشمہ کوئی نظر آیا تو صرف ایک انگلستان اور امریکہ نظر آیا۔

پھر آپ کی دستوریہ کے سیکرٹری صاحب نے اسلامی دستور پر جو مقالہ لکھا ہے وہ بجائے خود ایک شاہکار ہے، میں نے اسے خود پڑھا ہے، اور بغیر کسی شائبۂ بدگمانی کے کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی کٹر سے کٹر اور جاہل سے جاہل مستشرق بھی ان خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا جس قسم کے جاہلانہ خیالات کا اظہار اس مقالے میں کیا گیا ہے۔ آپ کے یہ سیکرٹری صاحب یہاں تک کہہ گزرے ہیں کہ ایک فرد واحد کی زندگی اس کے لئے کافی نہیں ہے کہ اسے ہمیشہ کے لئے ماخذِ قانون بنا لیا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کھلی ہوئی توہین ہے اور ایسا کہنا سراسر جہالت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اور آپ کی ایک ایک چیز ہمارے لئے ہدایت اور قانون ہے۔ قوم کا یہی عقیدہ اور یہی ایمان تھا جس نے اس فتنے کو بھی سر اٹھانے ہی ناکام کر دیا۔

اب انھوں نے آخری حربہ یہ نکالا ہے کہ قوم کو دھوکا دینے کے لئے چند تنخواہ دار مولوی مقرر کر لئے ہیں اور ان کے سپرد یہ کام کیا ہے کہ آپ حضرات جس مسئلہ میں ہم چاہیں اس کے متعلق مشورے دیتے رہیں لیکن ان مشوروں میں سے جس قدر ہماری مرضی ہو گی ہم قبول کریں گے اور جن کو اور جس قدر ہم چاہیں گے رد کر دیں گے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ ہمارے بعض بزرگ لوگ تک اس دھوکے میں آ گئے ہیں اور انھوں نے اس کمتری کے ساتھ اسلام کی ترجمانی کا کام اپنے ذمے لے لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ کوئی معمولی ڈاکٹر یا حکیم بھی اس بات کے لئے رضامند نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مریض کا اس شرط پر علاج

کرے کہ قبلہ مریض صاحب آپ میری جس دوا کو چاہیں اور جس طرح چاہیں استعمال کریں اور جب کو چاہیں میرے منہ پر دے ماریں اور نسخہ پھاڑ کر پھینک دیں میں کہتا ہوں کہ کوئی ڈاکٹر یا حکیم تو درکنار کوئی گھٹیا سے گھٹیا عطائی بھی اس ذلت کو گوارا نہیں کر سکتا لیکن یہ بہرحال ایک واقعہ ہے کہ ہمارے بعض بزرگوں نے اسی پوزیشن کو اپنے لئے پسند کر لیا ہے کہ وہ ان حضرات کو اسلام کی روشنی میں مشورے عرض کرتے رہیں گے اور اس "کمترینی" کے ساتھ عرض کرتے رہیں گے کہ "حضور والا اگر مرضیٔ مبارک ہو تو ان نمک خواروں کے ناچیز مشوروں پر غور فرما لیجئے اور اگر وہ مرضیٔ معلّٰی کے موافق نہ ہوں تو رد کر دیجئے یا حسبِ منشا ان میں ترمیم فرما لیجئے۔

میں پوری صفائی کے ساتھ اس بات کو کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے۔ یہ لوگ آخر میں قوم سے کہیں گے کہ دیکھئے ہم نے اسلامی نظام کے ماہرین سے مشوروں کے بعد یہ دستور بنایا ہے لیکن اللہ نے چاہا تو ہم ان کے اس دھوکے کو نہیں چلنے دیں گے اور اپنی قوم کو ہر قدم اور ہر مرحلے پر اصل صورتِ حال سے مطلع رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔

اب آپ اچھی طرح جائزہ لیجئے کہ آپ کو کس جگہ لا کے کھڑا کر دیا گیا ہے؟ آپ جہاں آزادی سے پہلے تھے اس سے آگے بڑھے ہیں یا پیچھے ہٹے ہیں؟ —— اگر آپ اس سوال کے جواب میں میرے تبصرے کو قبول فرمائیں تو میں آپ کی خدمت میں بلا مبالغہ یہ عرض کروں گا کہ آپ آزادی سے پہلے جس مقام پر تھے اس سے آپ نے ترقیٔ معکوس کی ہے۔ آپ کا جو قدم بھی اٹھا ہے وہ قومی خودداری اور اسلامی روایات کے بالکل مخالف سمت میں اٹھا ہے، اور اس سے دینِ مبارک بھی مجروح ہوا ہے اور قومی خودداری کو بھی نقصان پہنچا ہے، آپ کی سیاسی، معاشرتی، سماجی اور مذہبی زندگی کو اس دوران میں بڑے بڑے چرکے لگے ہیں۔ زندگی کے ان سارے پہلوؤں میں عظیم الشان رخنے پیدا ہو گئے ہیں اور ہمارے مقاصد پر خوفناک زد پڑی ہے۔ آیئے اور پوری سنجیدگی سے حالات کا جائزہ لیجئے۔

اولاً آپ اپنی سیاسی زندگی کو لیجئے۔ اس کے دو حصے ہیں: داخلی اور خارجی۔

اگر آپ اپنی داخلی سیاست پر غور کریں گے تو میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ یہ ٹھیک ٹھیک لفظوں میں سابق حکمرانوں کی نہایت درجہ بھونڈی نقالی پر مبنی ہے —— میں اس موقع پر لفظ "بھونڈی" کو خوب سوچ سمجھ کر اور پورا زور دے کر استعمال کر رہا ہوں —— ہمارے "دیسی صاحبوں" نے ولایتی

صاحبوں" کی نقل اتارنے کی کوشش کی ہے اور فی الواقع نہایت بھونڈی کوشش کی ہے۔

ایک اسلامی نظام، بلکہ اس سے بھی نیچے ایک قومی (NATIONAL) نظام کے اندر قوم کے لیڈر کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ وہ خدمتِ خلق کے ذریعے اپنا رعب قائم کرے۔ لوگوں کی مشکلات اور دشواریوں کا حل ڈھونڈے، لوگوں کے مطالبات کو پورا کرے اور ان کے قومی جذبات کے تقاضوں کا احترام کرے۔ یہ وہ صحیح راستہ ہوتا ہے جس سے آزاد قوموں کے لیڈر پبلک کے دلوں میں گھسا کرتے ہیں۔ اگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر قوم جان دیتی تھی تو اس کا اصل راز یہی تھا۔ لیکن انگریز چونکہ "غیر" تھا اسے ہم پر رعب جمانے کے لئے ٹھاٹھ باٹھ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اسے "ہٹو بچو" کا اہتمام کرنا پڑتا تھا، وہ مسلح باڈی گارڈز کا محتاج تھا تاکہ وہ جدھر نکلے، زمین کانپ اٹھے اور آسمان دہل جائے۔ بیرونی "بیوروکریسی" کیلئے ممکن العمل طریق کار یہی تھا۔

اب آپ سوچئے کہ کیا آپ کے موجودہ فرمانرواؤں کے سوا کوئی اور تدبیر ایجاد کر سکے؟ وہی کر و فر، وہی ہٹو بچو، وہی ٹھاٹھ باٹھ آپ کے حکام عالی مقام نے اختیار کر رکھے ہیں، ان میں یک سر مو فرق نہیں آیا۔ کیا ایک اسلامی حکومت کے حکام کو یہی کرنا چاہئے؟ ہمارے ان حکام عالی مقام کی کبھی گزرتی ہوئی ٹشتوں تک دیکھا جائے، انگریز نے قومی روایات کے تقاضے ان کے اندر سے کھرچ کر نکال دیئے ہیں۔ یہ ایک بیرونی طاقت کا طریقہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے استبداد کو مسلط کرنے کے لئے عوام کے سروں کو توڑائے اور پورے فسطائی اور نازی ہتھکنڈے اور پوری شیطانی قوتیں استعمال کر کے رائے عام کو دبائے۔ اسی طریقے کو ہمارے لیڈروں نے پسند کیا ہے۔

اس کی ایک نمایاں مثال آپ کا سیفٹی ایکٹ ہے۔ یہ ایکٹ اس لئے بنایا گیا تھا کہ غیر ملکی اقتدار نے محسوس کیا کہ اس کے قائم رہنے کے لئے قانون و عدالت کا نظام کافی نہیں ہے بلکہ ناگزیر ہے کہ رائے عام کو جبر سے دبایا جائے۔ پھر کیا انگریز کے جانے کے بعد ہمارے لیڈروں نے رائے عام کی حوصلہ افزائی کے لئے کچھ بھی اقدام کیا؟ کیا آزادئ رائے کے کسی ایک دریچے کو بھی کھولا؟ انگریز کا کوئی ایک قانون بھی بدلا اور کوئی ایک طریقہ بھی منسوخ کیا؟ جتنی تلواریں سابق حکومت نے بنائی تھیں کیا ان میں سے کوئی ایک بھی کند ہوئی؟ کیا ان میں سے جو ہتھیار زنگ آلود ہو گئے تھے ان کو پورے اہتمام سے سان پر رکھ کر از سر نو

تیز نہیں کیا گیا؟ ـــــ انھوں نے سیفٹی ایکٹ کو منسوخ کرنے کے بجائے اُلٹا اس پر سیفٹی آرڈی ننس کا اضافہ کیا اور پھر ان ظالمانہ قوانین کے کمزور پہلوؤں کو نت نئی ترمیموں سے مضبوط تر کیا، تاکہ انسانی آزادی کا قتلِ عام خوب اچھی طرح کیا جا سکے۔

پھر کیا اس گورنمنٹ کے لئے کہ جو گورنمنٹ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کی دعویدار ہو اور اسلامی نظام قائم کرنے کی علمبردار بنے، صحیح روش یہی ہے؟

سابق حکومت نے معاشی و معاشرتی اونچ نیچ کا بہت ہی مکروہ نظام اپنے ترکے میں چھوڑا ہے، ہمارے حکمرانوں نے اسے ایک مقدس ورثے کی حیثیت سے جوں کا توں قبول کر لیا ہے، بلکہ اس مکروہ نظام کی ہر چیز کو اور زیادہ پالش کر کے نمایاں کیا جا رہا ہے۔ ان حضرات کو خبر ہی نہیں کہ وقت کے تقاضے کیا ہیں اور کمیونزم ملک کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ "اسلام، اسلام" پکارا تو بہت جا رہا ہے لیکن ان کو یہ سرے سے معلوم نہیں کہ وہ ہوتا کیا ہے۔

اس صورتِ حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف ریاستی اقتدار، رئیسوں کی حکومت اور دلی عہدی کے نظام کی ہر جگہ حمایت و سرپرستی کی جا رہی ہے، اور دوسری طرف معاشرتی اونچ نیچ بدستور ہے، زندگی میں وہی ناقابلِ برداشت تفاوت موجود ہے، اور اس طرح کمیونزم کو دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ آئے اور سارے نظامِ تمدن کو تہ و بالا کر دے۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ ان کارگزاریوں کے ساتھ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے کس چیز پر اعتماد کیا جا رہا ہے؟ ـــــ ان کے سامنے صرف ایک اصول ہے، اور وہ یہ ہے کہ پبلک کا حافظہ کمزور ہوتا ہے، انھیں یقین ہے کہ اگر کوئی آواز ان کے خلاف اٹھے گی تو وہ کچھ دیر فضا میں گونج کر آہستہ آہستہ خود بخود ختم ہو جائے گی، اخبارات شور مچائیں گے، لیکن وہ بھی ٹائیں ٹائیں فش کر کے رہ جائیں گے۔ آپ کے وزیراعظم کو پورا پورا اعتماد ہے کہ وہ کچھ کر ڈالیں، اُن کے خلاف کوئی صدائے احتجاج نہیں اٹھ سکتی۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آپ کی داخلی سیاست اس طرز پر چل رہی ہے؟

اب بیرونی سیاست کو لیجئے۔

ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں گزری کہ آپ نے من حیث القوم خدا تعالیٰ کی فرمانروائی اور ہر دوسری طاقت سے قوم کی آزادی کا اعلان بڑے طنطنے کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن آپ ابھی تک کامن ویلتھ کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں اور تاج برطانیہ کے اسی طرح وفادار ہیں جس طرح کامن ویلتھ سے تعلق رکھنے والے دوسرے ممالک۔ آج بھی آپ کا نشانِ عزت ملکِ معظم کا وجود ہے۔ تاج برطانیہ کی وفاداری میں شاید خود اُس تاج کے پرستارانِ اول اتنے مخلص نہ ہوں جتنے یہ ہمارے حکمران مخلص ہیں۔ کیا خدا کی بادشاہت کے اعلان کے یہی معنیٰ ہیں اور کیا یہی کچھ ہے آپ کی آزادی؟

بیرونی دنیا میں آپ کی حیثیت اس سے زاید کچھ نہیں ہے کہ آپ اینگلو امریکن بلاک کے حاشیہ بردار ہیں۔ اُدھر سے شہنشاہی اغراض کے تحت کوئی پالیسی طے ہوتی ہے اور اِدھر سے ہمارے لیڈر صاحبان ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ پاکستان امن قائم کرنے کی کوششوں میں پورا پورا حصہ لے گا۔ وہی بات کہ "بلبل ہمیں کہ قافیہ گُل شود بس است۔"

جو کچھ وہاں سے اشارہ ہوتا ہے اس پر بلا چون و چرا "آمنّا و صدّقنا" کا اقرار کیا جاتا ہے، سوچنا اُن کا کام ہے عمل کرنا اِن کا کام ہے۔ جس سے اُن کی جنگ اُس سے اِن کی جنگ، جس سے اُن کی صلح اُس سے اِن کی صلح۔ امریکہ اور برطانیہ ہی تو ہمارے وہ سرچشمے (SOURCES) ہیں جن سے الہام نازل ہوتا ہے، جن سے اسلحہ آتا ہے اور جن سے سرمایہ ملتا ہے۔ وہ تمام اقتصادی اور سیاسی بندھن جو اہلِ مغرب نے اسلامی اور ایشیائی ملکوں کے لئے تیار کئے ہیں، وہ پاکستان پر انھیں زبردستی نہیں لاد رہے ہیں، بلکہ یہ ہمارے اپنے آقایانِ کرام ان کو بلا بلا کے اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ یہ بیڑیاں ہمیں پہنا جاؤ۔

امریکہ نے کوریا میں نہایت بھونڈی اغراض کے لئے جنگ کرنے کا اعلان کیا تو یہ حضرات بھی پوری شانِ وفاداری کے ساتھ آگے بڑھے اور انھوں نے بھی کہا کہ پاکستان ہمہ تن آپ کے ساتھ ہے یعنی ہم بھی پانچوں سواروں میں شامل ہیں۔

اب ذرا ہندوستان کے مسئلے کو لیجئے۔ ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات اچھے سے اچھے ہوں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کے لئے بھی اور خود اپنے ملک کی بھلائی کے لئے بھی ہم سے

(بقیہ بر صفحہ ۲۸۴)

رسائل و مسائل

قرارداد مقاصد اور ہمارا آئندہ دستور

سوال :-

مجلس دستور ساز پاکستان کی منظور کردہ قرارداد مقاصد متعلقہ دستور پاکستان میں ایک شق حسب ذیل ہے۔

"جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی کو اسلامی تعلیمات اور مقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنتِ رسول میں متعین ہیں، ترتیب دے سکیں۔"

اس کام کا اصل تعلق تو دراصل حکومت کے انتظامی امور سے ہے۔ کہ وہ اس کے لئے کیا کیا اقدام کرتی ہے۔ قانونی طور پر حکومت کو مجبور کرنے نیز اس سلسلہ میں غفلت یا عدم تعاون یا معاندانہ رویہ اختیار کرنے کی صورت میں دستور میں کیا کیا (Provisions) ہونی چاہئیں کہ یہ مقصد بخوبی بروئے کار آ جائے نیز دستوری طور پر حکومت کو اس سلسلہ میں غفلت برتنے، عدم تعاون یا معاندانہ رویہ اختیار کرنے کی صورت میں کس طرح سے روکا جا سکے۔ اور ایک شہری کو حکومت کے خلاف عدلیہ کے سامنے اس بات کو لانے کے لئے کیا کیا تدابیر ہونی چاہئیں۔

جواب :-

آپ کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ ان دو بنیادی غلط فہمیوں کو دور کر دیا جائے جن پر یہ سوالات مبنی ہیں۔

پہلی غلط فہمی جو آپ کے سوالات میں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ آپ قرارداد مقاصد کو ایک قابلِ تجزیہ چیز سمجھ رہے ہیں۔ اور آپ کا گمان یہ ہے کہ اس کی مختلف شقوں کے کچھ الگ الگ تقاضے اور مطالبات ہیں جن کو پورا کرنے کے لئے زیرِ ترتیب دستور میں کچھ جدا جدا آئینی صورتیں تجویز کی جانی چاہئیں حالانکہ

دراصل یہ قراردادِ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ جس کا بحیثیت مجموعی ایک مزاج اور ایک ہی منشا ہے اور وہی منشا اور مزاج اس کی ہر شق کا ہے۔ اس کی کسی شق کو بھی صحیح طور پر جامۂ عمل نہیں پہنایا جا سکتا جب تک کہ ہماری مملکت کا پورا دستور اس قرارداد کے منشا اور مزاج کے مطابق ڈھلا ہوا نہ ہو۔ اور اس کی ہر شق بنا حق پا سکتی ہے اگر یہ پوری قرارداد اپنی اصلی روح کے ساتھ دستورِ مملکت کی شکل اختیار کرے۔

دوسری غلط فہمی آپ کے سوالات میں یہ نظر آتی ہے کہ اگر پوری قرارداد کے معاملہ میں نہیں تو کم از کم قرارداد کی اس شق کے معاملہ میں تو آپ صریحاً جو کچھ سوچ رہے ہیں محض تحفظ اور تدارک کے نقطۂ نظر سے سوچ رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارے سامنے اصل سوال قراردادِ مقاصد کو اس کے تمام اجزاء سمیت نافذ کرنے کا ہے۔ نہ کہ اس سے یا اس کی کسی شق سے قرآن کی روک تھام کرنے کا۔ قراردادِ مقاصد ریاست پاکستان کو اصولی ریاست (Ideological State) کی حیثیت دے چکی ہے۔ اور اس نے قطعی طور پر وہ آئیڈیالوجی بھی متعین کر دی ہے۔ جس پر اس ریاست کی بنیاد قائم ہے۔ اس کے بعد جو کام ہمیں کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی مملکت کا دستور اس طرح مرتب کریں کہ اس کے ماتحت جو حکومت بنے اس کا سارا نظام اس آئیڈیالوجی کو نافذ کرنے والا ہو۔ یہ کام اگر ہم نے صحیح طور پر کر لیا تو قراردادِ مقاصد کی ہر شق اسی بنیادی آئیڈیالوجی کے مطابق جامۂ عمل پہن لے گی، اور اس صورت میں کسی خاص شق کے لئے الگ تحفظات کی ضرورت نہ رہے گی۔ بلکہ سب کے لئے وہی تحفظات کافی ہوں گے جو پورے دستور کی حفاظت کے لئے ہر دستور میں رکھے جاتے ہیں۔

ان غلط فہمیوں کے رفع ہو جانے کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ محض شق (ھ) کے لئے تحفظات تجویز کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ نہ اس طرز پر سوچنے سے ہم کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں اس کے بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم نے قراردادِ مقاصد میں جس آئیڈیالوجی کو اپنی مملکت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ وہ بجائے خود کیا ہے، اس کو قراردادِ مقاصد کی مختلف شقوں کے ساتھ کیا تعلق ہے اور اس کو دستور میں ثبت کرنے کی صورت کیا ہے: اس چیز کو اگر اچھی طرح سمجھ کر زیرِ ترتیب دستور میں ٹھیک ٹھیک ثبت کر دیا جائے گا تو قراردادِ مقاصد کی دوسری شقوں کی طرح شق (ھ) کے منشا کو بھی

ہمارا سارا انتظام حکومت بحیثیت مجموعی پورا کرے گا۔ اور اس کے لئے الگ تدابیر (Provisions) کی بہت کم ضرورت باقی رہے گی۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا، تو پھر خواہ آپ کتنے ہی تحفظات تجویز کریں اور تدارک کی کتنی ہی صورتیں رکھ دیں، نظام حکومت کی پوری مشین اس مقصد کے خلاف چلے گی جیسے شق (ے) میں بیان کیا گیا ہے۔

(۱) قرارداد مقاصد جس آئیڈیالوجی پر مبنی ہے اس کا اقرار و اعلان اس قرارداد کے دیباچہ میں کر دیا گیا ہے۔ اور وہ حسب ذیل اجزاء ترکیبی پر مشتمل ہے۔

اول یہ کہ "حاکمیت ساری کائنات پر صرف اللہ وحدہٗ لا شریک کی ہے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خود پاکستان کی حاکمیت بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہے، کوئی خاندان، طبقہ، نسل، قوم یا باشندگان پاکستان کا مجموعہ اس حاکمیت کا حامل نہیں ہے۔

دوم یہ کہ ریاست پاکستان کو جو اقتدار حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کا تفویض کردہ ہے اور اس کی طرف سے ایک "مقدس امانت" (Sacred Trust) کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ریاست اپنے مستقل بالذات اقتدار کی مدعی نہیں ہے بلکہ وہ اس مملکت میں اصل مقتدر اعلیٰ، یعنی رب العالمین کی نائب، خلیفہ اور امین کی حیثیت سے کام کرے گی۔

سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اقتدار اس ریاست کے حکمرانوں کو براہ راست نہیں سونپ دیا ہے، بلکہ پاکستان کے باشندوں کے ذریعے سے سونپا ہے۔ بالفاظ دیگر اس امانت اقتدار کے اور اس خلافت و نیابت کے اصل حامل جمہور پاکستان ہیں۔ اور وہی اس اقتدار کو ان لوگوں کے حوالے کریں گے جنہیں وہ ریاست کا انتظام چلانے کے لئے پسند کریں۔ یہ چیز اسلامی جمہوریت کو ایک طرف مغربی طرز کی جمہوریت سے ممیز کر دیتی ہے اور دوسری طرف پاپائی تھیوکریسی سے۔

چہارم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ریاست پاکستان کو اس کے باشندوں کے ذریعہ سے جو اختیارات سونپے ہیں وہ اس لئے سونپے ہیں کہ وہ ان کو اس کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر استعمال کرے

اب یہ ظاہر ہے کہ ہم کو اللہ کی مقرر کردہ حدود کا علم اس کی کتاب اور اس کے رسول کی ہدایت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، اس لئے لامحالہ اس فقرے کا منشا یہ ہے کہ ریاست پاکستان اپنے ان مفوضہ اختیارات کو قرآن و سنت کے مطابق حدود اللہ کے اندر استعمال کرنے کی پابند ہوگی۔ ان حدود سے تجاوز کرنے کا اسے حق نہ ہوگا

یہ ہے وہ آئیڈیالوجی جس پر اپنی ریاست کی بنیاد رکھنے کا ہم فیصلہ کر چکے ہیں۔ لازم ہے کہ اسی پر ہمارے دستور کی بنا رکھی جائے۔ اور اس کے ٹھیک ٹھیک ثبت کرنے کی صحیح آئینی صورت یہ ہے کہ زیر ترتیب دستور کی چار مستقل دفعات میں اس بنیادی عقیدے کے چاروں مذکورہ بالا اجزاء کو واضح اور غیر مشتبہ زبان میں بیان کر دیا جائے۔

(۲) بنیادی عقیدے کی توضیح و تعیین کے بعد قرارداد مقاصد اس عملی نظام کی تشریح کرتی ہے جو اس عقیدے پر بنایا جائے گا۔ یہ نظام تین بڑے اجزاء پر مشتمل ہے۔

ایک وہ جو عام ملکی معاملات سے متعلق ہے،

دوسرا وہ جو ریاست کی مسلمان اکثریت سے متعلق ہے،

تیسرا وہ جو ریاست کی غیر مسلم اقلیت سے متعلق ہے۔

قرارداد مقاصد کے دیباچے نے یہ بات پہلے ہی طے کر دی ہے کہ ان تینوں اجزاء کے بارے میں جس قدر بھی دستوری تفصیلات مرتب کی جائیں گی وہ لازماً اسی آئیڈیالوجی پر مبنی ہوں گی جو اس دیباچے میں بیان کی گئی ہے۔ ان میں سے کسی جز کے بارے میں بھی کوئی ایسی دستور سازی جائز نہ ہوگی جو اس اعلان کردہ بنیادی عقیدے کے خلاف ہو۔ جو لوگ دستور سازی کے کام میں کسی طور پر حصہ لے رہے ہوں ان کا فرض ہے کہ اس بات کو پوری ایمانداری کے ساتھ ملحوظ رکھیں اور اپنے مشیر کاروں کو اس راستے سے ہٹنے نہ دیں۔

(۳) عام ملکی معاملات کے بارے میں قرارداد مقاصد کی شق (ب) یہ طے کرتی ہے کہ دستور مملکت کی ترتیب میں "جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور اجتماعی عدل و انصاف کے ان

اصولوں کی پوری طرح پیروی کی جائے گی جو اسلام نے ہم کو بتائے ہیں۔" نیز شق (۵) یہ بھی طے کرتی ہے کہ زیر ترتیب دستور میں باشندگان ملک کو چند بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی جن میں خاص طور پر یہ حقوق شامل ہوں گے: "مرتبے اور مواقع کی مساوات، قانون کی نگاہ میں سب افراد کا یکساں ہونا، تمدنی، معاشی اور سیاسی انصاف، خیال، بیان، عقیدہ، ایمان، عبادت اور اجتماع کی ایسی آزادی جو قانون اور اخلاق عامہ کے تابع ہو۔"

ان سب امور کے بارے میں یہ ضروری ہے کہ پہلے جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور اجتماعی عدل و انصاف کے اسلامی مفہومات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، پھر ان کو دستور کے مختلف ابواب اور دفعات میں حسب موقع ثبت کیا جائے۔ یہ اصطلاحات دنیا کے بہت سے فکری نظاموں میں مشترک ہیں۔ مگر ہر ایک میں ان کے مفہومات دوسرے نظاموں سے الگ ہیں۔ مثلاً اشتراکی ان کو کسی معنی میں استعمال کرتا ہے، مغربی جمہوریت پسند انہیں ان کے کچھ اور معنی لیتے ہیں، اور اسلام میں ان کے معنی کچھ اور ہیں۔ ہم کو ان کی مختلف تعبیرات میں سے لازماً وہ تعبیر اختیار کرنی ہے جو خالص اسلامی ہو، اور ان تعبیرات سے بچنا ہے جو دوسرے مسلکوں نے گھڑی ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام میں دوسرے نظامات فکر کے برعکس جمہوریت مطلق العنان نہیں ہے بلکہ حدود اللہ کی پابند ہے۔ اس لئے ہماری پارلیمنٹ کثرت رائے سے یا بالاتفاق کوئی قانون نہ بنا سکتی ہے نہ ایسے کسی قانون کی منظوری دے سکتی ہے جو خدا اور رسول کے احکام سے ٹکراتا ہو۔ قانون سازی کے معاملہ میں اس کی آزادی صرف مباحات تک محدود رہے گی، رہے وہ معاملات جن میں کسی نہ کسی طرح کے شرعی احکام موجود ہیں، تو ان میں وہ لازماً نصوص کتاب و سنت ہی سے مسائل کا استنباط کرنے پر مجبور ہو گی۔ ہمارے دستور کے باب قانون سازی کی اولین دفعہ میں اسی مضمون کی تصریح ہونی چاہیے اور اس کے ساتھ ایک خاص مدت بھی اس غرض کے لئے مقرر کی جانی چاہیے کہ اس کے اندر اندر انگریزی دور کے وہ تمام قوانین منسوخ یا تبدیل کر دیئے جائیں گے جو احکام خدا و رسول کے خلاف ہماری مملکت میں رائج ہیں۔

اسی طرح بنیادی حقوق کے معاملہ میں بھی ہم کو دوسروں کی تقلید نہیں کرنی ہے بلکہ اپنے

شہریوں کو وہ حقوق دینے میں جو خدا اور رسول کی شریعت نے ان کو دیئے ہیں، اور ان کے حقوق پر وہ پابندیاں عائد کرتی ہیں جو اسلامی قانون اور اسلامی نظام اخلاق نے ان پر عائد کی ہیں۔ جو آزادی اسلام اپنی مملکت کے شہریوں کو نہیں دیتا وہ ہمارے دستور میں ان کو ہرگز نہیں دی جاسکتی، خواہ تمام دنیا میں ان کو دی گئی ہو، اور جس آزادی سے اسلام نے ان کو بہرہ ور کیا ہو ہم اسے سلب کرنے کی کوئی گنجائش اپنے دستور میں نہیں رکھ سکتے خواہ دنیا کے دوسرے دستوروں میں ایسی گنجائش کتنی ہی فراخ دلی سے رکھ دی گئی ہو۔ مثلاً اسلام اپنی مملکت کے کسی مسلم شہری کو یہ آزادی نہیں دیتا کہ وہ اس ملک کے اندر رہتے ہوئے اپنا دین تبدیل کرلے، یا ارکان دین کی بجا آوری سے انکار کرے، یا فواحش و منکرات کا علانیہ مرتکب ہو، اور احکام خدا و رسول کی کھلے بندوں خلاف ورزی کرے، لہٰذا شخصی آزادی کی یہ تعبیر دوسرے دستوروں میں چاہے جیسی کچھ بھی پائی جاتی ہو، ہم کو اپنے دستور میں صاف صاف اس آزادی کی نفی کرنی پڑے گی۔ بخلاف اس کے دنیا کے بعض دستوروں میں ایسی گنجائشیں رکھی گئی ہیں کہ بنا پر حکومت ایک شہری کی آزادی اس کا جرم ثابت کئے بغیر اور اس کو صفائی کا موقع دیئے بغیر سلب کرسکتی ہے، لیکن اسلام کسی حال میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے ہمارے دستور میں ایسی کوئی گنجائش نہیں رکھی جاسکتی۔

(۴) ریاست نے مسلم شہریوں کے معاملہ میں قرارداد مقاصد کی شق (۶) یہ طے کرتی ہے کہ "ایسی ترتیب دستور میں مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو ان اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں منضبط کرسکیں۔" اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دستور میں مسلمانوں کی حد تک حکومت کے ذمہ چند فرائض واضح طور پر عائد کئے جائیں تاکہ ان کی انجام دہی سے تغافل کرنے کی صورت میں اس سے مواخذہ کیا جاسکے۔ مثال کے طور پر حکومت کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ

(۱) وہ اپنی مملکت میں ایسا نظام تعلیم رائج کرے جو الحاد و بے دینی کے رجحانات سے پاک ہو، جس کے ماتحت علم کے تمام شعبوں میں اسلامی آئیڈیالوجی کو بنیادی حیثیت حاصل ہو اور جس میں مسلمانوں

کے لیے قرآن و سنت کی تعلیم لازمی ہو۔

وہ اس ملک میں اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا انتظام کرے، حج کی تنظیم کرے، اور مسلمانوں کو احکام اسلامی کا پابند بنائے،

وہ مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو ان برائیوں سے پاک کرنے کا انتظام کرے جو قرآن و سنت میں ممنوع ہیں،

وہ تہذیب و تمدن اور معاشرت و معیشت کے تمام شعبوں میں ان اصولوں کی پابند رہے اور اپنے اصلاحی پروگرام کو ان اصولوں پر قائم کرے جو اسلام نے بتائے ہیں،

وہ سرکاری انتظام یا سرپرستی میں ایسے طریقوں کو رواج دینے سے باز رہے جن سے مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں قرآن و سنت کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹنا لازم آتا ہو۔

(۵) غیر مسلموں کے بارے میں قرارداد مقاصد کی شق (ح) یہ طے کرتی ہے کہ ریاست پاکستان کے دستور میں اقلیتوں کے لئے اس امر کی کافی گنجائش رکھی جائے گی کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے مذہب کی پیروی اور اس پر عمل کر سکیں اور اپنی تہذیب کو ترقی دے سکیں۔ نیز شق (ذ) میں یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ اقلیتوں، پسماندہ اور پست طبقوں کے جائز مفاد کی حفاظت کا کافی بندوبست کیا جائیگا۔ یہ دونوں شقیں بھی لازماً اسی دیباچے کی تابع ہیں جس میں مملکت پاکستان کے بنیادی عقیدے کی تصریح کی گئی ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں بھی ہم دنیا کی غیر دینی جمہوری ریاستوں کی نقل نہیں اتار سکتے بلکہ ہم کو ٹھیک ٹھیک اسلامی اصولوں ہی کی پابندی کرنی ہوگی۔ ہم غیر مسلموں کو وہ سارے حقوق دیں گے جو اسلام کے دستوری قانون نے ان کو دیئے ہیں، خواہ دنیا کی دوسری ریاستوں نے ایسے حقوق اپنی اقلیتوں کو نہ دیئے ہوں۔ اور ہم ان کو ایسا کوئی حق نہ دیں گے جو اسلامی دستور کے الفاظ اور روح کے خلاف پڑتا ہو، خواہ وہ دنیا کی جمہوریتوں میں اقلیتوں کو دیا گیا ہو۔ یہ مسئلہ چونکہ پیش کردہ سوال سے غیر متعلق ہے اس لئے اس پر ہم کچھ زیادہ تفصیلی اظہار خیال نہیں کر سکتے۔ اور ویسے بھی اب اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان صفحات میں اس سے پہلے اس کے متعلق مفصل بحثیں شائع ہو چکی ہیں۔ (ا۔م)

عورت کے لئے فرضیتِ نماز اور چہرے کا پردہ۔

سوال :- میں حسبِ ذیل دو معاملات میں اطمینان چاہتی ہوں :-

(۱) وہ کون سے احکام ہیں جن کی رو سے یہ ثابت ہے کہ عورتوں پر بھی پانچ وقت کی نماز فرض ہے؟ مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہیں ہے۔ لیکن میں اس کی فرضیت سے منکر نہیں ہوں۔ بلکہ احتیاطاً اور خوفِ خدا کی وجہ سے نماز کی سختی سے پابندی کرتی ہوں۔ مگر یہی بات یہ ہے کہ خوش دلی سے نہیں بلکہ بمجبوری۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عورت کے لئے پانچ وقت کی نمازوں کی پابندی لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا کے عام قاعدے کے خلاف ہے۔ مردوں کے اوقاتِ کار کا تعین کرتے ہوئے نمازوں کے لئے گنجائش رکھی جا سکتی ہے مگر عورتوں کے کام اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان میں سے نمازوں کا وقت نکالنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ یہ وقت خاص کر بچوں والی عورت کو پیش آتی ہے جب کہ اس کے پاس بچوں کو سنبھالنے اور کام کاج کرنے کے لئے کوئی اضافی آدمی موجود نہ ہو۔ نماز کے لئے وقت نکالا بھی جائے تو نماز کے دوران میں بچے آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پیٹتے ہیں۔ اور ماں کو نماز ہی میں یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کسی کو شدید چوٹ نہ آجائے۔ پھر بچے نماز ہی میں بلانے لگتے ہیں۔ اور کسی طرح پیچھا نام نہیں لیتے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح نماز میں توجہ قائم نہیں رہ سکتی۔ اور بڑی ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ مغرب کو بچے کھانے اور دودھ کے لئے متقاضی ہوتے ہیں۔ عشا کو وہ چاہتے ہیں کہ ماں ان کو تھپک کر سلائے۔ اس طرح نماز کے بارے میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب خاص ایام تو عورتوں کو آٹھ آٹھ دن نماز سے چھٹی ہو سکتی ہے تو عام حالات میں ایک آدھ نماز ترک کر دینے سے کیا ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی واضح فرمایئے کہ نماز میں ستر کی حد کیا ہے؟ گرمیوں میں سر، گردن اور بازوؤں کو اچھی طرح اگر ڈھانکا جائے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ کیا تنہائی میں یہ حصے کھلے نہیں رکھے جا سکتے

(۲) پردے کا مسئلہ ایک عرصہ سے میرے لئے ذہنی کوفت کا سبب بنا ہوا ہے۔ میں نے آپ کی کتاب "پردہ" کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ لیکن مجھے اس سے بھی پورا اطمینان نہیں ہو سکا۔ یوں تو اسلام کے متعلق میرے دل میں جس قدر غلط فہمیاں تھیں وہ آپ کے لٹریچر سے بحمد اللہ رفع ہو گئی ہیں۔ لیکن یہ پردہ کا مسئلہ اب بھی حل نہیں ہوا۔ "پردہ"

کے مطالعہ سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا ہے اور اس کے مخصوص احکام کی ضرورت و افادیت سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ مگر چہرے کے باب میں آپ نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکی۔ میرے دل میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اگر چہرہ کا چھپانا ضروری ہوتا تو اس کے لئے عموماً کوئی صریح حکم ہونا چاہیئے تھا۔ قرآن کی جس آیت سے آپ نے چہرہ کا حکم نکالا ہے اس کا مدعا اگر چہرہ چھپانا ہوتا تو "یدنین علیہن" کے بجائے "یدنین علی وجوھھن" کیوں نہ فرما دیا جاتا۔ پھر چونکہ اوڑھنے جلباب کا مقصد یہ بتایا گیا کہ "ایذا نہ دی جائیں"۔ تو اس صورت میں اگر کسی عورت کو کھلے چہرے بھی ایذا دیئے جانے کا اندیشہ نہ ہو تو اس پر کیوں یہ پابندی عائد کی جائے۔

(ب) جب اللہ نے مردوں اور عورتوں کو ساتھ ساتھ پیدا کیا ہے اور عورتیں کہیں بھی مردوں سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتیں تو ان کے لئے مردوں سے چھپا رہنا سخت تکلیف کا باعث ہے۔ چہرے کے پردہ کی وجہ سے بے شمار کاموں کا حرج ہوتا ہے گرمیوں میں نقاب اوڑھنے سے بڑی گھٹن ہوتی ہے۔ سیر اور ہوا خوری سے استفادہ کن ممکن نہیں رہتا۔ از روئے تجربہ چہرے کا کھلا رہنا کسی خاص فتنہ کا باعث نہیں ہے۔ دیہات میں ہم دیکھتے ہیں کہ عورتیں بلکہ نوجوان کنواری لڑکیاں تک کھلے بندوں پھرتی ہیں۔ مگر کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ سوائے شاذ واقعات کے جو شہروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جہاں پردے اور نقاب کا رواج نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ مغرب میں جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں ان کے اسباب دوسرے ہیں۔

جواب :-

(۱) شریعت نے ایمان باللہ کی دعوت سے لے کر زندگی کے معاملات کے احکام تک میں مردوں اور عورتوں کو بالعموم اکٹھا ہی خطاب کیا ہے۔ دنیا بھر کی زبانوں کے عام قاعدے کے عین مطابق صورت یہی ہے کہ خطاب بظاہر مردوں سے کیا جاتا ہے اور تمام افعال اور حروف اضافت وہی استعمال کئے جاتے ہیں جو طبقہ ذکور کے لئے مروج ہوتے ہیں۔ عورتیں اس عمومی خطاب میں بالتبع مخاطب ہوتی ہیں۔ دنیا میں جہاں مردوزن کی مزعومہ مساوات کا غیر معمولی چرچا ہے وہاں بھی طرز خطاب یہی رائج ہے کہ مردوں سے براہ راست اور عورتوں سے بالتبع کلام کیا جاتا ہے۔ یوں اگر معمولی سی عقل سے بھی کام لیا جائے تو یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ جن مقاصد کے لئے نماز اور دوسری

عبادات فرض کی گئی ہیں ان کا تعلق جتنا مردوں سے ہے، اتنا ہی عورتوں سے ہے۔ بنابریں دونوں کے لئے عبادات کی فرضیت بھی یکساں ہے مثلاً نماز کا ایک مقصد بتایا گیا ہے۔

ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر — بلاشبہ نماز بے حیائی اور گناہ کی باتوں سے باز رکھتی ہے

اب اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایک صالح معاشرہ کی تعمیر صرف مردوں کے بل پر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ عورتوں کا بھی اتنا ہی اس میں دخل ہے۔ پھر اگر صالح معاشرہ کے لئے مردوں کا فحشاء و منکر سے محفوظ کرنا ضروری ہے تو آخر عورتوں کو فحشاء و منکر سے پاک کرنے کے لئے کوئی اہتمام کیوں نہ ہو ۔۔۔ یا کیا عورتوں کے لئے نماز کی جگہ کوئی دوسری تدبیر فحشاء و منکرات سے باز رہنے کی شریعت نے تجویز کی ہے؟

اسی طرح نماز کا دوسرا مقصد یوں بیان کیا گیا کہ

واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ — صبر (کی خصلت) اور نماز (کی پابندی) کا سہارا لو

کیا اس سہارے سے عورتیں بے نیاز ہو سکتی ہیں اور اس کی ضرورت صرف مردوں ہی کو لاحق ہو سکتی ہے؟

ذیل کی آیت مردوں اور عورتوں کو ایمان، عبادات اور اقامت دین کی ساری ذمہ داریوں کے ہوتے تھے جمع کر دینے والی ہیں۔

ان المسلمین والمسلمٰت والمؤمنین والمؤمنٰت والقٰنتین والقٰنتٰت والصٰدقین والصٰدقٰت والصٰبرین والصٰبرٰت والخٰشعین والخٰشعٰت والمتصدقین والمتصدقٰت والصائمین والصٰئمٰت والحٰفظین فروجھم والحٰفظٰت والذٰکرین اللہ کثیراً والذٰکرٰت اعد اللہ لھم مغفرۃ واجراً عظیماہ پ ۲۲ ع

اس آیت میں اسلام، ایمان، قنوت، صدق، صبر، خشوع، صدقہ، روزہ، حفظ ناموس اور ذکر کثیر وغیرہ کو مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے بطور صفاتِ حمیدہ یکساں گنوایا گیا ہے کہ یہ چیزیں ہیں جو مغفرت و اجر کا موجب ہوں گی۔

قنوت، خشوع اور ذکر کی جامع ترین مظہر نماز ہے اور یہ آیت اس کی طرف کھلا اشارہ کرتی ہے۔ علاوہ ازیں روزہ و صدقہ (زکوٰۃ) کو بھی اس میں گنوایا گیا ہے حالانکہ روزہ کے لئے بھی ایک عورت بہت سے دلائل و عذر بیان کر سکتی ہے

نبی صلعم کی ازواج مطہرات کو تنبیہ کے طور پر فرمایا گیا کہ :-

عسیٰ ربه ان طلقكن ان یبدله ازواجا خیرا منكن مسلمات مؤمنات قانتات تائبات عابدات سائحات ثیبات وابكارا ۝ (۶۶ : ۵)

اس میں "قنوت" کے عام وسیع مفہوم کے علاوہ نماز کی طرف بھی اشارہ ہے اور لفظ "عابدات" خود بتا رہا ہے کہ عبادات پنجگانہ کو فرض کی حد تک ہی نہیں بلکہ اس سے زائد بطور نفل ادا کرنے والی عورتوں کا ذکر ہے اور یہ صفات مطلوب اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ ازواج مطہرات ان کو نشوونما دیں۔

لیکن ان ارشادات سے اگر اطمینان نہ ہو تو کھلا حکم بھی موجود ہے۔ ازواج مطہرات ہی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :-

وقرن فی بیوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى واقمن الصلوة وآتين الزكوة واطعن الله ورسوله۔

یہاں کھلا کھلا حکم نماز موجود ہے اور اس کے ساتھ زکوٰۃ دینے اور خدا اور رسول کی اطاعت پر کاربند ہونے کے لئے بھی تاکید ہے۔

مزید دلائل کی ضرورت ہو تو حدیث کی کسی کتاب کو اٹھا کر اس میں کتاب الطہارت و باب تحائض نکال کر ملاحظہ فرما لیجئے۔ نبی صلعم کی طرف سے واضح تصریحات ملیں گی۔

یوں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ فرض (ڈیوٹی) کوئی بھی ہو، وقت اور آرام کی قربانی چاہتی ہے۔ اور دوسرے مشاغل کو ترک رکھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ ہر معاملہ جیسے مردوں کے لئے ہے ویسے ہی عورتوں کے لئے ہے بلکہ مردوں کو نسبتاً گراں تر اور نازک تر ذمہ داریوں میں گھرے ہونے کے باوجود نماز کے لئے وقت نکالنا ہوتا ہے۔ جیسے کسی کارخانہ کے منیجر، کسی مدرسے کے معلم اور کسی گاڑی کے گارڈ کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ پھر نماز کی اہمیت کا تقاضا اتنا دور تک پہنچا ہے کہ عین حالت جنگ میں جب کہ گولے برس رہے ہوں سپہ سالار اور سپاہیوں کو نماز ادا کرنی ہوتی ہے۔ پھر اگر کوئی عورت بچوں کے دنگے فساد کا عذر پیش کرے تو اسے کیا وزن دیا جاسکتا ہے۔

ایام خاص کے لئے جو رخصت دی گئی ہے اسے عام حالات پر نہیں پھیلایا جاسکتا۔ ورنہ پھر ہر رخصت

کو عام حالات پر پھیلانا جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً سفر کے لئے قصر کرنے کے قاعدے کو قیام کی حالت میں کیسے اختیار کیا جاسکتا ہے یا موت کا شکار ہونے سے بچنے کے لئے حرام چیز کھانے کی جو اجازت دی گئی ہے اس سے روزمرہ کے لئے تو کوئی قاعدہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

یہ عذر بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ نماز میں توجہ کی یکسوئی ممکن نہیں ہوتی۔ لہٰذا نماز سے فائدہ کیا۔ خشوع اور خضوع کی حالت پیدا ہونے میں خارج کے حالات بھی ہر آدمی کے لئے کسی نہ کسی قدر مانع ہوتے اور اس کے دماغ کا داخلی عمل بھی برابر اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ لیکن حدیث میں ایک سوال کے جواب میں نبی صلعم نے اس مشکل کا حل یہ فرمایا ہے کہ موافقات اپنا کام کرتے رہیں نمازی کو چاہیئے کہ وہ جب بھی توجہ کے اکھڑ جانے پر متنبہ ہو فوراً بالارادہ پھر یکسوئی پیدا کرے، اور برابر اس کشمکش میں لگا رہے۔

(۲) مولینا نے اپنی کتاب پردہ میں چہرہ چھپانے کے متعلق جو بحث کی ہے اسے براہ کرم پھر مطالعہ فرمائیں، اس میں ثابت حکم کو پوری طرح واضح کیا گیا ہے چہرہ انسانی جذبات و احساسات اور ذہنی تحرکات کا پورا پورا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور انسان کا ذہن جن مختلف آلات پیغام رسانی کا استعمال کرتا ہے ان میں سے بیشتر چہرے ہی پر جمع کئے گئے ہیں۔ زبان اور ہونٹ بجائے خود تعبیرات کہنے میں لفظوں اور آوازوں کے محتاج ہیں، لیکن چہرے کے دوسرے حصے اپنا پیغام پہنچانے کے لئے نہ لفظوں کے ضرورت مند ہیں اور نہ آوازوں کے، بلکہ ان کی ڈکشنری ان کی گرامر اور ان کا ادب نہ لفظوں سے تعلق رکھتا ہے نہ آوازوں سے، پیشانی کی سلوٹوں کے اتار چڑھاؤ، آنکھوں کی پتلیوں کی گردش، کمان ابرو کی ناوک اندازیاں، رخساروں کے رنگ کا تغیر، اتنا فائدہ کچھ کرجاتا ہے جو زبان اور لب گھنٹوں ایڑیاں رگڑتے رہیں تو بھی نہ کرسکیں۔

چہرے کی اہمیت ایسی دو تصویروں سے ظاہر ہوسکتی ہے جن میں سے ایک میں چہرہ بنایا گیا ہو اور دھڑ بھی اور دوسری میں دھڑ دکھایا جائے لیکن چہرے پر سیاہی لیپ دی جائے۔ پردے کا جو قانون کھلے چہرے کے ساتھ ڈھکے ہوئے دھڑ کا مطالبہ کرے اس کی ضرورت و اہمیت پر کوئی آدمی آخر کیا استدلال کرے گا؟

یورپ کی معاشرتی تہذیب کی فتنہ انگیزیوں کی بنیاد صرف کھلے چہرے پر نہیں ہے۔ بلکہ یہی کہنا چاہیئے کہ عورتوں کا بے نقاب چہروں کے ساتھ گھومنا پھرنا اس تہذیب کے مفسدہ انگیز مظاہر میں سے ایک ہے۔ وہ ایک جامع تہذیب ہے۔ جس کا تقاضا ہی یہ ہے اور جس میں اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ اس میں نقاب اٹھ کر چہرے کی

کھپت ہی نہیں۔ لیکن اس کے بالمقابل مغربی تہذیب کے نمونے کو اگر آپ دیکھیں تو اس میں بے نقاب چہرے کے لیے جگہ پیدا کرنے میں دھاندلی سے کام لیے بغیر چارہ نہیں۔ جہاں آواز پر پابندیاں ہوں (یہاں تک کہ نماز میں امام کو لقمہ دینے میں بھی عورتوں کے لیے ایک خاص محتاط صورت تجویز کی گئی ہو)، خوشبو لگانے پر پابندیاں ہوں، زینت کے اظہار پر پابندیاں ہوں، بجنے والے زیورات پر پابندیاں ہوں، پاؤں زور سے مار کر چلنے میں پابندیاں ہوں، لباس تک کے اظہار پر پابندیاں ہوں وہاں کھلے چہرے کے لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے کوئی مقام نکالا جا سکتا ہے۔

ہمارے دیہات اور شہر دونوں کے دونوں کھلے چہروں کے ساتھ بھی اور ڈھکے چہروں کے ساتھ بھی سخت قسم کے معاشرتی مفسدات سے دوچار ہیں۔ اور اس میں جتنا دخل بے نقابی کا ہے اتنا ہی دخل اس اہتمام نقاب کا بھی ہے جو اطاعت خدا و رسول کے جذبے کے بجائے رسم پرستی کے طور پر کیا جاتا ہے۔ شریعت اسلامیہ کی پوری معاشرتی اسکیم میں سے اگر آپ ایک اہتمام نقاب کو اختیار کیے پھریں تو اس سے آخر نظام معاشرت کو کونسا سرخاب کا پر لگ جائے گا۔ اور اتنی سی کارروائی سے اس بات کی ضمانت کیسے مل جائے گی کہ عشق و معاشقہ بے حیائی اور اغوا کے مفاسد کا دروازہ نہ کھلنے پائیگا۔

"یدنین علیھن من جلابیبھن" (وہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں) کے حکم میں اگر آپ علیھن کے لفظ پر غور کریں تو اس سے سراپا کو ڈھانپنے کا تصور واضح ہوتا ہے۔ اور یہ بالکل واضح ہے کہ چادریں سروں کے اوپر سے پورے جسموں پر ڈالی جانی مطلوب ہیں۔ آخر کس گرامر اور کس ادب کی رو سے آپ چہرے کو الگ نکال لے جائیں گی۔ یہ البتہ جداگانہ بات ہے کہ شریعت کا مطالبہ یہی ہے برقعے کا نہیں، بلکہ چادر کی بکل مارنے اور گھونگھٹ نکالنے کی حد تک ہے۔ یہ کام آپ چاہیں تو برقعہ سے لیں اور چاہیں تو بڑی چادر سے۔

جہاں تک سیر سپاٹے کے طور پر بازار گردی کا تعلق ہے "وقرن فی بیوتکن" کے اصولی حکم کے تحت اسلامی نظام معاشرت کے تحت زندگی بسر کرنے والی عورتوں کے لیے اس کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ بحالی صحت کے لیے کوئی حرج نہیں کہ عورتیں اپنے محرم رشتہ داروں اور بچوں کے ساتھ مناسب اوقات میں ایسی اطراف میں جہاں مردوں کی آمد و رفت نہ ہو۔ اعتدال کی حد تک ہوا خوری کریں۔ جہاں بے پردگی کا اندیشہ نہ ہو گھونگھٹ

یا نقاب ہٹا لیں اور جہاں ایسا اندیشہ محسوس ہونے لگے وہاں محتاط ہو جائیں۔

یہ دلیل کوئی دلیل نہیں۔ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں لہٰذا ان کو ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور گھومنا پھرنا بھی لازم ہو گیا۔ اس دلیل سے تو آپ اول سے آخر تک مغربی تہذیب کی ہر چیز کو جائز قرار دے سکتی ہیں، بلکہ اس سے بھی چند قدم آگے جا سکتی ہیں۔ محرم و غیر محرم کی تقسیم قرآن و حدیث کی قطعی نصوص کی رو سے اٹل ہے اور اس تقسیم کا لحاظ کئے بغیر ایک مسلمان خاتون آخر کیسے پابند اسلام رہ سکتی ہے۔

بحمد اللہ کہ آپ کے اندر اسلام سے بغاوت کا جذبہ موجود نہیں ہے آپ کے لئے اتنا کافی ہے کہ خدا و رسول کے احکام آپ کو معلوم ہو جائیں۔

بیگم لیاقت علی خان اور مسئلہ تعدد ازدواج

سوال:۔

بیگم لیاقت علی خان اپنے دورہ امریکہ کے دوران میں مختلف مقامات پر جس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکی ہیں ان کے متعلق ہمیں کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ پاکستان میں انہیں جو قابل رشک مجلسی مقام حاصل ہے اس کے پیش نظر وہ ہر بات تحکم کے ساتھ کہہ سکتی ہیں۔ انہی کی رائے وقیع بھی سمجھی جانی چاہیئے۔ لیکن ایک خاص مسئلہ کے بارے میں انہوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کے متعلق میں آپ کی راہنمائی طلب کرنا چاہتا ہوں۔

پاکستان کی خاتون اول نے ۱۰ مئی سن ۱۹۵۰ء کو نیویارک میں کہا ہے کہ "میں ذاتی طور پر اس بات کے حق میں ہوں کہ مرد صرف ایک بیوی کریں..... ممکن ہے کہ پاکستان میں ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر قانونی پابندی لگا دی جائے"

جہاں تک ہمیں علم ہے قرآن میں مردوں کو ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت ہے۔ اگر اس کے متعلق قرآن میں واضح حکم موجود ہے تو اس کے خلاف کسی کو لب کشائی کی جرأت نہیں ہونی چاہیئے۔ قرآن کے واضح حکم کی موجودگی میں کسی شخص کو یہ حق

حاصل نہیں کہ وہ اس کو اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کے پیمانہ پر ناپنے کی کوشش کرے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ اگر ابھی تک اس میں اسلامی نظام کا نفاذ نہیں کیا جا سکا، جب بھی ہمیں ملک کے ارباب بست و کشاد کے دعاوی و اعلانات کی بنا پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ پاکستان میں قرآن کے ابدی ضابطہ جات کے سوا کوئی نظام نافذ نہیں کرنا چاہتے۔ مجلس دستور ساز کی منظور کردہ قرار داد مقاصد سے بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلامی نظام کا نفاذ کرتے ہوئے ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم قرآنی احکامات میں رد و بدل کر سکیں۔ اگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی قرآن اجازت دیتا ہے تو پاکستان کے اسلامی خاکہ میں اس پر قانونا پابندی عائد کرنا خارج از بحث ہے۔ اس صورت میں ہم پاکستان کے نظام کو "اسلامی" کا نام نہیں دے سکیں گے۔ اگر پاکستان میں اس قسم کی پابندی لگانے کا حق یہاں کی اسلامی حکومت کو حاصل ہے تو قرآن کے حکم کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے

امید ہے آپ کسی قریبی اشاعت میں اس سوال پر اظہار خیال کر کے میری ذہنی خلش کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

جواب :-

ان لوگوں کے فتووں کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنا اور شریعت میں ان کے بارے میں دلائل تلاش کرنا فضول ہے ان کا اسلام الگ ہے، جسے یہ ضروریات کے مطابق ساتھ کے ساتھ گھڑ رہے ہیں۔ اور ساتھ کے ساتھ اسے نافذ کر رہے ہیں۔ ان کے لئے وہ اسلام کام کا نہیں ہے جو ان سے کوئی اپنی بات منواتا ہو۔ بلکہ انہیں وہ اسلام درکار ہے جو ان کے پیچھے پیچھے جی حضور کہتا ہوا شراب خانوں، رقص گاہوں اور عیاشی کے اڈوں میں گھومتا پھرے۔ یہ زبانی طور پر اگرچہ نام خدا کے آتارے ہوئے قرآن کا لیتے ہیں، لیکن عمل کے لئے اپنا علیحدہ قرآن مرتب کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں جس قسم کے نظام پر چاہیں "اسلامی ریاست" کا لیبل لگا دیں، ان کے ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔

آزمائش نعمت

سوال :-

عموماً لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان ایک دولتِ خداداد ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بیک وقت ایک طرف تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی اتنی بڑی عزت افزائی کرتے ہیں کہ ان کو ایک بڑی اسلامی سلطنت عطا فرماتے ہیں اور دوسری طرف ان پر اتنے غضب ناک ہوتے ہیں کہ کروڑوں مسلمانوں کی جان، مال اور ناموس اپنے دین کے دشمنوں کے ہاتھوں سے غارت کراتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے واقعی حکومت دے کر ہماری عزت افزائی کی ہے۔ یا کہیں اسپین کی تاریخ تو نہیں دہرائی جا رہی۔

قابلِ غور چیز یہ ہے کہ حکومت کے لیے بہر حال کچھ صلاحیتیں (روحانی، اخلاقی اور مادی) مطلوب ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آج کی اخلاقی حالت سو ڈیڑھ سو سال پہلے سے پست تر ہے۔ بہت سے مفاسد جو آج عام ہو چکے ہیں پہلے ان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ان حالات کو دیکھیں تو تاریخ کی شہادت خدا کے قوانین کے متعلق یہ نظر آتی ہے کہ اخلاقی انحطاط کی حالت میں وہ دی ہوئی سلطنتیں بھی چھین لیتا ہے۔ پھر آخر ان قابلِ سزا حالات میں اتنی بڑی کرم فرمائی کی حقیقت کیا ہے؟

جواب :-

خداداد تو اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کو کہا ہی جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ ادبار و نکبت اور ذلت و پستی کے حملے کی طرح بسا اوقات خود نعمت بھی آزمائش بن کر وارد ہوتی ہے۔ تاریخ انسانی میں اس کی اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں، کہ ایک ہی گروہ کو دو حصوں میں بانٹ کر ایک کو ذلت کی آزمائش میں ڈالا گیا اور دوسرے کو اقتدار کی آزمائش میں۔

ایک گرتی ہوئی قوم کو بہترین حالات فراہم کر کے ایک زریں موقع بہم پہنچایا جاتا ہے۔ اگر وہ فی الواقع سنبھلتا

چاہتی ہے تو سنبھل لے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے پاس راہ حق پر مستقیم نہ ہوسکنے کے جتنے عذرات ہوتے ہیں ان کو ختم کر دیا جاتا ہے کہ لو اب تم اپنی نیتوں اور عزائم کا پورا پورا اظہار کر لو۔ اس طرح کی آزمائش قسمت میں گھرنے والی قوم اگر خوش نصیب ہوتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہے۔ اور نہ صرف خود پستی سے ابھر آتی ہے بلکہ وہ دوسری اقوام کو بھی سہارا فراہم کرتی ہے۔ لیکن اگر اس کے اعمال کی نحوست اس پر بالکل مسلط ہی ہوگئی ہو اور وہ خداداد موقع کو ضائع کر دے اور یہ ثابت کر دے کہ کہ اس کی ساری عذر تراشیاں جھوٹی تھیں کوئی ارادۂ اصلاح ان کے پیچھے موجود ہی نہیں تھا، تو پھر جتنی بڑی نعمت دی گئی ہوتی ہے اتنا ہی بڑا عذاب اس کی اوٹ میں سے برآمد ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں کہا جاتا رہا ہے کہ انگریز کی غلامی اتباع اسلام میں حائل ہے اور ہمیں ایک الگ خطۂ ارضی اگر مہیا ہو جائے تو ہم خدا کی کتاب کے ایک ایک شوشے کو زمین پر قائم کر کے دکھا دیں گے۔ ہمیں آزادی ملے تو بھی پھر ہم ہوں گے اور اسلام ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دعاوی اور اعلانات کو کسوٹی پر رکھنے کے لئے مطلوبہ خطۂ ارضی بھی فراہم کر دیا ہے اور انگریزی اقتدار کی سِل کو بھی ہمارے سینوں سے ہٹا لیا ہے اب یہ ہمارے ذمے ہے کہ ہم اپنے آپ کو سچا ثابت کریں یا جھوٹا؟ اور ہماری کوششیں اسی کو پیدا کرنے کے لئے وقف ہیں) تو نہ صرف ملتِ پاکستان خود سنبھل جائے گی اور اللہ کی مزید نعمتوں کی مستحق ہوگی بلکہ دوسری مسلم اور غیر مسلم اقوام کے لئے ابھرنے کا سہارا بنے گی۔ اور اگر بدقسمتی سے تذکیر کی ساری کوششیں ناکام گئیں اور اللہ کی نعمت سے اجتماعی طور پر مذاق کرنے کا سلسلہ جاری رہا تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ کیا کچھ نہ ہوگا۔

جس صورت حالات میں ہم گھرے ہوئے ہیں اس کا ٹھیک ٹھیک تقاضا یہ ہے کہ دل و دماغ کی ایک ایک رمق، دوڑ دھوپ کا ایک ایک لمحہ اور جیب کی ایک ایک کوڑی اصلاح کی منظم جدوجہد میں جھونک دی جائے ورنہ بڑے بڑے متقی کا حشر فاسقین کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

سوال:-

پرسوں کی بات ہے ایک ذمہ دار دوست سے سننے میں آیا کہ عبداللہ ابن ابی رئیس المنافقین کی نماز جنازہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں پڑھی۔ مگر میں نے نہیں مانا واپسی میں گھر

"اگر ترجمان القرآن بابت ماہ رمضان و شوال ۱۳۶۲ھ یعنی جلد ۲۲ کا عدد ۳، ۴ کھولا تو اس کے ص ۲۰۹ پر یہ عبارت لکھی دیکھی "آخر جب آپ نماز پڑھانے کھڑے ہو ہی گئے تو یہ آیت نازل ہوئی اور براہ راست حکم خداوندی سے آپ کو روک دیا گیا" تحقیق حق کے لئے میں عرض کرتا ہوں کہ بخاری شریف کتاب الجنائز میں موجود ہے کہ فصلی علیہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ثم انصرف فلم یمکث الا یسیراً حتے نزلت الآیتان من براءۃ ولا تصل علی احد منھم مات ابداً الی قولہ" اس سے حضور کا نماز جنازہ پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسری کتب تفسیر مثل بیان القرآن از مولانا اشرف علیؒ، حاشیہ قرآن مولانا عثمانیؒ اور انگریزی تفسیر القرآن از جناب محمد علی صاحب لاہوری میں مذکور ہے۔ ان کے اقتباسات اس لئے نہیں لکھے کہ انہوں نے بھی امام بخاریؒ کا ہی حوالہ دیا ہے۔

جواب:۔

اس مسئلے میں دو طرح کی روایات ہیں۔ ایک روایت وہ ہے جو احمد، بخاری، ترمذی اور نسائی وغیرہم نے ابن عباس سے نقل کی ہے۔ جس میں یہ ذکر آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ ابن ابی کی نماز جنازہ پڑھنے سے روکتے رہے مگر حضور نے اس پر نماز پڑھی اور بعد میں یہ آیت نازل ہوئی ولا تصل علی احد منھم مات ابداً ولا تقم علی قبرہ۔ اس کی تائید بخاری و مسلم وغیرہ کی وہ روایت بھی کرتی ہے جو ابن عمر سے منقول ہے۔ دوسری روایت وہ ہے جو امام ابوجعفر طبری نے اپنی تفسیر میں اور ابویعلی نے اپنی مسند میں حضرت انسؓ سے نقل کی ہے اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب نبی صلے اللہ علیہ وسلم عبداللہ ابن ابی پر نماز جنازہ پڑھنے کھڑے ہوئے تو جبریل نے آکر منع کیا اور یہ حکم سنایا ولا تصل علی احد منھم مات ابداً ولا تقم علی قبرہ ان دونوں قسم کی روایات میں سے میں نے دوسری روایت کو اس کی سند کے ضعف کے باوجود اس لئے پسند کیا ہے کہ یہ قرآن سے متعارض نہیں ہے۔ رہیں پہلی قسم کی روایات، تو اگرچہ ان کی سند قوی ہے۔ مگر ان میں متعدد باتیں ایسی ہیں جو قرآن سے متعارض واقع ہوئی ہیں ان احادیث کے متن میں جو اشکالات ہیں ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ ۔ شیخ رشید رضا نے اپنی تفسیر المنار کی جلد دہم میں صفحہ ۵۷۵ سے ۵۸۰ تک

مفصل بحث کی ہے۔ براہِ کرم اس کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔

جاگیروں کی تحقیق

سوال:-

جاگیروں کے مسئلہ میں ایک کھٹک ہے۔ آپ کا ایک مکتوب اس مسئلے کے متعلق رہائی سے قبل کوثر (لاہور) میں شائع ہوا تھا۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ جاگیروں کی باقاعدہ تحقیقات ہونی چاہیے۔ پھر ان میں سے جو بھی ناجائز ثابت ہوں انہیں بلاشبہ چھین لینا چاہیے۔ اس سلسلہ میں آپ کی توجہ شامی ج ۳ صفحہ ۳۵۵ کی ایک بحث کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس بحث کی یہ عبارت قابلِ غور ہے۔

الملک الظاهر بیبرس فانه اراد بمطالبة	شاہ ظاہر بیبرس نے مالکانِ اراضی سے مطالبہ کیا کہ وہ ملکیت کا ثبوت
ذوی الاقطاعات بمستندات تشهد لهم	پیش کریں ورنہ ان کی زمینیں حکومت اپنے قبضہ میں کرے گی اور اس عالم
بالملک والا انتزعها من ایدیهم متعللا بها	میں بہانہ وہی بنایا جو (اس سے پہلے دوسرے) ظالم و جابر
تعلل به ذالک الظالم فقام علیه شیخ الاسلام	بادشاہ نے اختیار کیا تھا اس موقع پر امام نووی نے ہمت و
الامام النووی واعلمه بان ذالک غایة الجهل	جرأت سے کام لیتے ہوئے بادشاہ کو بتلایا کہ یہ طرزِ عمل انتہائی
والعناد وانه لا یحل عند احد من علماء المسلمین	جہالت اور سرکشی کا مظہر ہے اس کو کوئی بھی عالم جائز نہیں قرار
بل من فی یده شیء فهو ملکه لا یحل لاحد الاعتراض علیه	دے سکتا۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس کے قبضہ میں جو چیز ہے
ولا یکلف اثباته ببینة ولم یزل النووی یشنع	وہ اسی کی ملک ہے اس پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں
علی السلطان ویعظه الی ان کف عن ذالک	اور نہ ملکیت کے ثبوت کیلئے گواہ پیش کرنے کی ذمہ داری مالک پر عائد ہوتی ہے
(الشامی باب الجزیه والخراج)	امام نووی نے اس شخص کی مذمت کی اور وہ اس حرکت سے باز آگیا

عرض یہ ہے کہ اس بحث کی روشنی میں آپ مسئلہ کو ذرا وضاحت سے بیان فرمائیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں ایک فتوےٰ شائع کیا تھا جس کا

ماحصل یہ تھا کہ اصحاب اراضی سے ثبوت ملکیت کے لئے بینہ کا مطالبہ کرنا درست نہیں۔

جواب:-

امام نووی نے جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ حکومت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مالکان اراضی سے ثبوت ملکیت طلب کرے۔ اور پھر جو اپنی ملکیت کو قانون کی نگاہ میں ثابت نہ کر سکے اس سے وہ سلب کرے۔ یہ بالکل ایسی ہی صورت ہے جیسے قانون یہ کہے کہ جو شہری اپنے آپ کو بے گناہ نہ ثابت کر دے اس کو حوالۂ تعزیر کیا جائیگا ظاہر ہے کہ کوئی عقل مند آدمی اس شکل کو صحیح نہیں قرار دے سکتا۔ بخلاف اس کے صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس شہری کے خلاف کوئی جرم عدالت کے سامنے ثابت کر دیا جائے صرف اس پر تعزیر وارد ہوگی۔ اس طرح زمینوں یا دوسرے اموال کے سلب ملکیت کے لئے کسی فرد یا حکومت کو بطور مدعی یہ ثابت کرنا چاہیے۔ کہ یہ چیز ناجائز طور پر کسی نے ملکیت میں لی تھی یا اب اس کا اس کی ملکیت میں رہنا ناجائز ہے۔

امام نووی کا قول تحقیق کی ضرورت کی نفی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ تحقیق کے الٹے طریقے سے کام لینے کی تردید میں وارد ہے۔

رویتِ ہلال اور لاؤڈ سپیکر کا استعمال نماز میں

سوال:-

(۱) پچھلے دنوں محکمۂ موسمیات (کراچی) کے اسٹڈی سرکل کی ایک مجلس میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی ایک تقریر ہوئی جس کا عنوان تھا "رویتِ ہلال سائنٹفک نقطۂ نگاہ سے"۔ تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ ہمارے مذہبی تقاریب مثلاً عید الفطر، عید الاضحیٰ وغیرہ کے دنوں کے تعین میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے۔ پھر کیوں نہ ان ایام کو پہلے سے متعین کر لیا جائے۔ جب سائنس اور ریاضی کی مدد سے حساب لگا کر ایسا کرنا ممکن ہے۔ اس مجلس میں چند علما بھی شریک تھے۔ جن میں سید سلیمان صاحب ندوی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ دراصل چاند کا وقوع اور چاند کا شہود دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور شریعت کی رو سے شہود مقصود ہے۔ نہ کہ وقوع۔ چنانچہ انہوں

نے ریاضی سے حساب لگا کر رویت ہلال کو پیشگی متعین کرنے یا ہوائی جہاز پر سوار ہو کر بادلوں سے اوپر جا کر چاند دیکھنے سے اختلاف کیا۔ سید صاحب کی یہ رائے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے ایک معمانبی ہوئی ہے۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

(۲) ایسا ہی ایک مسئلہ لاؤڈ سپیکر کے ساتھ امامتِ نماز کرانے کا ہے۔ علماء زیادہ سے زیادہ اذان میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال گوارا کرتے ہیں۔ لیکن نماز میں وہ اسے جائز قرار نہیں دیتے۔ حالانکہ لاؤڈ سپیکر خود امام ہی کی آواز کو منتقل کرتا ہے۔ اور اس کے ذریعے نماز کے نظم کو زیادہ اچھی طرح برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

جواب:۔

آپ کے سوال کے پہلے جز کا جواب یہ ہے کہ رویت ہلال کے بارے میں دونوں ہی مسلک پائے جاتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک ایک ملک میں تقاریب کا ایک ہی وقت میں ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ اور وہ سائنس کے آلات اور علم الافلاک کے حسابات کی رو سے رویت ہلال کے وقت اور ان کا قطعی تعین کرنے کو مناسب سمجھتے ہیں لیکن دوسری طرف کثرت سے رائیں اس مسلک کے حق میں ہیں کہ رویتِ ہلال کے بارے میں فطری ذرائع پر انحصار کرنا چاہیئے۔ اور یہ کہ تقاریب کا ایک بڑے ملک میں ایک ہی وقت میں ہونا نہ ضروری ہے نہ صحیح۔

ہماری رائے میں نصوص کی رو سے دوسرا مسلک ہی قابلِ ترجیح ہے۔ شریعت نے لوگوں کو اس کا مکلف نہیں کیا ہے۔ کہ وہ ہزاروں فٹ کی بلندی پر جا کر چاند دیکھیں۔ بلکہ انہیں یہ سیدھا سادہ فطری طریق بتایا کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھ لو اور چاند دیکھو تو عید کر لو۔

احادیث کی رو سے کسی بڑے ملک یا برِ عظیم یا پوری دنیا میں بیک وقت رمضان یا عید کے وقوع کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ الٹا فلکیات کا علم بتاتا ہے کہ رویت ہلال کا ہر جگہ ایک ہی دن ہونا ضروری نہیں اختلافِ مطالع کی اہمیت کے پیشِ نظر کسی مقام کی رویت ہلال کو دور دراز کے علاقوں کے لئے حجت نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ جب چاند کا وقوع مختلف علاقوں میں مختلف اوقات میں ہوتا ہے۔ تو پھر ایک مقام کی رویت ہلال کو دوسرے مقامات کے لئے کیسے واجب القبول قرار دیا جا سکتا ہے۔ شریعت میں ایک شہر اور اس کے مضافات کی رویت ہلال

اس شہر کے لئے وہیں ہوسکتی ہے اس طرح کے ہر یونٹ میں رمضان اور عیدوں کا وقوع بیک وقت ہونا چاہیئے

سوال کے دوسرے جز کے جواب میں واضح ہو۔ کہ ہم اپنے علم کی حد تک لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو نماز کے دوران میں جائز سمجھتے ہیں۔ اس مسئلہ پر بہت تفصیلی بحث ترجمان القرآن (غالباً ۱۳۶۰ھ کے فائل) میں پیش کی جاچکی ہے۔ لاؤڈ سپیکر امام نمازہی کی آواز کو بلند کر کے نمازیوں تک پہنچاتا ہے۔ اور اشخاص کو مکبر بنانے کے مقابلے میں یہ تکبیراتِ صلوٰۃ کو زیادہ صحت کے ساتھ اور زیادہ بروقت بلند کرتا ہے۔ آخر اللہ کے پیدا کردہ آلات و ذرائع سے خود اللہ ہی کا نام بلند کرنے کا کام لینا جائز نہ ہوا تو کیا پھر انہیں شیطان کا حکم بلند کرنے کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے؟

سوال:۔

آپ کے حسب ارشاد اسلام کے برسر اقتدار آنے پر ہر فرقے کے لوگوں کو ان کے عقائد کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت ہوگی۔ اب اگر ایک فرقہ کا طرز عبادت دوسرے کو ناگوار گزرے تو کیا حکومت وقت (اسلامی) اس کا تدارک کرے گی؟۔ یا لوگ اپنے اپنے گھروں ہی میں عمل پیرا ہوں گے؟ مثلاً شیعہ حضرات کا تعزیہ اور گھوڑا اور ماتمی جلوس وغیرہ، دوسرے اہل اسلام کو ناگوار ہے تو کیا شیعہ اصحاب علانیہ برسر عام ایسا کر سکیں گے۔ بعض شیعہ حضرات اسلامی نظام سے صرف اسی وجہ سے خائف ہیں۔

نیز کیا شیعہ حضرات رمضان میں دن کے وقت سبیلیں لگاتے ہوئے سوڈے کی بوتلیں اور لسی کے گلاس چڑھاتے ہوئے بازاروں سے گزر سکیں گے۔ حکومت کا رویہ کیا ہوگا؟

جواب:۔

اسلامی حکومت کے بارے میں کوئی اصولی بات دریافت کی جائے تو وہ تو بیان کی جاسکتی ہے لیکن ہمارے دائرہ عمل سے یہ خارج ہے کہ ہم مختلف فرقوں کے بارے میں اسلامی حکومت کے طرز عمل کی پیشین گوئیاں کریں۔ جو کام مستقبل کی اسلامی حکومت کی پارلیمنٹ یا اس کی عدالتوں یا اس کے محکمۂ احتساب ہی کو کرنا ہے۔ اسے آخر آج ہم لوگ کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی معقول روش نہیں ہوسکتی کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جو

لوگ جدوجہد کر رہے ہوں وہ اٹھا کے بعض افراد یا بعض فرقوں کی پیشانی پر ان کے مستقبل کے بارے میں مہریں لگانا شروع کر دیں۔ کہ ان سے کل یہ سلوک کیا جائیگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل کی اسلامی حکومت کے ظہور پذیر ہونے پر کونسا فرقہ کیا پوزیشن اختیار کرے گا۔ اور حالات میں کیا کیا تبدیلیاں آچکی ہوں گی۔ پھر آخر پیشگی فتوے لگانے اور قانونی فیصلے کرنے سے بجز اس کے اور کچھ حاصل ہو بھی سکتا ہے کہ مختلف فرقوں میں فرقہ واریت کی حس کو اکسایا جائے۔ اور ایک دوسرے کے لئے دلوں کے دروازے بند کرائے جائیں۔ یہ خوب سمجھ لیجئے کہ ہمارا موقف داعی کا ہے جج اور کوتوال کا نہیں۔ ہم دلوں کے بند دروازوں کو کھولنے اور ان پر سے فرقہ وارانہ عصبیتوں کے تالے کھولنے اٹھے ہیں، نہ کہ انہیں اور مضبوط کرنے کے لئے!

اصولاً جو باتیں کہی جاسکتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) اسلامی نظامِ حکومت میں مذہبی گروہوں کی نوعیتیں دو ہو سکتی ہیں ایک وہ گروہ جو چاہے فروعی اختلافات رکھتے ہوں (اور یہ ثابت ہے کہ خلافت راشدہ میں خوارج تک کے اختلافات کے لئے گنجائش دی گئی تھی) اپنی عبادات، تقاریب، شادی بیاہ کے تعلقات اور سیاسی معاشرتی حقوق میں مسلمانوں کی سوسائٹی سے علیحدگی نہ چاہیں۔ دوسرے وہ گروہ جو اپنے اختلافات کو اتنا اصولی سمجھیں کہ عبادات و تقاریب، مجلسی روابط اور سیاسی حقوق کے لحاظ سے علیحدگی کا مطالبہ کریں۔ ان دونوں قسم کے گروہوں کی الگ الگ حیثیتیں ہیں۔ اور اسلامی ریاست کی حدود میں دونوں کے لئے جگہ ہے۔ یہ ہر فرقے کی آزادی پر منحصر ہونا چاہیے۔ وہ اپنے لئے کیا مقام چاہتا ہے۔

(۲) ایسے مظاہرات جن سے اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں کی تردید یا تحقیر ہوتی ہو، اسلام کی اخلاقی سطح سے گرے ہوتے ہوں۔ عامتہ المسلمین یا کسی دوسرے فرقے کی دلآزاری کرنے والے ہوں یا جن سے کسی طرح کی فتنہ انگیزی مطلوب ہو۔ ان کی روک تھام کے لئے ملک کی پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) کو بہر حال اسلام کے بنیادی قوانین کی روشنی میں کچھ قواعد و ضوابط بنانے ہوں گے۔ لیکن ان کے ماسوا اگر بسر عام کسی طرح کے مذہبی یا سیاسی مظاہرات کئے جائیں تو ان سے نہ کسی مسلم کو روکا جاسکتا ہے نہ غیر مسلم کو۔

(۳) ہر وہ فرد جو اپنے آپ کو ریاست کے مسلمان شہریوں میں شامل کرے، رمضان کے کم از کم ظاہری

احترام کا اخلاقاً اور قانوناً دونوں طرح پابند ہوگا۔ وظیفہ اگر کچھ ہو سکتی ہے، تو صرف ان لوگوں کے لئے جو اپنے آپ کو غیر مسلم شہریوں کی حیثیت میں رکھنا چاہیں۔

خریداران ترجمان القرآن سے

التماس

۱:۔ چندہ کے منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ صاف خوشخط لکھئے (خصوصاً ڈاکخانہ اور ضلع کا نام انگریزی کے بڑے حروف میں درج کیجئے) سابق نمبر خریداری بھی

۲:۔ تبدیلی پتہ کی فرمائش مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک دفتر کو پہنچ جانی چاہیئے جس میں پہلا اور نیا تبدیل شدہ پتہ دونوں نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ درج ہوں

۳:۔ اجرائے رسالے کے لئے پیشگی چندہ بھیجئے یا وی۔ پی کی اجازت دیجئے۔ قرض یا وعدہ پر رسالہ جاری نہیں کیا جاتا۔

اگر خدانخواستہ آپ ان گذارشات کو نظر انداز کریں گے تو دفتر کی مجبوراً کوتاہیوں کی ذمہ داری آپ پر ہوگی

"منیجر"

کارروائی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان

منعقدہ ۱۰ ار ۱۴ رجون بمقام مرکز جماعت اسلامی اچھرہ لاہور

مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب بیس ماہ کی نظربندی کے بعد ۲۸ رمئی ۱۹۵۵ء کو نیو سنٹرل جیل ملتان سے رہا ہو کر اگلے روز صبح لاہور پہنچے۔ ان کی رہائی سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کرنے اور جماعت کے لئے آئندہ پروگرام کے تصفیہ کے لئے امیر جماعت نے مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا۔ اور اس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب کو بطور خاص شرکت کی دعوت دی۔ مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس ۱۱ سے ۱۴ جون تک جاری رہا۔ اور اس اجلاس میں حسب ذیل ارکان شوریٰ شامل ہوئے۔

(۱) مولانا مسعود عالم صاحب ندوی (امیر جماعت)
(۲) جناب محمد عبدالجبار غازی صاحب
(۳) ملک غلام علی صاحب (قیم جماعت)
(۴) جناب ابوالسلام نعیم صدیقی صاحب
(۵) مولانا عبدالغفار حسن صاحب
(۶) ملک نصراللہ خاں صاحب عزیز
(۷) چوہدری علی احمد خاں صاحب (گوجرانوالہ)
(۸) چوہدری محمد اکبر صاحب (سیالکوٹ)
(۹) مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب (لائل پور)
(۱۰) مولانا صدر الدین صاحب (راولپنڈی)
(۱۱) جناب فضل معبود صاحب (پشاور)
(۱۲) خان سردار علی خان صاحب (سرحد)
(۱۳) جناب محمد باقر خان صاحب (ملتان)
(۱۴) جناب خان محمد صاحب ربانی (ملتان)
(۱۵) سید امیر الدین صاحب (رحیم یار خان)
(۱۶) مولانا عبدالحق صاحب (جاچڑاں)
(۱۷) چوہدری نذیر احمد صاحب (جہانیاں) (۱۸) جناب سلطان احمد صاحب (کراچی) (۱۹) چوہدری غلام محمد صاحب (سندھ)

نیز مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب کو امیر جماعت نے خاص طور پر شریک کیا۔ قاضی حمید اللہ صاحب بیماری کی وجہ سے نہ آسکے۔ کیونکہ وہ ان دنوں میو ہسپتال لاہور میں زیر علاج تھے۔ مولانا حکیم عبداللہ صاحب رحمانیہ، نہ تشریف لائے اور نہ ان کی طرف سے کوئی اطلاع موصول ہوئی۔

مجلس شوریٰ کے کل آٹھ اجلاس ہوئے۔ جن میں بجز خان سردار علی خان صاحب کے جو اختلاج قلب کے دورے کی وجہ سے پہلے اجلاس کے فوراً بعد واپسی پر مجبور ہو گئے۔ کم و بیش سارے ارکان شریک رہے۔ ان اجلاسوں میں حسب ذیل کارروائی ہوئی۔

کارروائی کا آغاز سب سے پہلے یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اجلاس کی کارروائی آئینی حیثیت سے جناب محمد عبدالجبار غازی صاحب، مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور مولانا مسعود عالم ندوی صاحب میں سے کس کی صدارت میں چلنی چاہیئے؟ یہ الجھن اس لئے پیش آئی کہ غازی صاحب نے اپنی صحت کی خرابی کے حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے مولانا عبدالغفار حسن صاحب کو عارضی طور پر اپنا نائب مقرر کیا۔ اس کے بعد جب مستقبل قریب میں خاطر خواہ حد تک صحت کے سنبھلنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو امارت سے استعفیٰ دیدیا۔ تاکہ جماعت اپنے حسب منشا نئے امیر کا انتخاب کرے۔ اسی دوران میں سابق مجلس شوریٰ کی میعاد ختم ہو گئی اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب کی نیابت کے زمانے میں نئی مجلس شوریٰ کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس مجلس شوریٰ نے غازی صاحب کا استعفیٰ منظور کر کے مولانا مسعود عالم صاحب کو جماعت کا امیر تجویز کیا۔ مولانا مسعود عالم صاحب کی امارت کے بارے میں ارکان جماعت سے استصواب عمومی ابھی جاری ہی تھا کہ مجلس کا یہ اجلاس منعقد کرنا پڑا۔ اس لئے آئینی حیثیت سے یہ مسئلہ غور طلب تھا کہ اس وقت آئینی و قانونی حیثیت سے جماعت کے امیر مذکورہ بالا تینوں حضرات میں سے کون صاحب ہیں؟

مسئلے کے سارے پہلوؤں پر دیر تک غور و بحث کے بعد بالاتفاق طے ہوا کہ اس وقت آئینی اور قانونی حیثیت سے جماعت کے امیر مولانا مسعود عالم صاحب ہی ہیں الا یہ کہ ارکان جماعت کی اکثریت ان کی امارت قبول کرنے سے انکار کر دے۔ چنانچہ اجلاس کی باقاعدہ کارروائی مولانا موصوف کی صدارت میں شروع ہوئی۔

امارت کی تبدیلی اب مجلس کے اس اجلاس کے ایجنڈے کا سوال سامنے آیا۔ امیر جماعت نے فرمایا۔ کہ ہمارے

ان تین احباب کی رہائی سے ملک اور جماعت کے حالات وضروریات میں بہت بڑا تغیر واقعہ ہوا ہے۔ کئی مسائل جن پر ہم اب تک اپنی قوت صرف کرتے رہے ہیں ختم ہو گئے ہیں۔ اور بہت سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اس پہلے اجلاس میں ان سب کا جائزہ لے کر ایجنڈا مرتب کر لیجئے۔ پھر اس پر غور وخوض کا کام شام کے اجلاس سے شروع کریں گے۔

مگر قبل اس کے کہ ایجنڈے کی ترتیب پر کوئی باقاعدہ گفتگو شروع ہو امیر جماعت (مولانا مسعود عالم صاحب) نے فرمایا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کو اب پھر ہمارے درمیان لے آیا ہے۔ اور وہ دونوں اس منصب کے مجھ سے بہت زیادہ اہل ہیں۔ اس لئے میں بخوشی امارت کے منصب سے دستبردار ہوتا ہوں۔ اور میں اپنی جگہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا نام امارت کے لئے تجویز کرتا ہوں۔

مولانا کی اس تجویز پر اعتراض ہوا۔ کہ چونکہ امارت کا منصب خالی نہیں ہے اس لئے اس کے لئے کسی شخص کا نام تجویز کرنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اگر امیر جماعت کی رائے میں امارت میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ تو وہ پہلے اپنا استعفےٰ باقاعدہ پیش کریں۔ پھر اگر مجلس شوریٰ اس کو منظور کرے تو یہ سوال پیدا ہوگا۔ کہ نیا امیر کس کو منتخب کیا جائے۔ اس پر امیر جماعت (مولانا مسعود عالم صاحب) نے حسب ذیل تجویز مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عاجز مجلس شوریٰ کے سامنے امارت سے بخوشی دستبرداری کا اظہار کرتا ہے۔ امید ہے کہ مجلس شوریٰ اس کی توثیق کر کے مجھے سبکدوش کر دے گی۔ والسلام۔

عاجز

شنبہ ۲۳ — ۹ — ۶۹ھ
۱۰ — ۶ — ۵۰ء

دستخط (مولانا) مسعود عالم ندوی

مجلس شوریٰ نے مولانا کے اس استعفیٰ کو باتفاق قبول کر لیا۔ اس کے بعد پھر مولانا مسعود عالم صاحب نے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا نام امارت کے لئے تجویز کیا۔ مولانا کی اس تجویز کو بھی مجلس شوریٰ نے متفقہ طور پر قبول کر لیا۔ اب ضرورت تھی کہ مولانا مودودی صاحب بھی اس تجویز سے اتفاق کریں اور مجلس شوریٰ کی اس پیش کش

کو قبول کریں۔ چنانچہ مجلس کی طرف سے مولانا مودودی صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ اس منصب کو پھر قبول کر کے ملک، ملت کو بالعموم اور جماعت کو بالخصوص اپنی خداداد قابلیتوں سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع دیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ان کی یہ امارت اس وقت تک عارضی تصور ہوگی۔ جب تک کہ جماعت کی طرف سے اس کی عمومی توثیق نہ ہو جائے۔ اور یہ توثیق ارکان جماعت کے آئندہ اجتماع عام میں (جو جلد از جلد منعقد کیا جانا چاہیئے) ارکان جماعت سے براہ راست کرائی جائے گی۔

اس طرح مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی امارت عارضی طور پر منظور ہو جانے کے بعد اب مجلس شوریٰ کی کارروائی مولانا موصوف کی صدارت میں شروع ہوئی۔

قیم جماعت کی تبدیلی مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے امارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد ملک غلام علی صاحب کے بجائے طفیل محمد کو قیم جماعت اسلامی پاکستان مقرر کیا اور ملک غلام علی صاحب نے سارے کاغذات ان کے حوالے کر دیئے اور اجلاس سے اٹھ جانے کی اجازت چاہی کیونکہ وہ محض بحیثیت عہدہ ہی مجلس کے رکن تھے۔ مگر امیر جماعت نے انہیں اس اجلاس میں بطور خاص شریک رہنے کا حکم دیا۔ تاکہ جماعت سے متعلق ان کی معلومات سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

اس کے بعد امیر جماعت نے مجلس شوریٰ کے اتفاق سے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور جناب محمد عبدالجبار صاحب غازی کو مجلس کا رکن مقرر کیا۔ اور اب ایجنڈے کی ترتیب کی کارروائی شروع ہوئی۔ ایجنڈا مرتب کر کے یہ اجلاس برخاست کر دیا گیا۔ تاکہ ارکان اگلے اجلاس تک اس پر غور کریں۔

مجلس شوریٰ کی قراردادیں اور فیصلے

اس کے بعد ۱۰ر جون ۱۹۵۰ء کی سہ پہر سے ۱۴ر جون دوپہر تک مجلس شوریٰ کے سات اجلاس منعقد ہوئے جن میں ایجنڈے کی ایک ایک شق پر تفصیل کے ساتھ غور کیا گیا اور ان کے تمام پہلوؤں پر بحث ہوئی۔ ایجنڈا کی مختلف شقیں اور ان پر مجلس کے فیصلے درج ذیل ہیں۔

قرارداد نمبر ۱:

دستور ساز اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے نئے انتخابات کی ضرورت

جماعت اسلامی پاکستان کی مجلس شوریٰ ملک کے حالات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ایک مرتبہ پھر اپنے اس فیصلے کی توثیق کرتی ہے کہ اس ملک کی موجودہ قیادت اپنی ناکامی اور نا اہلی پوری طرح ثابت کر چکی ہے اور یہاں کسی خیر کی توقع اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک کہ یہ قیادت ایک صالح اور اہل تر قیادت سے نہ بدل جائے۔

۱۔ پاکستان کے قیام کا مطالبہ اول روز سے اس بنیاد پر کیا گیا تھا کہ غیر منقسم ہندوستان کے مسلمان اسلامی زندگی کو عملاً بروئے کار لانے کے لئے اپنی ایک آزاد مملکت چاہتے تھے۔ موجودہ قیادت کو مسلمانوں کی مکمل اجتماعی تائید اس وجہ سے حاصل ہوئی تھی کہ اس نے ان کے اس قومی نصب العین کے حصول کی امید انہیں دلائی تھی۔ مگر جب پاکستان قائم ہو گیا تو اس مملکت کے اسلامی ریاست ہونے کا اعلان جو اول روز ہی ہو جانا چاہئے تھا مسلسل ۱۸ مہینے تک ٹالا جاتا رہا۔ ہر طرح کوشش کی گئی کہ اس سے پہلو بچایا جائے اور اسے ایک غیر دینی جمہوری ریاست قرار دینے کا موقع نکل آئے۔ نظام اسلامی کے قیام کا مطالبہ کرنے والوں کو دبانے کے لئے جھوٹ، فریب، سازش اور ظلم کے تمام غیر اخلاقی اور غیر آئینی ہتھیار استعمال کر ڈالے گئے۔ اور جو لوگ اس مطالبہ میں پیش پیش تھے ان کو طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگا کر جیل بھیج دیا گیا۔ پھر جب ان تدبیروں کے باوجود یہ مطالبہ نہ دب سکا اور مسلمانان پاکستان بالاتفاق پوری قوت کے ساتھ اس کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تب دستور ساز اسمبلی میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو وہ قرارداد مقاصد پاس کی گئی جو دراصل ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پاس ہونی چاہئے تھی۔ لیکن اس قرارداد کی منظوری پر پورے پندرہ مہینے گزر جانے کے بعد بھی آج ہم اس ملک کو اور اس کے نظام کو ٹھیک اسی مقام پر پاتے ہیں جہاں سابق غیر مسلم اقتدار کے زمانہ میں تھا۔ کوئی ایک قدم بھی نظام اسلامی کو عملاً برپا کرنے کے لئے نہیں اٹھایا گیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس جو قدم بھی اٹھ رہا ہے الٹی سمت میں اٹھ رہا ہے اور موجودہ قیادت کے کارفرما زبان سے اسلام اسلام پکارتے ہوئے بالفعل حاکمانہ قوتیں اور ریاست کے وسیع ذرائع اس ملک میں غیر اسلامی خیالات، غیر اسلامی اخلاق اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن کو رواج دینے میں صرف کئے چلے جا

رہے ہیں۔ مزید برآں، قرارداد مقاصد کے منشا کے مطابق ایک اسلامی دستور کی تشکیل کا پورا کام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو چاہے جو کچھ بھی جانتے ہوں بہرحال اسلام اور اس کے آئین و قانون کو نہیں جانتے ہو۔ دستور ساز اسمبلی میں اب تک جتنی جگہیں خالی ہوئیں ان میں سے کسی کو بھی پر کرنے کے لئے کسی عالم دین کا انتخاب نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم و مغفور کی جگہ پر بھی کسی عالم دین کو لینے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے محض ایک مجلس تعلیمات اسلامیہ کا ضمیمہ لگا دیا گیا جس کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں ہے کہ ایک سرکاری محکمہ ہے جو محض دریافت کردہ مسائل پر اپنی رائے عرض کر دیتا ہے۔ اسے نہ خود کوئی تجویز پیش کرنے کا حق حاصل ہے اور نہ اس کی رائے کے پیچھے کوئی طاقت ہے۔ بلکہ پبلک کو یہ معلوم ہونے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ کسی مسئلے میں اس سے کیا پوچھا گیا اور اس نے کیا رائے دی۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ فی الواقع قرارداد مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کا کوئی ادارہ موجود نہیں ہے اور جب تک موجودہ قیادت برقرار ہے یہ قرارداد صرف ایک دھوکے کی ٹٹی کا کام دیتی رہے گی۔

۲:۔ باوجودیکہ اس ملک کو عام باشندوں کی متحدہ کوششوں اور قربانیوں کی بدولت ایک آزاد مملکت کی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ اور آزادی کے اختیارات استعمال کرنے کا اصل حق عوام ہی کو پہنچتا ہے لیکن عملاً وہ تمام اختیارات جو آزادی کے بعد تاج برطانیہ سے منتقل ہوئے تھے ایک مٹھی بھر حکمران گروہ نے خود اچک لئے ہیں، عوام کی طرف انہیں منتقل نہیں ہونے دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۵ء کا دستور جس پر قیام پاکستان کے بعد ملک کا نظم قائم کیا گیا۔ بجائے خود ایک غیر جمہوری دستور تھا۔ جس میں اصل منبع اقتدار باشندگان ملک نہ تھے۔ بلکہ تاج برطانیہ تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس دستور میں اگر کوئی تغیر ہوا تو وہ صرف یہ تھا کہ جو شاہانہ اختیارات پہلے برطانیہ کے تاج کو حاصل تھے۔ وہ جوں کے توں پاکستان کی مرکزی حکومت کو حاصل ہو گئے اس دستور میں کوئی ایسی ترمیم نہیں کی گئی جس سے وہ پہلے کی بہ نسبت کچھ زیادہ جمہوری ہو جاتا اور حکومت کے اختیارات میں عوام کسی حد تک حصہ دار ہو جاتے۔ بلکہ اس کے برعکس اس کے اندر مسلسل ایسی ترمیمات کی جاتی رہی ہیں، جو مرکزی حکومت کی شاہانہ مطلق العنانی کو انگریزی دور سے بھی زیادہ بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ یہ حکومت جس مجلس کے سامنے جواب دہ ہے وہ پہلے ہی مرکز کے موجودہ حکمرانوں کی ساختہ و پرداختہ تھی۔ اب اس کو

مختلف طریقوں سے مکمل طور پر تابع فرمان بنا لیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ صرف ایک مہر لگانے کی مشین بن کر رہ گئی ہے جس کا کوئی کام اس کے سوا نہیں ہے کہ چند برسر اقتدار اشخاص کے فیصلوں کو سند توثیق عطا کرتی رہے۔ یہ مجلس جو کبھی دستور ساز اسمبلی کی حیثیت سے کام کرتی ہے اور کبھی پارلیمنٹ کی حیثیت سے اب قطعی طور پر ایک غیر نمائندہ مجلس بن چکی ہے۔ اس کے ذریعہ سے عوام کی خواہشات کا حکومت کے فیصلوں پر اثر انداز ہونا تو درکنار، ٹھیک ٹھیک ظاہر ہونا بھی ممکن نہیں رہا ہے۔ اور اس کی ہیئت ترکیبی کو اتنا بگاڑ دیا دیا گیا ہے کہ اب جو جگہیں بھی اس میں خالی ہوتی ہیں، انہیں پر کیا جاتا ہے اور بس۔ کر عوام کے منتخب کردہ نمائندوں سے نہیں بلکہ چپیدہ برسر اقتدار لوگوں کے نامزد کیے ہوئے لوگوں سے پر کیا جا رہا ہے اس طرح اس ملک میں جمہوریت جو پہلے ہی برائے نام تھی عملاً بالکل ختم کر دی گئی ہے اور آگے جو قدم بھی اٹھ رہا ہے قطعاً ڈکٹیٹرشپ ہی کی طرف اٹھ رہا ہے۔

۴۴:- ایسی ہی صورت حال صوبوں میں بھی پائی جاتی ہے ۱۹۵۶ء کے دستور کی رو سے اصل اختیارات مرکز کے ہاتھ میں ہیں اور صوبوں کی خود اختیاری محض مرکز کے عطیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم جیسی کچھ بھی خود اختیاری اس دستور میں صوبوں کو دی گئی ہے وہ بھی اب صوبوں کے باشندوں سے سلب کی جا چکی ہے اور عملاً اس سے صرف ایک مخصوص پارٹی کے لوگ متمتع ہو رہے ہیں جو دراصل صوبوں میں مرکز کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ پنجاب میں آئین معطل ہے۔ مرکز کا مقرر کیا ہوا گورنر، جو ایک پارٹی کا آدمی ہے چند غیر نمائندہ مشیروں کی مدد سے حکومت کر رہا ہے اور نئے انتخابات کو اس غرض کے لئے ٹالا جا رہا ہے۔ کہ برسر اقتدار پارٹی کی کامیابی کے امکانات پیدا کرلئے جائیں۔ بلوچستان میں جمہوریت ابتدا ہی سے مفقود تھی۔ اور اب بھی مفقود ہے۔ سرحد میں سراسر جبر اور غیر آئینی ہتھکنڈوں سے برسر اقتدار پارٹی نے اسمبلی میں اکثریت پیدا کی ہے اور اب یہ مصنوعی اکثریت ناجائز عطیوں اور بخششوں کے ذریعہ سے برقرار رکھی جا رہی ہے۔ سندھ اور مشرقی پاکستان میں بظاہر صوبائی اسمبلیاں کام کر رہی ہیں، لیکن ایک پارٹی کی حکومت کے تمام عیوب اور نقصانات وہاں پوری طرح رونما ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام صوبوں کا نظم و نسق ہر حیثیت سے رو بتنزل ہے۔ رشوت، اقربا پروری اور دوست نوازی، اور بے انصافی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اور عوام کی مشکلات

کو حل کرنے کے لئے درحقیقت کوئی کارگر کوشش نہ اب تک ہوئی ہے نہ ایسے حالات میں آئندہ ہوسکتی ہے

۴ :۔ ان سب پر مزید وہ غیر جمہوری، غیر اخلاقی اور غیر آئینی تدبیریں ہیں جو سیاسی طاقت پر برسر اقتدار پارٹی کا اجارہ قائم رکھنے کے لئے اختیار کی جارہی ہیں۔ ایک طرف حکومت نے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز اور صوبوں اور مرکز کے سیفٹی ایکٹ اور سیفٹی آرڈی ننس جیسے ہتھیاروں سے اپنے آپ کو مسلح کر رکھا ہے تاکہ جو شخص، یا اخبار یا جماعت بھی اس کے تاجرانہ استبداد کو چیلنج کرے اس کی سرکوبی کردی جائے۔ دوسری طرف ملک میں آزاد صحافت کو ختم کرنے کے لئے طرح طرح کی شرمناک ریشہ دوانیاں کی جارہی ہیں اور خبر رسانی کے ذرائع پر سرکاری تسلط قائم کردیا گیا ہے۔ تاکہ ٹھیک ٹھیک فسطائی طرز پر پبلک کے ذہن کو حکومت کے قبضے میں لے لیا جائے۔ اور لوگوں کے کان میں کوئی بات سرکار کی منشا کے خلاف پڑنے ہی نہ دی جائے۔ تیسری طرف حکومت کے ذرائع و وسائل کو اور سرکاری محکموں اور سرکاری ملازموں کو برسر اقتدار پارٹی کے مفاد کے لئے اور دوسری جماعتوں کی راہ روکنے کے لئے اس طرح کھلے بندوں استعمال کیا جارہا ہے کہ گویا پبلک فنڈس اس پارٹی کے فنڈس ہیں اور سرکاری ملازم اس پارٹی کے ملازم۔ اس طرح ایسے حالات پیدا کئے جارہے ہیں۔ جن میں پرامن جمہوری اور آئینی طریقوں سے حکومت کو تبدیل کرنا قطعی ناممکن ہوجائے گا۔ اور تغیر کے لئے صرف انقلابی طریقے ہی ممکن العمل رہ جائیں گے جن کا استعمال مشکل ہی سے کسی ملک کے لئے سبب خیر ہوسکتا ہے

۵ :۔ خارجی سیاست کے معاملہ میں بھی اس گروہ کا طرز عمل بنیادی طور پر غلط، غیر آئینی اور سخت تشویشناک ہے۔ نازک سے نازک اور اہم سے اہم بین الاقوامی معاملات میں بھی کوئی پالیسی بناتے وقت یا کوئی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے، نہ تو رائے عامہ کا کوئی لحاظ کیا جاتا ہے اور نہ پارلیمنٹ ہی سے استصواب کرنے کی کوئی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ چند آدمی بالکل اپنے ذاتی کاروبار کی طرح ایسے ایسے معاملات طے کر ڈالتے ہیں۔ جن کے نتیجے میں یہ ملک کسی جنگ میں مبتلا ہوسکتا ہے، یا بھاری مالی ذمہ داریوں سے زیر بار ہوسکتا ہے یا شدید سیاسی و معاشی الجھنوں میں پڑ سکتا ہے۔ علاوہ بریں خارجی پالیسی کے معاملہ میں اس گروہ نے جس بے اصولی اور ابن الوقتی کا رویہ اختیار کر رکھا ہے، وہ اخلاقی حیثیت سے بھی

اور حکمت عملی کے نقطۂ نظر سے بھی اس ملک کے وقار اور مفاد کو سخت نقصان پہنچانے والا ہے

ان وجوہ سے مجلس شوریٰ کی رائے میں یہ ضروری ہے کہ ملک کی مرکزی پارلیمنٹ اور دستور ساز اسمبلی کے لئے اور تمام صوبوں کی اسمبلیوں کے لئے از سر نو عام انتخابات کئے جائیں اور آن میں موجودہ برسر اقتدار گروہ کی نسبت زیادہ صالح اور اہل آدمیوں کو منتخب کرنے کی کوشش کی جائے: جماعت اسلامی کی یہ دلی خواہش تھی کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہی اپنے طرز عمل کو درست کر لیتے اور ایسے حالات نہ پیدا کرتے جن کی بنا پر انہیں ہٹانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ اصلاحِ حال کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ اور اس امر کی کوئی امید باقی نہیں رہی کہ ان کا رویہ درست ہو جائے گا۔ لہٰذا اب قرار داد مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اور ملک کو ڈکٹیٹر شپ کے اور روز افزوں فسق و فجور اور اخلاقی بگاڑ کے خطرے سے بچانے کے لئے اور نظم و نسق کی مہلک خامیوں کو دور کرنے کے لئے اور ملک کو بین الاقوامی الجھنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے۔ کہ عام انتخابات کے ذریعہ سے بہتر لوگوں کو برسر کار لانے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام چونکہ مقصدی اہمیت رکھتا ہے اس لئے مجلس شوریٰ کی رائے میں جماعت اسلامی کو اور ملک کی دوسری تمام خیر خواہ جماعتوں کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ایک طرف تو باشندگان ملک میں نئے انتخابات کی ضرورت کا عام احساس ہو یہاں تک کہ انتخابات کا مطالبہ اس زور اور متحدہ طاقت کے ساتھ اٹھ سکے جس کے ساتھ اس سے پہلے نظام اسلامی کا مطالبہ اٹھ چکا ہے اور دوسری طرف عوام الناس میں ٹھیک ٹھیک اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق صالح قیادت اور غیر صالح قیادت کی تمیز پیدا ہو جائے تاکہ وہ آئندہ انتخابات میں جب کبھی وہ منعقد ہوں بہتر لوگوں کو منتخب کر سکیں۔

قرارداد نمبر ۲:-

جاگیرداروں اور زمینداروں کا مسئلہ مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان اس بات پر نہایت افسوس اور تشویش کا اظہار کرتی ہے کہ جب قرارداد مقاصد پاس کر کے یہ مملکت اپنے لئے اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے قبول کر چکی ہے تو پھر جاگیرداری اور زمینداری کے مسئلے کو اسلام کے مطابق حل کرنے میں تساہل سے کام لے کر ایسے حالات کیوں پیدا کئے جا رہے ہیں جن سے اس ملک میں طبقاتی جنگ کی آگ بھڑک اٹھنے کا خطرہ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے قرارداد مقاصد کے بعد اس ملک میں ایسے نظریات کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ جن کا مقصد ذرائع پیداوار کی ملکیت کو ختم کر کے ان پر اجتماعی ملکیت قائم کر دینا ہو۔ یا جن کی رو سے معاشی ذرائع کو افراد کی ملکیت میں دینے پر تقسیم

کرنا تجویز کیا جائے جس میں افراد کی جائز اور ناجائز ملکیتوں کے درمیان اسلامی شریعت کے مقرر کئے ہوئے امتیاز کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ یہ مملکت پہلے ہی اس بات کو طے کر چکی ہے کہ یہاں جو کچھ بھی کیا جائے گا حدود اللہ کے اندر رہ کر کیا جائیگا اور اجتماعی عدل و انصاف کے قیام میں ان اصولوں کی پیروی کی جائے گی جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔ لہٰذا قبل اس کے کہ جاگیرداری و زمینداری کا مسئلہ ایک خطرناک طبقاتی کشمکش کی صورت اختیار کر جائے، یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جلدی سے جلدی علمائے شریعت اور مسائل زمین سے واقفیت رکھنے والے تجربہ کار لوگوں کی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جو زمینداروں اور جاگیرداروں کے بارے میں پوری تحقیق کر کے یہ طے کرے کہ شریعت اسلامیہ کی رو سے کن لوگوں کو زمینوں پر جائز حقوق ملکیت حاصل ہیں اور کن کو نہیں ہیں۔ پھر جن کے حقوق ثابت نہ ہوں ان کی ناجائز ملکیتوں کو بلا معاوضہ ختم کر دیا جائے، ان کی املاک کو مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کے لئے صرف اس بات کا انتظام کیا جائے کہ وہ اپنے ذرائع معیشت سے بالکل محروم ہو کر نہ رہ جائیں۔ اور جن کے حقوق شرعاً ثابت ہوں ان کی ملکیتوں کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں ایسے حدود کا پابند بنایا جائے جن سے وہ اپنی املاک کا صرف جائز فائدہ اٹھا سکیں اور اپنے مزارعین پر ظلم کرنے کے قابل نہ رہیں۔ مجلس شوریٰ کی رائے میں زمینداری و جاگیرداری کے مسئلے کو اسلامی طریقے پر حل کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہے اور اس پر بلا تاخیر عمل ہونا چاہیے۔

اس کے ساتھ مجلس شوریٰ یہ بھی طے کرتی ہے کہ حکومت کی طرف سے کسی ایسی تحقیقاتی مجلس کے قیام کا اور اس کے نتائج تحقیق کا انتظار کئے بغیر جماعت اسلامی کے کارکن جہاں جہاں بھی موقع پائیں طبقاتی جنگ کو روکنے اور مالکان زمین اور مزارعین کو اسلامی عدل پہ جمع کرنے کے لئے حسب ذیل طریقے پر عملاً کام شروع کر دیں۔

۱۔ ہر علاقے کے کارکن اپنے علاقے کے مزارعین اور مالکان زمین سے ملیں اور ان کو طبقاتی جنگ کے برے نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بتائیں کہ شریعت اسلامیہ کی رو سے ان میں سے ہر ایک کے بحیثیت مالک اور بحیثیت مزارع کیا حقوق اور فرائض ہیں۔

۲۔ مالکان زمین کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ ایک طرف تو اپنی املاک کو ان کے شرعی وارثوں میں بخوشی تقسیم کر دیں جو اس وقت زندہ موجود ہیں۔ اور دوسری طرف اپنے مزارعوں کے ساتھ انصاف، ہمدردی اور محبت کا برتاؤ کریں۔ اور ان سے صرف وہ حقوق وصول کرنے پر قناعت کریں۔ جو شریعت کی رو سے انہیں حاصل ہیں

۳۔ مزارعین کو بھی اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ جھوٹے انقلابی نعروں کے نشے میں مبتلا نہ ہوں۔ اور اپنے جائز شرعی حقوق سے زیادہ کسی چیز کے حاصل کرنے پر اصرار نہ کریں۔

۴۔ اگر کسی علاقے کے مالکانِ زمین تبلیغ و تفہیم سے اپنے ظالمانہ طریقے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوں تو مزارعین کو منظم کر کے ایسی تدبیریں اختیار کی جائیں جن سے ظلم کا مقابلہ کیا جا سکے۔

۵۔ جہاں غلط قسم کے انقلابی نعروں نے مزارعین کے کسی عنصر کو راہ راست سے ہٹا دیا ہو وہاں حق پسند مزارعین کی تنظیم کے ذریعہ اس امر کی کوشش کی جائے کہ ان کے بھٹکے ہوئے بھائی بھی راہ راست قبول کریں۔

۶۔ مزارعین اور زمینداروں دونوں میں صحیح اسلامی تعلیم پھیلائی جائے۔ ان کے درمیان معاشرتی مساوات اور اخوت کے جذبات پیدا کئے جائیں۔ اور ہر جگہ یہ کوشش کی جائے کہ پوری آبادی نماز باجماعت کی پابند ہو۔ زمینداروں کو اور بستیوں کے دوسرے خوشحال لوگوں کو بھی فریضۂ زکوٰۃ یاد دلایا جائے اور ایسا انتظام کیا جائے کہ ایک ایک بستی کی زکوٰۃ ایک جگہ جمع ہو کر منظم طریقہ سے مستحقین میں تقسیم ہونے لگے۔

۷۔ رشوت کا استیصال کرنے کے لئے اجتماعی کوشش کی جائے۔ لوگوں سے اس بات کا عہد لیا جائے کہ وہ متفق ہو کر سرکاری ملازمین کو رشوت دینا قطعی بند کر دیں گے۔

۸۔ زمینداروں کو تلقین کر دی جائے کہ وہ مزارعین پر ظلم کرنے کے لئے سرکاری آدمیوں سے کام نہ لیا کریں اور مزارعین کے خلاف اپنی جائز شکایات کا تدارک اس تنظیم کے ذریعہ سے کرائیں جو زرعی معاملات کی اصلاح کے لئے جماعت اسلامی قائم کر رہی ہے۔ اس تنظیم میں ایسے زمینداروں کو بھی شامل کیا جائے جو اصلاح قبول کر لیں۔ اور کوشش کی جائے کہ ہر جگہ اس تنظیم کے ماتحت مجالس مصالحت قائم کر دی جائیں۔

۹۔ دیہاتی علاقوں میں مہاجرین اور مقامی آبادی کی کش مکش کو روکا جائے اور پوری کوشش کی جائے کہ یہ دونوں عنصر باہم گھل مل جائیں اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں۔

۱۰۔ جو لوگ ملک کی موجودہ معاشی ناہمواریوں اور اجتماعی بے انصافیوں پر مضطرب ہیں ان کے ذہن میں یہ حقیقت اچھی طرح بٹھا دی جائے کہ ان کی مشکلات کا مستقل اور مکمل حل اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ یہاں خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نظام حکومت قائم ہو۔ اور اس کی زمام کار صالح لوگوں کے ہاتھ میں دی جائے۔ اس لئے

انہیں اصلاحِ احوال کی وقتی تدبیروں ہی پر قناعت نہ کر لینی چاہیئے بلکہ اس جدوجہد میں عملاً حصہ لینا چاہیئے جو بحیثیت مجموعی پورے ملک کے نظام کو تبدیل کرنے کے لئے کی جارہی ہے۔

قرارداد نمبر ۳:-

مزدوروں، پیشہ وروں اور کم تنخواہ پانے والے ملازمین کا مسئلہ

مجلس شوریٰ نے اوکاڑہ کانفرنس سے متعلق نعیم صدیقی صاحب کی رپورٹ پر غور کیا۔ کانفرنس کی سفارشات سے اتفاق کرتے ہوئے مجلس یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جہاں جہاں ممکن ہو مزدوروں، چھوٹی تنخواہ پانے والے ملازموں اور پیشہ ور لوگوں کی ایسی تنظیمات قائم کی جائیں یا اگر پہلے سے موجود ہوں تو ان میں جماعت اسلامی کے کارکن شریک ہو کر ان کی ایسے طریقوں پر اصلاح کی کوشش کریں، جن میں حسب ذیل امور خاص طور پر ملحوظ ہوں۔

۱:- ان تنظیمات کے شرکاء میں اسلام کا علم پھیلایا جائے۔ ان کو اسلام کی اطاعت اور اسلامی اخلاق کی پیروی کی طرف رغبت دلائی جائے۔ ان کو اپنے حقوق کے ساتھ اپنے فرائض کا بھی احساس دلایا جائے۔ اور اس امر کی پوری کوشش کی جائے کہ ہماری کارکن آبادی میں بالعموم سچائی، ایمانداری اور فرض شناسی کے اوصاف پیدا ہوں۔

۲:- ان کے مطالبات کو اصولی کفالت پر قائم کیا جائے اور ایسے رجحانات کا سدباب کیا جائے جن کا رخ قومی ملکیت کے تصور کی جانب ہے۔

۳:- ان کی تحریکات کو طبقاتی منافرت سے طبقاتی مصالحت کی طرف موڑنے کی کوشش کی جائے۔ اور اس غرض کے لئے محنت پیشہ طبقوں میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ ان طبقوں میں بھی متوازی کام کیا جائے جو ان سے محنت لیتے ہیں تاکہ وہ انصاف اور فیاضی کا معاملہ کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس سلسلہ میں ہماری تمام کوششوں کا مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ شکایات کا ازالہ صرف دباؤ پر منحصر نہ ہو بلکہ اخلاقی ذرائع کو مقدم رکھا جائے۔

۴:- جہاں شکایات کے ازالہ کے لئے دباؤ ڈالنا بالکل ناگزیر ہو وہاں اس کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جو تخریبی نہ ہوں، حتی الامکان مہذب اور معقول ہوں، اور جن میں پبلک کی عام ہمدردیاں محنت پیشہ طبقوں کو حاصل ہو سکیں۔

۵:۔ محنت پیشہ طبقوں پر ظلم کی ہر صورت میں ان کا پورا پورا ساتھ دیا جائے ۔ اور ظلم کرنے والوں کے خلاف رائے عامہ کو اس حد تک منظم کر دیا جائے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کا پلنا پھولنا غیر ممکن ہو جائے ۔

۶:۔ ان تمام تنظیمات اور تحریکات میں یہ امر ہمیشہ کارکن طبقوں کے ذہن نشین کیا جاتا رہے کہ ان کے تمام مسائل کا حل ان جزوی تدابیر سے نہیں ہو سکتا ، بلکہ پورے ملک میں ایک صحیح اسلامی نظام کے قیام ہی سے ہو سکتا ہے ۔

قرارداد نمبر ۴ :۔

مہاجرین کا مسئلہ مجلس شوریٰ مہاجرین کے مسئلے کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اس معاملہ میں ان ابتدائی غلطیوں سے قطع نظر جو مہاجرت کے پہلے دور میں کی گئی تھیں سردست حکومت کی پالیسی میں تین بڑی غلطیاں پائی جاتی ہیں جن کو درست کرنے کی فوری ضرورت ہے ۔

اول یہ کہ مہاجرین کی آباد کاری کے معاملہ میں کسی مستقل اور واضح پالیسی پر عمل نہیں کیا جا رہا ہے ، متروکہ اموال و املاک کی تقسیم میں مستحق اور غیر مستحق لوگوں کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی گئی ہے ۔ اور اکثر مستحق لوگوں کو چھوڑ کر غیر مستحق لوگوں کو بہت زیادہ دیا گیا ہے ۔ پھر جو کچھ مستحقین کو دیا بھی گیا ہے ، اس سے بھی وہ اطمینان کے ساتھ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۔ کیونکہ غیر مستقل الاٹمنٹ کی وجہ سے کوئی شخص بھی یہ نہیں جانتا کہ جس زمین ، مکان ، دوکان یا کارخانہ میں وہ بٹھایا گیا ہے اس سے وہ کب بے دخل کر دیا جائے گا ۔ اسی طرح پیشہ ور مہاجرین کی صنعتوں کو بحال کرنے کے لئے بھی کوئی معقول اور منظم کوشش اب تک نہیں کی گئی ہے ۔ اور نہ کاشتکار مہاجرین کو اس قابل بنایا گیا ہے کہ وہ مطمئن ہو کر زراعت کر سکیں ۔ نیز مالیہ اور کرایہ عائد کرنے میں بھی مہاجرین کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا گیا ہے ۔ یہ صورت حال ایک طرف تو مہاجرین کے لئے پریشان کن ہے اور دوسری طرف اس سے ملک کی معیشت کو بھی سخت نقصان پہنچ رہا ہے

دوم یہ کہ جو مہاجرین حال ہی میں ہندوستان سے پاکستان آ رہے ہیں ان کو واپس کرنے یا واپسی پر مجبور کرنے کی پالیسی اختیار کی جا رہی ہے یہ طرز عمل حقیقت میں بڑا ہی سنگدلانہ ہے ۔ اگر فی الواقع ارباب حکومت

اور دوسرا اس قوم کو تیقن ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حالات بالکل درست ہو چکے ہیں اور وہ اسباب باقی نہیں رہے ہیں جن کی بنا پر یہ لوگ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ تو زبان سے تلقین کرنے اور عملاً تنگ کرکے واپس بھیجنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ ہے کہ پہلے وہ خود ہندوستان واپس جا کر آباد ہوں۔

سوم یہ کہ جو لوگ اب ہندوستان سے اکثر اکثر آ رہے ہیں۔ ان کے لئے پاکستان کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ اس طریق کار کے لئے خواہ کیسے ہی معقول وجوہ بیان کئے جائیں لیکن کوئی شخص اس بات کو نہیں بھول سکتا کہ قیام پاکستان کے لئے خود اہل پاکستان نے وہ قربانیاں نہیں دی ہیں جو ان لوگوں نے دی ہیں جن پر آج پاکستان کا دروازہ بند کیا جا رہا ہے۔ اور کوئی شخص اس بات کی بدنمائی کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ ایک اسلامی ریاست ایسے مسلمانوں پر اپنا دروازہ بند کر رہی ہے جو اپنی جان، آبرو اور ایمان بچانے کے لئے اس کی پناہ لینا چاہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بے سر و سامان مہاجرین کی پیہم آمد پاکستان کی معیشت کے لئے نہایت پریشان کن ہے۔ لیکن اس کی روک تھام کے لئے صحیح تدبیر یہ نہیں ہے کہ آتے ہوئے لوگوں کو واپس کیا جائے اور آنے والوں کی آمد روک دی جائے بلکہ اس کی صحیح صورت صرف یہ ہے کہ ہندوستان میں وہ حالات پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جن میں مسلمان مطمئن ہو کر وہاں رہ سکیں

مجلس شوریٰ کو افسوس ہے کہ جماعت اسلامی مہاجرین کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کے لئے کوئی خدمت بجا نہیں دے سکتی۔ کیونکہ ان مسائل کا حل صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جن کے ہاتھ میں حکومت کے وسائل اور اختیارات ہوں۔ تاہم جو خدمت بحالات موجودہ یہ جماعت کر سکتی ہے کر رہی ہے۔ اور ان شاء اللہ آئندہ بھی کرتی رہے گی وہ یہ ہے کہ مہاجرین اور مقامی آبادی کی باہمی اجنبیت اور ان کے مناقشات کو رفع کرکے انہیں ایک ملت میں جذب کیا جائے۔ انہیں ایک دوسرے کا بھائی اور مددگار و معاون بنا دیا جائے۔ اور ان کی عام دینی و اخلاقی اصلاح کی جائے تاکہ ان سے ایک صالح معاشرہ وجود میں آئے۔

قرارداد نمبر ۵ :-

ریاستوں کا مسئلہ | جماعت اسلامی کے پیش نظر پاکستان میں جس اسلامی نظام کا قیام ہے بعینہٖ وہی نظام وہ ان ریاستوں میں بھی دیکھنا چاہتی ہے جو پاکستان سے ملحق ہیں۔ یہ نظام خدا کی حاکمیت کے اقرار، شریعت اسلامی کے

مکمل احیاء و نفاذ، انتظامِ حکومت پر جمہور کے کنٹرول اور عدل و مساوات کے اسلامی تصورات پر مبنی ہے اور اس کے ساتھ شخصی استبداد، مخصوص خاندانوں کی فرمانروائی اور حکومت میں وراثت و ولی عہدی کی وہ روایات بالکل ہی بے جوڑ ہیں جو پاکستان سے ملحق ریاستوں میں اب تک جوں کی توں قائم ہیں۔ اس بنا پر مجلس شوریٰ جماعت اسلامی حکومت پاکستان کی اس پالیسی کو بنیادی طور پر غلط سمجھتی ہے کہ وہ ریاستوں میں پرانے اور فرسودہ ملوکی نظام کی ابھی تک سرپرستی کئے جا رہی ہے، اس بات کو ضروری سمجھتی ہے کہ ریاستوں کے نظم و نسق کو جلدی سے جلدی کم از کم اس سطح پر لے آیا جائے جس پر اس وقت پاکستان کا نظم و نسق قائم ہے، ان تمام تحریکات سے اپنی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے جو ریاستوں میں شخصی استبداد کو ختم کرکے ایسی حکومت قائم کرنا چاہتی ہیں، جو جمہور کے سامنے جوابدہ ہوں اور والیانِ ریاست کو یہ مخلصانہ مشورہ دیتی ہے کہ وہ خود اپنی غیر اسلامی ترجیحات اور ایک فاسد نظام کی خرابیوں پر اصرار کرنا چھوڑ دیں اور اپنے آپ کو اور اپنی ریاستوں کو اسلام کے اصول و قوانین کا تابع بنا دیں۔ لیکن اس کے ساتھ مجلس شوریٰ یہ رائے بھی رکھتی ہے کہ ریاستوں کے نظام میں کوئی تبدیلی اس وقت تک عملاً ممکن نہیں ہے جب تک کہ پورے پاکستان کا نظام تبدیل نہ ہو جائے۔ لہٰذا اس کے نزدیک جماعت اسلامی کے ریاستی کارکنوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مقامی اصلاحات کی مساعی سے ہمدردی رکھتے ہوئے اپنی تمام کوششوں کو نظام پاکستان کی اصلاح کی جدوجہد پر مرکوز رکھیں اور مقامی اصلاح کے لئے سعی کرنے والوں کو اس وسیع تر اصلاح کی ضرورت کا احساس دلاتے رہیں۔

قرارداد نمبر ۹:-

منشور کی ترتیب

اب تک منشور کے سلسلے میں جو کام ہوا ہے، وہ امیر جماعت کے سامنے پیش کر دیا جائے اور وہ اپنے مشورے مسودے کے حاشیہ پر نوٹ کر دیں۔ پھر ان مشوروں کی روشنی میں منشور کمیٹی اس کی تکمیل کرکے اسے امیر جماعت کو دے دے اور وہ اس کمیٹی کے مشورہ سے اسے مکمل کر لیں۔ منشور کو مجلس شوریٰ کے سامنے دوبارہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

منشور کمیٹی کے لئے حسب ذیل ارکان شوریٰ کو منتخب کیا گیا۔

۱- مولانا امین احسن صاحب اصلاحی ۲- مولانا مسعود عالم صاحب ندوی ۳- محمد عبد الجبار صاحب غازی

۴۔ نعیم صدیقی صاحب ۵۔ چودھری علی احمد خاں صاحب۔

اس کمیٹی کے داعی (CONVENER) چودھری علی احمد خاں صاحب ہوں گے یہ کمیٹی شوال ۱۳۶۹ھ کے اواخر تک دستور کو مکمل کر کے امیر جماعت کے حوالے کر دے۔

قرارداد نمبر ۷ :۔

دستور جماعت اسلامی پاکستان کی ترمیم و ترتیب جماعت کے موجودہ دستور میں عرصے سے ترمیم اور اضافے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ جن حالات میں موجودہ دستور مرتب کیا گیا تھا وہ بہت حد تک بدل چکے ہیں۔ اس لئے دستور پر از سر نو غور کرنے اور ضروری ترمیمات اور اضافے تجویز کرنے کے لئے حسب ذیل ارکان پر مشتمل کمیٹی منتخب کی جائے گی۔

۱۔ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی ۲۔ محمد عبد الجبار صاحب غازی ۳۔ طفیل محمد صاحب قیم جماعت

اس کمیٹی کے داعی (CONVENER) طفیل محمد صاحب قیم جماعت ہوں گے۔ یہ کمیٹی دستور کا مسودہ اگست کے آخر تک مرتب کر کے امیر جماعت کے روبرو پیش کر دے۔ اور اس کے بعد یہ مسودہ ارکان اور ہمدردوں کے اظہار رائے کے لئے شائع کر دیا جائے۔ پھر ارکان کے اجتماع عام میں اس کو پاس کرا کے اسے باقاعدہ دستور جماعت کی شکل دے دی جائے۔

قرارداد نمبر ۸ :۔

تربیت ارکان کا مسئلہ جماعت اس وقت جن حالات سے دوچار ہے اور جو کام اس کے پیش نظر ہیں ان میں اب اس بات کا موقع نہیں ہے کہ ارکان کی تربیت کے لئے پہلے کی طرح باقاعدہ تربیت گاہیں قائم کی جائیں اب ارکان کی تربیت جو کچھ بھی ہوگی وہ ان کاموں ہی کے دوران میں ہوگی۔ جو آج جماعت کے پیش نظر ہیں

قرارداد نمبر ۹ :۔

تحقیقی شعبے کا قیام کوشش کی جائے کہ ارکان اور ہمدردان جماعت میں سے دو دو چار چار یا اس سے زائد افراد پر مشتمل ایسے گروپ بنا دیئے جائیں جو مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق علمی مسائل پر تحقیق و مطالعہ کا کام شروع کریں۔ اور امیر جماعت ہر گروپ کی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کے مطابق ان کے لئے مختلف موضوعات تجویز کر دیں۔ مثلاً دستوری مسائل، ملک کے داخلی مسائل، خارجہ پالیسی اور بانکاری وغیرہ

قرارداد نمبر ۱۰ :-

رابطۂ عوام کا مسئلہ (ا) مختلف مقامات پر جس جس طریق سے جماعت کے کارکن خدمت خلق کے عوامی کام کر رہے ہیں ان کی رپورٹیں مرکز میں طلب کی جاتی رہیں اور ان سے تمام حلقوں کو مطلع کیا جاتا رہے، تاکہ جہاں جہاں اس قسم کا کوئی کام نہیں ہو رہا وہاں کے کارکن ان رپورٹوں سے رہنمائی حاصل کرکے حسب حالات مناسب کاموں کا آغاز کر سکیں۔

(ب) ہمدردوں اور متفقین کی فہرستیں مرتب کرنے اور ان سے باقاعدہ فارم پُر کرانے کی جو مہم آج سے دو سال قبل شروع کی گئی تھی اس کی طرف پوری توجہ کی جائے۔ اور سوسائٹی کے اندر ان تمام مردوں اور عورتوں کو جو جماعت کے نصب العین اور طریق کار سے متفق ہوں متفقین میں، اور جو جماعت کے نظم میں اپنے آپ کو پوری طرح شریک کئے بغیر جماعت کے کاموں میں حصہ لینے کے لئے تیار رہیں انہیں ہمدردوں میں شامل کر لیا جائے۔

نوٹ:- مقامی رپورٹوں میں جو ماہوار، سہ ماہی ولا یا سالانہ اضلاع، حلقوں اور مرکز کو بھیجی جائیں ان میں ہمدردوں اور متفقین کی صرف تعداد کا اندراج کافی ہے۔ ان کے نام درج کرنے کی ضرورت نہیں۔

قرارداد نمبر ۱۱ :-

علیحدگیٔ ارکان یہ محسوس کیا گیا ہے کہ جماعت سے علیحدہ شدہ ارکان کی اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے بعض مقامات پر کچھ الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اس لئے آئندہ کے لئے یہ طے کیا جاتا ہے کہ جو لوگ جماعت سے الگ ہوں یا الگ کئے جائیں ان کی اطلاع تمام جماعتوں اور منفرد ارکان کو ہر مہینے بھیج دی جایا کرے۔ عام اعلان کرنے کی ضرورت نہیں۔ الّا یہ کہ کوئی علیحدہ شدہ شخص اپنی سابق حیثیت رکنیت کو ناجائز فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بنائے۔ یا اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ ایسا کریگا۔

قرارداد نمبر ۱۲ :-

بیرونی ممالک میں دعوت کا کام (ا) مولانا مسعود عالم صاحب ندوی رئیس دارالعروبہ کے سفر عراق، نجد و حجاز وغیرہ کی روداد کے بعد مجلس شوریٰ اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ بیرونی ممالک میں دعوت اسلامی کو پھیلانے کے پورے کام کو دارالعروبہ کے لئے موصوف ہی کی تحویل میں دیدیا جائے۔ خصوصاً انہیں انڈونیشیا میں دعوت کو پہنچانے کے لئے

ضروری ذرائع و وسائل اختیار کرنے پر متوجہ ہونا چاہیئے

(ب) آئندہ سال سے حج کے موقعہ پر ایک وفد اس غرض کے لئے بھیجا جایا کرے کہ وہ دنیا کے مختلف حصوں سے آنے والے لوگوں کو تحریک اسلامی سے متعارف کرائے اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے کہ وہ بھی اپنی اپنی جگہ اقامت دین کی منظم سعی کا آغاز کریں۔

قرارداد نمبر (۱۳)

ہندوستان اور دوسرے غیر ممالک کی جماعتہائے اسلامی کے ارکان کی حیثیت:

ہندوستان اور دوسرے غیر ممالک کی جماعت ہائے اسلامی کے ارکان کے بارے میں جماعت کی پالیسی اب تک یہ تھی کہ اگر وہ وہاں سے ترکِ وطن کرکے پاکستان آئیں تو ان کے محض یہ ثابت کر دینے پر کہ وہ وہاں کی جماعت اسلامی کے رکن تھے انھیں جماعت میں لے لیا جاتا تھا۔ لیکن اب مجلسِ شوریٰ نے تمام حالات پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ (۱۵ رجون ۵۵ء سے) ایسے تمام لوگوں کو جماعت میں شامل کرنے سے پہلے حسب ذیل دو باتوں کا اطمینان بہر حال ضروری ہے:-

(۱) یہ کہ وہ دستور جماعت اسلامی پاکستان کی رو سے جماعت کی رکنیت کے لئے موزوں ہیں۔

(۲) یہ کہ جس ملک سے منتقل ہو کر وہ آئے ہیں وہاں کی جماعتِ اسلامی کے نظم کو توڑ کر نہیں بلکہ اس کی اجازت سے آئے ہیں۔

قرارداد نمبر (۱۴)

مرکزی بیت المال کی امداد کا مسئلہ:

مرکزی بیت المال کی امداد کے لئے ستمبر ۵۴ء میں مجلسِ شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ

(۱) ماتحت بیت المالوں سے ان کی آمدنی کا جو دس فی صدی حصہ وصول کیا جاتا ہے اسے بڑھا کر بیس فی صدی کر دیا جائے (اور اس کے علاوہ)

(۲) ہر رکن کے ساتھ ایک ہمدرد کو ملا کر جملہ دو آدمیوں کی فی کس دس روپے کے حساب سے مرکزی بیت المال میں جلد از جلد اعانت روانہ کی جائے۔

شق نمبر(۲) میں مذکورہ امداد اس دوران میں صرف ایک مرتبہ وصول کی گئی ہے۔

اب اس بارے میں مجلسِ شوریٰ نے اپنے اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ ماتحت بیت المالوں میں سے ان کی آمدنی کا حصہ وصول کرنے کا قاعدہ ساقط کر دیا جائے اور وہ اپنی ساری آمدنی اپنے ہی کاموں کو بڑھانے اور ترقی دینے پر صرف کریں۔ مرکزی بیت المال کی امداد کے لئے مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مجلس کے ستمبر ۴۹ء والے مذکورہ بالا فیصلے کی شق نمبر(۲) کے مطابق ہر رکن جماعت پر لازم کیا جائے کہ وہ ہر سہ ماہی میں بیس روپے مرکزی بیت المال کی اعانت کے لئے ادا کرے اور اس رقم کی فراہمی کے لئے ارکان کو قریبی ہمدردوں اور اپنے دوسرے متمول لوگوں سے بھی مدد حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔

قرارداد نمبر(۱۵)

کُل پاکستان اجتماعِ عام کا مسئلہ:

اکتوبر ۵۰ء میں جماعت کا ایک کُل پاکستان اجتماعِ عام منعقد کیا جائے۔ اس اجتماع سے پہلے امیر جماعت اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کم سے کم مغربی پاکستان کا تفصیلی دورہ مکمل کرنے کی کوشش کریں۔

قیم جماعت اسلامی پاکستان

زیادہ کون اس بات کو چاہے گا کہ دونوں ہمسایہ ملکوں میں مضبوط دوستانہ روابط قائم ہوں۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے یہ کبھی پسند نہیں کیا کہ کسی ملک سے ہمارے دوستانہ یا مخالفانہ تعلقات کی بنیاد اینگلو امریکن بلاک کے اشارے پر ہو۔ ہمیں یہ سب کچھ اپنے نقطۂ نظر کے تحت کرنا چاہیئے اور ان معاملات میں ملک اور قوم کے اقتصادی مصالح اور دین کے مطالبات و مقتضیات ہمارے پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔ ہم چاہے کسی ملک سے دوستی کے کتنے ہی خواہشمند ہوں، لیکن ہمیں صرف وہی کچھ کرنا چاہیئے جو ہماری قومی خودداری اور اسلام کے اشاروں کے مطابق ہو، اپنا راستہ دیکھنے کے لئے اگر اپنی آنکھیں بے نور ہو جائیں تو پھر وہی حالت ہوتی ہے کہ من لم یجعل اللہ لہ نورا فما لہ من نور۔ ایسے لوگ جن کا تکیہ دوسروں کی آنکھوں اور دوسروں کی روشنی پر ہو وہ ہمیشہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔

ابھی ابھی ہندوستان اور پاکستان میں دوستانہ تعلقات کا جو معاہدہ ہوا ہے بطور مثال اسی کو لیجیئے۔ اس مبارک سے مبارک اقدام کے متعدد پہلو خطرناک ہیں۔ اس معاہدے میں بلا وجہ اسلامی نظام کے تصور پر ضرب لگائی گئی ہے۔ ہمارے وزیراعظم نے اس معاہدے میں پنڈت نہرو کے سامنے یہ وضاحت کر دی ہے کہ بابا! ہماری اور تمہاری جمہوریت میں فرق کیا ہے اور موجودہ دور میں مغربی جمہوریت کے سوا اور کس نمونے پر حکومت چلائی جا سکتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جن دونوں قوموں کے اکابر کی شکل و شباہت میں، طور طریق میں، زندگیوں کے نقشے میں اور معاشرتی رجحانات میں کوئی اصولی فرق نہ ہو ان کے لئے باہم اس قسم کی باتوں کا باور کرانا کیا مشکل ہے۔ چنانچہ کہا گیا کہ چند سرپھرے کٹھ ملاؤں کی باتوں کو کیوں پکڑتے ہو، یہ کوئی ساری قوم کی آواز تو ہے نہیں، کچھ لوگ شور مچا رہے ہیں، انھیں شور مچانے دو۔

یہ جانتے ہیں کہ اسلامی نظام کا مطالبہ ایک زندہ حقیقت ہے اور اب قوم کو اس سے منحرف نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کو نظر انداز کرنا اب بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن پھر بھی ہندوستان اور امریکہ میں جا کر اس طرح کی باتیں کی جاتی ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک قربان کرنے کی سب سے ارزاں چیز اسلام ہے اور یہی اس کی قربانی دینے میں بڑے فیاض واقع ہوئے ہیں۔

پھر آپ مسئلہ کشمیر کو لیجیئے۔ اس معاملے میں ہنوز روزِ اول کی کیفیت ہے۔ یہ تو مصلحت کے خلاف ہوگا کہ اس سلسلے میں کوئی پیشگوئی کی جائے۔ لیکن جس طریقے اور جس رفتار سے یہ مسئلہ حل کیا جا رہا ہے اس کے پیشِ نظر

بدگمانی کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ شاید ساری قوم کو دھوکے میں رکھا جا رہا ہے۔ آخر اس بات کے یقین کرنے کے لئے کونسی بنیاد ہے کہ کشمیر کے معاملے میں وہی ہو گا جس کا مطالبہ قوم کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ حالات کا مسلسل جائزہ لیتے رہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کی نگرانی کریں۔

پھر یہ پاکستان جسے بیش بہا قربانیوں کے بعد آپ نے حاصل کیا ہے، اس کی آزادی اور اس کی جداگانہ حیثیت کو ختم کرنے کے لئے آج یہ تجویزیں آنے لگی ہیں کہ انڈیا اور پاکستان دونوں ملکوں کا دفاع (DEFENCE) مشترک ہو جانا چاہیئے۔ آپ کی قومی آزادی کے حق میں خطرناک سے خطرناک نتیجہ اگر کسی تجویز کا ہو سکتا ہے تو وہ یہ تجویز ہے۔ ابھی یہ تجویز بظاہر صرف مشہور برطانوی فوجی جنرل سلم کی طرف سے آئی ہے، لیکن کیا آپ انکار کر سکتے ہیں کہ یہ اینگلو امریکن بلاک کی تجویز نہیں ہے اور یہ اسی کے ایما سے نہیں لائی گئی؟ ہمارے وہ بزرگ جو یو، این، او کا لہنگا دنیا بھر میں اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں کہ اس طرح پاکستان کو عزت و عظمت کا مقام حاصل ہوگا، کچھ ارشاد فرمائیں گے کہ آیا آپ کا مطلوبہ مقام یہی ہے جہاں جائنٹ ڈیفنس کی تجویزیں سامنے لائی جا رہی ہیں؟

ابھی آپ دیکھتے رہیئے، ابھی معاملہ صرف تجویزوں تک محدود ہے، اس کے بعد اس کی مصلحتیں سمجھائی جائیں گی، اخبارات میں ان مصلحتوں کے چرچے ہوں گے، یہاں تک کہ عوام کو یقین دلا دیا جائے گا کہ حالات ایسے ہیں کہ جائنٹ ڈیفنس کی تجویز کو اختیار کئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ——— اور عوام اپنے آپ کو بے بس پا کر سر تسلیم خم کر دیں گے۔ لیکن میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ آپ کی قومی آزادی اور آپ کے اسلامی نظام کے تصور کی قطعی موت ہوگی۔ اگر آپ نے اس مفسدانہ تجویز کو پنپنے کا کچھ بھی موقع دیا تو پھر مجھے بتایئے کہ آپ ان لاکھوں شہداء کو کیا جواب دیں گے جنھوں نے قوم کی آزادی اور زمین کے استقلال کے لئے قربانیاں دی تھیں!

اب میں مختصر طور پر یہ چاہتا ہوں کہ آپ سماجی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے اپنی ترقیوں کا جائزہ لیں کہ ان میں سے کونسی ترقیاں اسلام کی سمت میں ہوئی ہیں اور کتنی ترقیاں جاہلیت کی سمت میں ہوئی ہیں۔

اس بارے میں میرا مطالعہ یہ ہے کہ جس کام کو کرنے کی انگریز جرأت نہیں کر سکا اور وہ قوم کے مذہبی جذبات

دینیات سے ہمیشہ خوفزدہ رہا، اسے ہمارے لیڈر حضرات دن دہاڑے پوری جرأت سے کر رہے ہیں۔ اور اسے ثقافتِ اسلامی، تمدنِ اسلامی، اور نظامِ اسلامی کے احیاء و تجدید کا نام دے رہے ہیں۔ انگریز ہمارے اندر بے پردگی اور عورتوں مردوں کے بے باکانہ اختلاط کی وبا کو پھیلانا چاہتا تھا، لیکن ڈیڑھ صد دو سو سال کی جدوجہد کے باوجود تھوڑے سے لوگوں کے سوا باقی قوم کو بگاڑنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ جن چند خاندانوں کی عورتوں کو اس نے بگاڑنے میں کامیابی حاصل کی، ان خاندانوں کو جاہ و منصب سے نوازے جانے کے باوجود شرفا کی نگاہوں میں وقعت حاصل نہ ہو سکی۔ بلکہ وہ سوسائٹی میں نکو بن کر رہے اور ان کی عورتوں کو شریف بہو بیٹیوں نے اپنے لئے ایسا ہی نامحرم سمجھا جیسے کوئی اجنبی مرد نامحرم ہوتا ہے۔ انگریزی حکومت بڑے طنطنے کے باوجود یہ نہ کر سکی کہ کسی شمس العلماء قسم کے مولوی ہی کی زبان سے یہ کہلوا دے کہ صحابیات کی زندگیاں ایسی ہی بے پردہ تھیں۔ لیکن یہ کام قراردادِ مقاصد کے بعد ہماری اپنی حکومت نے کر دکھایا۔ اب سرکاری سرپرستی میں قوم کی بہو بیٹیوں کو یہ تربیت دی جا رہی ہے کہ وہ ٹپیکل امریکن گرل کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالیں اور مغربی طرز کی چھوکریاں بن کے رہیں۔ وہ قوم جو ہمیشہ عائشہؓ اور خدیجہؓ کی سیرتوں پر فخر کرتی رہی ہے آج اسی کی لیڈر خواتین مسز ٹرومین کو اپنے لئے مثال اور نمونہ قرار دیتی ہیں اور AMERICAN TYPICAL GIRL بننے کے لئے بے چین ہیں۔ ابھی پچھلے سال ان لیڈر خواتین نے سرکاری سرپرستی کے تحت عین گورنمنٹ ہاؤس میں آل پاکستان ویمن کانفرنس کے جس ادارے کا افتتاح کیا تھا اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عورتوں میں بے پردگی اور بے حیائی پھیلے۔ حکومت جو اسلامی نظام کی داعی ہے اس نے ان خواتین کو گارنٹی دی ہے کہ عورتوں کے جتنے معاملات و مسائل درپیش ہوں ان میں اس مبارک جماعت سے فتویٰ حاصل کیا جائے گا کہ وہ کس طرح کا نظامِ زندگی عورتوں کے لئے چاہتی ہے۔

جو نقطۂ نظر اس کانفرنس کا ہے اس کے بارے میں تفصیل سے کچھ کہنے کا موقع نہیں، البتہ خود سرکاری رپورٹ (PAKISTAN 2ND YEAR) کے مطابق اس کا جو مطمحِ نظر ایک صاحبہ کی تقریر میں واضح کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مغلوں کے زمانے میں ہماری لڑکیوں کے لئے گانا بجانا ایک ضروری تہذیبی عنصر کی حیثیت رکھتا تھا لیکن یہ مقامِ افسوس ہے کہ اب گانے بجانے کا رواج کم ہو گیا ہے اور انتہائی ماتم کا مقام یہ ہے کہ ہلکے فلمی گانوں سے

کچھ دلچسپی ہے بھی تو ٹپّے گانوں کی معرفت بہرحال خواتین میں نہیں رہی ہے۔ ان بے چاری کو یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اس معاملے میں عورتیں بالکل زیرو ہو گئی ہیں۔ اب یہ کانفرنس اس کمی کو پورا کرنے کے لئے میدان میں آئی ہے۔ یہ کانفرنس حلقوں کی اسلامی تہذیب اور اسلامی رقص و سرود کو جب تک واگہ کے اُس پار سے اٹھا کر ادھر نہ لے آئے چین سے نہ بیٹھے گی۔

کچھ اور مفتی ہیں جن کی طرف سے خواتین کو یہ سبق پڑھایا جا رہا ہے کہ یہ کہاں تم عائشہ بنتِ صدیقؓ اور فاطمہ بنتِ محمدؐ کے چکر میں پڑی ہوئی ہو، تمہارے لئے تو اسوۂ حسنہ عائشہ بنتِ علی اور سکینہ بنتِ حسین ہیں۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ عائشہ بنتِ علی وہ ہیں جو سوسائٹی میں پوری شان سے بے پردگی کے ساتھ گھوما کرتی تھیں اور اس پر استدلال یہ کرتی تھیں کہ خدا نے جب مجھے حسن و جمال دیا ہے تو میں پھر اپنا چہرہ کیوں ڈھانپوں؟ حسن و جمال تو اسی لئے ہوتا ہے کہ دیکھا اور دکھایا جائے۔ اور یہ سکینہ بنت حسین وہ ہیں جن کے جوڑے کا فیشن تمام مدینے میں مشہور تھا اور جو اپنے ارد گرد بھانڈوں اور گویوں کو جمع رکھتی تھیں۔

صدیق اکبرؓ کی نواسی کی یہ تصویر اور امام حسین کی صاحبزادی کی یہ تصویر کسی دیانت دار مؤرخ کے ہاں آپ کو نہ ملے گی۔ کتاب الاغانی جیسی لغو اور بے بنیاد کتابوں کے حوالے سے امت کی ان بیٹیوں کی تاریخ بیان کی جاتی ہے اور پھر کہا جاتا ہے کہ یہ کیا مطمحِ نظر ہے کہ ایک شوہر تلاش کر لیا اور اسے معبود بنا کر بیٹھ گئیں گھروں سے باہر نکلو اور تعمیرِ ملت کے وسیع میدانوں میں ترقی کرو ——— اور تعمیرِ ملت کا جزوِ اکبر کیا ہے؟ ناچنا اور گانا! ——— پھر یہ سبق بہوؤں اور بیٹیوں کو سکھایا جا رہا ہے کہ نکاح وغیرہ کی جکڑ بندیاں ہماری اپنی بنائی ہوئی ہیں اور ان میں حسبِ منشا تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ خدا کو اس میں آخر کیا دخل۔ کل ہم نے جو پابندیاں اختیار کی تھیں ان سے ہم آج آزاد ہونا چاہیں تو ہو جائیں۔

اس بے پردگی کی مہم کو پھیلانے کے نت نئے طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ ملک میں جا بجا اسی مقصد کے لئے مینا بازار منعقد کئے جاتے ہیں، ببل چودھری اور اس کی پارٹی شہر بہ شہر گھومتی ہے اور حکومت اسلام کے احیاء کے نقطۂ نظر سے اس کی سرپرستی فرماتی ہے۔ چنانچہ آج پاکستان میں ببل چودھری سے بڑا کوئی چودھری نہیں۔ بے پردگی ہی کے فروغ کے لئے بعض جغادری مؤرخین کی طرف سے یہ کہلوایا جا رہا ہے کہ طائف اور

مدینہ کی تہذیب میں تو یہ چیز تھی ہی نہیں، یہ تو بعد میں کچھ بد اخلاق لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے عورتوں کو پیچھے دھکیل دیا۔

قومی اور مجلسی تقاریب کا کوئی پروگرام ہو، تو اس میں کوئی اور بات ہو یا نہ ہو، عورتوں اور مردوں کا مخلوط اجتماع ضروری سمجھا جاتا ہے، اس کے بغیر تقاریب کی خوشی اور رونق پوری ہی نہیں ہوتی۔

آرٹ میں سب سے زیادہ اہمیت اس آرٹ کو دی جارہی ہے جس کی سرپرست بیگم آذوری ہیں۔ یہ صاحبہ اس فکر میں گھلی جارہی ہیں کہ "خشک ناچ" جو مغلوں کی اسلامی تہذیب کا قیمتی ترکہ ہے اسے کس طرح پاکستان میں فروغ دیا جائے، اور آنریبل وزیر تعلیمات پنجاب انہیں اپنی سرپرستی کا یقین دلاتے ہیں۔ یہ بیگم آذوری جو اسلامی تہذیب و تمدن کے احیاء کی علمبردار ہیں .... اب ان کے ہاتھوں اگر ترقی ہوگی تو آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ کس سمت میں ہوگی اور یہ آپ کو کس سمت میں لے جائیگی۔

اب مجھے سب سے زیادہ جس چیز پر توجہ دلانی ہے وہ آپ کی مذہبی حالت ہے۔ یہ پہلو درحقیقت سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اس وجہ سے آپ کو پوری باریک بینی سے جائزہ لینا چاہیے کہ مذہبی حیثیت سے آپ کو کس مقام پر لاکر کھڑا کیا گیا ہے۔

آپ کی دستوریہ نے جو قرارداد مقاصد پاس کی ہے اس کے مضمرات پنہاں کو آپ میں سے بہت سے لوگ جان چکے ہیں۔ اس قرارداد میں دستوریہ نے اعلان و اقرار کیا ہے کہ ملک کی حاکمیت اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے لئے ہے اور حکومت پاکستان کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ خدا کے ملک میں، اسی کی حدود کے اندر اسی کی مرضی کو پورا کرے۔ پھر اس میں یہ اعلان و اقرار بھی کیا گیا ہے کہ حکومت اس ملک کے مسلمان باشندوں کو اس قابل بنائے گی کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو اسلام کے اصولوں اور تقاضوں کے مطابق ڈھال سکیں۔

پھر اس بات کا اقرار بھی کیا گیا ہے کہ یہاں جو نظام چلے گا وہ حریت، مساوات اور اجتماعی عدل کے خالص اسلامی اصولوں کے مطابق چلے گا۔

اب آیئے اور جائزہ لیجئے کہ گزشتہ ڈیڑھ سال میں اس پہلو سے کیا کام اب تک ہوا ہے؟ جہاں تک اسلامی آئیڈیالوجی کا تعلق ہے، اسے قرارداد مقاصد میں جس طرح بیان کردیا گیا ہے اس سے زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو عمل میں لانے کے لئے کتاب

سنت کے اسلام کی طرف کتنے قدم آپ نے بڑھائے ہیں؟ آپ کے ملک میں جو نظامِ تعلیم قائم ہے وہ آج بھی ٹھیک میکالے کے نظریات پر قائم ہے۔ میکالے نے یہ نظامِ تعلیم اس مقصد کے لئے وضع کیا تھا کہ ملک و قوم کے اندر سے انگریزی نظام کے لئے کرائے کے کلرک مہیا کئے جائیں۔ وہ نظام بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے بدستور چل رہا ہے، اگر کوئی فرق ہوا ہے تو صرف اس پہلو سے کہ تعلیمی معیار پہلے کے مقابلے میں گر گیا ہے۔ اساتذہ کی قابلیت و محنت کا معیار کم ہوا ہے، طلباء کے شوقِ علم میں کمی آگئی ہے اور امتحانات میں پاس ہونے والوں کا تناسب گھٹ گیا ہے لیکن مقاصد کے لحاظ سے یہ نظامِ تعلیم انہی پرانے مقاصد کے تحت چل رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدائی حاکمیت پر دستوریہ کے ایمان لانے کے بعد اس ملک میں میکالے کے نظامِ تعلیم کے شیطانی ڈھانچے کی پرستش کرتے چلے جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ آپ تعلیمی نتائج پر غور کریں، صلاحیت اور EFFICIENCEY کے معیار پر غور کریں اور مجھے یہ بھی بتائیں کہ اس نظامِ تعلیم میں وہ قرآن کہاں ہے جو آپ کی ساری تعلیم کی اساس ہونا چاہئے؟ وہ سنتِ رسول کہاں ہے جو آپ کی ساری زندگی کے لئے نمونہ ہے؟ اسلام کے وہ انفرادی اور اجتماعی ضابطے کہاں ہیں جن پر نظامِ زندگی قائم ہوتا ہے؟ پھر ذرا آپ چراغ لے کر وہ مقدس چہرے تو ڈھونڈ کر دکھا دیجئے جو طلباء کو دین کے اسرار سے آگاہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں! کیا کوئی ایک ادارہ ایسا ہے جس میں اسلامی نظامِ زندگی کی تعلیم و تربیت دینے کا انتظام کیا گیا ہو؟

جس ملک میں اسلامی نظام نافذ ہونے والا ہے اس میں یہ ذہنوں کی پستی، طبائع کے افلاس اور ہمت کی کمزوری کا روشن ثبوت ہے کہ آج بھی ہمارے ائمہ مساجد دعوت دیتے ہیں کہ آؤ تعلیمِ دین خطرے میں ہے، ہمارے مدرسے کی مدد کرو، اور پھر بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں اتنا چندہ ملا۔ کیا اسی ملک میں قرآن کا نظام قائم ہوگا جس میں آج تک ہمارے ناظمین مدارس دینیات کو اس سے نجات نہ مل سکی کہ وہ دربدر پھر کر تعلیمِ دین کے لئے چندہ جمع کریں؟

جیل میں جب ہم نے یہ خبر پڑھی کہ سرکاری ابتدائی مدرسوں میں قرآن کی تعلیم کا انتظام کیا جا رہا ہے تو وہ رات ہمارے لئے بڑی ہی مبارک رات تھی، لیکن اس کی تفصیل جب سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ حکومت نے اللہ میاں کے دین پر بڑا احسان دھرتے ہوئے اس بات کا انتظام کر دیا ہے کہ روزانہ ۵ منٹ طلبا کو قرآن

پڑھایا جائے۔ شاید اس خبر پر آسمانوں کے فرشتوں نے خوشیاں منائی ہوں گی کہ اللہ میاں کے بندوں نے بڑا کرم کیا۔

بس یہ ہے ہمارے لیڈر حضرات کا اسلامی نظام تعلیم!

کیا فی الواقع اس کی ضرورت نہیں کہ موجودہ نظام تعلیم کو توڑ پھوڑ دیا جائے اور جلد از جلد وہ علماء اور ماہرین فنون پیدا کرنے کا انتظام کیا جائے جن کی ضرورت اسلامی نظام زندگی کے ہر شعبے کو ہوگی؟ اس مقصد کے لئے جس تعلیم کی ضرورت ہے اس کے لئے کم سے کم یہ تو طے کیا جاتا کہ اس کا فلسفہ نظام کیا ہونا چاہئیے؟ اس میں آخر دیر کیوں؟ وہ کونسا زمانہ آئے گا کہ مطلوبہ دل و دماغ کے کارکن پیدا ہونے شروع ہوں۔ میرا تو خیال ہے کہ یہی حال رہا تو وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔ اب یہ آپ کا فرض ہے کہ اپنے ملک کی تعلیمی جدوجہد پر باقاعدہ غور کریں۔

دوسری طرف میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ قیادت کے عملی پہلو کی طرف مبذول کراؤں، کیونکہ یہ عملی پہلو بھی تعلیم و تربیت میں گہرا دخل رکھتا ہے۔ ایک عام بیماری جس میں ہمارے کارپردازوں میں سے ایک ایک نے اپنے آپ کو پوری طرح مبتلا کر لیا ہے وہ یہ ہے کہ جب ان میں سے کوئی تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ یہ زعم رکھتا ہے کہ اسلام نے زندگی کا جو نمونہ اور جو معاشرتی نقشہ تجویز کیا ہے اُس پر ہم تو قائم ہیں، اور سو فی صدی قائم ہیں لیکن قوم ہے کہ نالائقی کا ثبوت دے رہی ہے۔ یہ ایک عجیب ماجرا ہے کہ یہ لوگ نہ مسجدوں میں حاضری دیں نہ حج کریں، نہ زکوٰۃ ادا کریں، نہ اسلام کے اخلاقی و معاشرتی احکام و حدود کے پابند ہوں، بلکہ الٹا دھڑتے سے منہیات کی سرپرستی کریں، اور پھر یہ زعم کہ ہماری زندگیاں اسلام کا کامل نمونہ ہیں، اور اس کے بعد عوام کے سامنے یہ وعظ کہ مسلمانو! دیکھتے نہیں کہ اسلامی نظام قائم ہو رہا ہے، اٹھو اور جلد از جلد اپنی زندگیاں بدل ڈالو۔ یاد رکھئے کہ لیڈروں کے بدلے بغیر قوم کا بدلنا ممکن نہیں ہے جب تک ہمارے کارپرداز عملاً مسلمان نہیں بنتے، ان کے خوشنما وعظوں سے قوم اسلام پر عمل پیرا نہیں ہو سکتی۔ یہ ہمارے گورنر، ڈپٹی کمشنر، وزراء اور دوسرے حکام جب تک خود سب سے پہلے مسجدوں میں پنج وقتہ حاضری نہ دیں، اپنی پیشانیاں خدا کے حضور نہ رگڑیں، اور اپنی موجودہ فاسقانہ زندگی سے باز نہ آئیں تو ان کا یہ سمجھنا کہ قوم پاکباز بن جائے گی، ایک ایسی غلط فہمی ہے جس سے بڑی کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ لیکن آپ حضرات بتائیے کہ کیا ہمارے کارپردازوں میں اس طرح کی کوئی عملی تبدیلی رونما ہوئی ہے یا یا انھوں نے حکومت کے ذرائع و وسائل کو فسق و فجور کے فروغ میں استعمال کرنا ختم کر دیا ہے؟ ——— ہرگز نہیں!

آپ کا ریڈیو صبح سے شام تک برابر غلاظت بکھیرتا رہتا ہے۔ انگریز نے بھی اس بے باکی سے ذہنی اور اخلاقی غلاظت نشر نہ کی تھی جس بیباکی سے کہ آج کی جا رہی ہے۔ آپ کے سینما گھر پہلے سے بڑھ چڑھ کر ہوسناکیوں اور شہوتوں کی تعلیم دینے میں مصروف ہیں۔ آپ کی گھریلو اور مجلسی زندگیاں ویسی ہی رندانہ ہیں جیسی صاحب بہادروں کی ہوا کرتی تھیں۔ پھر آپ کو آخر کیا حق پہنچتا ہے کہ آپ قوم کے سامنے یہ وعظ کہیں کہ تقویٰ اختیار کرو اور مقدس بن جاؤ۔ آپ تو وہی رہیں جو کچھ ہیں، لیکن قوم فرشتوں کی قوم بن جائے۔

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تعلیم یہ تھا کہ عوام کو آپ جس مسلک کی ہدایت کرتے تھے اس پر سب سے بڑھ چڑھ کر خود عامل ہوتے تھے۔ آنحضور نے امت کو بھی یہی طریقہ سکھایا ہے کہ جو کچھ زبانوں سے کہو، اُسے کر کے بھی دکھاؤ۔ اسلام میں اصول یہ ہے کہ کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون! چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کے نام یہ فرمان لکھوایا تھا کہ جس طریقے پر وہ عوام کو چلانا چاہتے ہیں اس کا نمونہ پہلے خود بنیں۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ لوگ پابند نماز ہوں تو ان کا فرض یہ ہے کہ وہ خود امام نماز بنیں، اگر وہ چاہتے ہیں کہ لوگ دیانتدار ہوں تو خود دیانتدار بنیں، اگر وہ چاہتے ہیں کہ لوگ متقی بنیں تو پہلے وہ خود متقی بنیں۔ یاد رکھو کہ اگر تم خود گمراہ ہو گے تو قوم کبھی ہدایت نہ پا سکے گی اور قیامت کے دن تم کو اس کی گمراہی کے بارے میں جواب دہی کرنی ہو گی۔

یہاں یہ حال ہے کہ ہمیں وعظ پلایا جا رہا ہے کہ پہلے لائق بنو، پھر تم کو اسلامی نظام قائم کر کے دیا جائے گا۔ خود تو اسلامی ثقافت کی تجدید کے لئے بلبل چوہدری کے ناچ گانوں کی سرپرستی فرماتے رہیں گے، لیکن قوم کو یہ دعوت دیں گے کہ تم لوگ عمر فاروق کی زندگیوں کا نمونہ پیدا کر کے دکھاؤ۔

حضرات یہ ہیں وہ حالات جن میں ہم گھرے ہیں اور یہ ہے وہ مقام جس پر لا کر ہمیں کھڑا کر دیا گیا ہے!

اب اس تاریخی دوراہے پر آنے کے بعد آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ آیا آپ کو اپنے موجودہ لیڈروں کے پیچھے پیچھے فسق و فجور کی راہ پر جانا ہے، یا آپ کی منزلِ مقصود اسلام ہے؟

اب میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہماری قوم کو نفاق کی بیماری سے بچائے اور پوری یکسوئی کے ساتھ اسلام پر چلنے کی توفیق دے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ہ

(بقیہ اشارات)

میں خود جو کچھ لکھ سکتا ہوں ان شاء اللہ ضرور لکھتا رہوں گا۔ تفہیم القرآن کا سلسلہ بھی آئندہ اشاعت سے از سرِ نو شروع کر دوں گا۔ لیکن پرچے کو مرتب کرنے کی ذمہ داری حسبِ سابق نعیم صاحب ہی کے سپرد رہے گی۔

دوسری ضروری گزارش پرچے کی قیمت کے بارے میں ہے۔ پچھلے چند سال میں ہر چیز کی قیمتیں چڑھ کر کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہیں۔ اسبابِ اشاعت اور اسبابِ زندگی، دونوں ہی حد سے زیادہ گراں ہو چکے ہیں۔ میں نے اب تک سخت سے سخت حالات میں بھی یہ کوشش کی ہے کہ پرچے کی قیمت نہ بڑھائی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے خرید سکیں۔ لیکن اب مسلسل نقصان کے ساتھ اس پرچے کو زندہ رکھنا مشکل ہے۔ اس لئے مجبوراً ماہِ شعبان سے سالانہ قیمت میں ایک روپے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ خدا کرے کہ حالات کی یہ سختی دور ہو جائے اور ہم پھر پچھلی قیمت کی طرف عود کر سکیں۔

مطبوعات

فلسفۂ تعلیم و تربیت

مؤلفہ: محمد عطیہ الابراشی پروفیسر علم النفس، دار العلوم مصر۔
مترجمہ: جناب رئیس احمد صاحب جعفری۔

شائع کردہ: کتاب منزل کشمیری بازار لاہور و فریر روڈ کراچی۔
قیمت، مجلد مع گرد پوش، تین روپے بارہ آنے (صفحات ۳۶۸)

حکمرانوں اور رئیسوں کا مصر عام مسلمانوں کے رجحانات کے خلاف تہذیب و سیاست میں بھی اور تعلیمات میں بھی فرنگی نقطۂ نگاہ کو پوری وفاداری و نیازمندی سے قبول کر چکا ہے۔ چنانچہ علم و ادب کی دنیا کی تعمیر مغرب سے درآمد کردہ فکری مسالے سے ہو رہی ہے۔ آج کل مصر دوسرے مسلمان ملکوں سے جتنا تقلیدِ مغرب میں آگے ہے، اتنا ہی وہ مغربی علوم پر کتابیں شائع کرنے اور یورپین مصنفین کی کتابوں کے تراجم پیش کرنے میں بھی پیش پیش ہے۔ اس طرح وہ مشرقِ وسطیٰ کا علمی و ادبی لیڈر بن رہا ہے۔ پاکستان میں بھی مصر کی "علمی ترقیوں" کے بھرم سے کچھ لوگ متاثر ہیں اور وہ کسی مصری کتاب کے ترجمے کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ہمارے سامنے جس مصری کتاب کا ترجمہ مذکورہ بالا عنوان سے تبصرے کے لئے رکھا ہے، یہ اپنے موضوع پر معلومات تو خاصے سمیٹے ہوئے ہے، لیکن اس پر بھی گواہ ہے کہ مصر کا اپنا فکری افلاس کس انتہا درجے کی پستی پر پہنچ گیا ہے کہ تعلیم و تربیت کے اصول، فلسفے اور نظام پر جو کچھ اس کے مصنفین کو مغرب سے ملتا ہے اس پر کسی طرح کی تنقید کئے بغیر اور اس میں کوئی ردّ و بدل کئے بغیر جوں کا توں اٹھا لاتے ہیں۔ ان کے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی ہے کہ اسلام جو ہمہ تن ایک "تعلیمی و تبلیغی" دین ہے اور جس کا بڑا مقصد ہی یہ ہے کہ اپنے خاص نظامِ زندگی کے لئے مطلوبہ نوعیت کے انسان تعمیر کرے اور ان کی ذہنی، اعتقادی، اخلاقی اور عملی تربیت کا اہتمام کرے، اپنا کوئی خاص زاویۂ نظر تعلیم و تربیت کے باب میں رکھتا ہے۔ یہ کتاب جن مطالب پر مشتمل ہے وہ غلامانہ ذہنیت کے ساتھ اس طرح قبول کئے گئے ہیں گویا عرش بریں سے وحی

آخری پہلو اس میں تحریف و ترمیم کرنا منافی ایمان اور مفسدِ آخرت ہوگا۔

ہمارے ملک کے مشہور ادیب رئیس احمد صاحب جعفری نے اس کتاب کو اردو کا جامہ پہنانے کے لئے منتخب کیا ہے۔ بلاشبہ ان کی خدمت اس لحاظ سے قدر کی مستحق ہے کہ ہماری نوخیز نسل کے اساتذہ اور والدین اور عام پڑھے لکھے لوگ اس کے ذریعے یہ جان سکتے ہیں کہ مغربی ممالک نے اپنے فلسفۂ حیات کے سانچے میں مستقبل کے انسانوں کو ڈھالنے کے لئے کتنی فکری کاوشیں اور کتنے عملی تجربات کر ڈالے ہیں اور تعلیم و تربیت کے فن کو فروغ دینے کے لئے کتنے ہی مختلف مدارس فکر و عمل وجود میں آ چکے ہیں ——

لیکن جب ہم اس نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں کہ ہمیں ایک اسلامی نظام تعلیم و تربیت کی تعمیر میں یہ کتاب کس حد تک مدد دے سکتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایک مصری کتاب کا ترجمہ شائع کرنے سے بہتر یہ ہوتا کہ جعفری صاحب بطور خود ایک نئے زاویۂ نگاہ کے ساتھ مغرب کی کاوشوں سے استفادہ کرتے ہوئے کوئی تحقیقی چیز پیش کرتے۔ لیکن چونکہ ترجموں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس لئے بدرجۂ آخر کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب پر ایک جامع مقدمہ ایسا لکھا جانا چاہئے تھا جس میں اسلامی فلسفۂ تعلیم و تربیت کو نمایاں کیا جاتا اور اسی فلسفہ کی روشنی میں پیشِ نظر کتاب پر مترجم خود ایک تبصرہ فرما دیتے۔ یہ چیز عام مطالعہ کرنے والوں کو بڑی مدد بہم پہنچاتی۔

تاہم اب جبکہ ایک کتاب ہمارے سامنے تبصرہ کے لئے آئی ہے تو اب ہم اس پر اسی حیثیت سے غور کریں گے جیسی کچھ کہ یہ ہے۔

کتاب سے ہمارا اولین تاثر یہ ہے کہ اس میں روانی و بے ساختگی کی کمی ہے۔ یہ چیز اگر اصل کتاب میں تھی تو قصور مصنف کا ہے، لیکن اگر یہ ترجمہ کی وجہ سے ہے تو ذمہ داری مترجم پر ہے۔ اس قسم کے خشک موضوعات پر جو کچھ لکھا جائے اس میں اگر زبان کی شگفتگی اور اسلوب کی ندرت موجود نہ ہو تو پڑھنے والوں کی تعداد ہمیشہ کم رہا کرتی ہے۔

کتاب کے ابواب کی ترتیب یا پھر ان کی عنوان بندی میں کچھ نہ کچھ بے تکا پن جھلکتا ہے۔ مثلاً پہلا باب "تربیت اور اس کا مفہوم" ہے، دوسرا "تربیت کی اہمیت" اور پھر متعدد ابواب تربیت کی اقسام کے متعلق

چلتے ہیں، لیکن یکایک دیکھتے ہیں تو ساتواں باب محض "تربیت" کے عنوان سے سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح چوتھا باب ہے "صحیح اور موزوں تربیت" لیکن اس کے ساتھ ہی پانچواں باب "تربیت صحیحہ" کا ہے۔ دونوں کے عنوان کے معنی و مفہوم میں کوئی فرق نہیں۔ اکیسواں باب "مدرسہ" کا ہے اور بائیسواں بھی اسی عنوان سے ہے۔ اکتیسواں باب ہے "بچوں کی توجیہیں" اور اس عنوان کا کچھ مفہوم سمجھ میں نہ آسکے گا تاوقتیکہ سارا باب نہ پڑھ لیا جائے۔

علاوہ بریں اصطلاحات کے تراجم میں بھی ضروری حد تک غور و خوض نہیں کیا گیا بلکہ بیشتر اصطلاحات اصل کتاب سے جوں کی توں لے لی گئی ہیں جو مصری ذہن کے لئے تو قابلِ ہضم ہیں، لیکن اردو کا مزاج ان کو جزو بدن نہ بنا سکے گا۔ مثلاً طریقۂ تنغیبہ، طریقۂ تدریب و مرانت، طریقۂ ابتکار و انتاج ——— وغیرہ! اسی طرح انگریزی اصطلاح THE MEASURMENT OF NITELLEGENCE کا ترجمہ "ذہانت کا پیمانہ" کیا گیا ہے۔ اس کے بجائے "پیمائشِ ذہانت" موزوں تر تھا، لیکن دونوں صورتوں میں اصطلاح کا مزاج تمام تر انگریزی ہی بنتا ہے۔ اردو میں قابلیتوں اور ذہنی و دماغی خوبیوں کے بارے میں ناپنے اور پیمائش کرنے کے محاورات نہیں پائے جاتے، بلکہ یہاں ان امور کے لئے "تولنے" کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، جیسے کہ اقبال نے کہا ہے کہ:-

بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے!

پس مذکورہ اصطلاح کو اردو کے مزاج کے سانچے میں ڈھلنے کی صورت میں صحیح ترجمہ ہوگا "میزانِ ذہانت" اور اس کے ساتھ "وزنِ ذہانت" "توازنِ ذہانت" وغیرہ کی اصطلاحات بھی وجود میں آئیں گی، جو اپنے اپنے موقعوں پر کام دیں گی۔

بہرحال تعلیم و تربیت کے فن پر ہمارے ہاں کتابوں کی جو کمی ہے، اس کے پیشِ نظر ہمیں اس کتاب کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ اس کے معلومات افزا ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ (ن۔ ص)

منشورِ اقوامِ متحدہ

مرتبہ و مترجمہ: جناب احمد عبداللہ المسدوسی صاحب بی، اے، ایل، ایل، بی۔
شائع کردہ: مکتبہ خدام امت۔ اے۔ ایم۔ ۳۔ فریر روڈ۔ کراچی۔

قیمت: مجلد مع گردپوش ۔ سات روپے (صفحات ۴۷۹)

آج کی دُنیا کی بین الاقوامی سیاست کے دامِ اقوام گیر کی مرکزی گرہ مجلس اقوام متحدہ ہے اور معاملات کی ساری ڈوریوں کے سرے اسی گرہ پر آ کے جُٹتے ہیں۔ پس آج یہ ناگزیر ہے کہ دُنیا کے حالات کا صحیح فہم حاصل کرنے کے لئے اقوام متحدہ کے ادارے کی نوعیت، اس کے نظم، اس کے دستور، اس کے بنیادی اصولوں اور اس کے طریق کار کو سمجھا جائے۔ علاوہ بریں چونکہ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں اور مضامین میں اقوام متحدہ کی ذیلی تنظیموں، اس کے منشورات اور سمجھوتوں کا برابر ذکر آتا رہتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اخبار بین طبقے کو معلوم ہو کہ میثاقِ مجلسِ اقوام، منشور اٹلانٹک، اعلانِ ماسکو، اعلانِ طہران، اعلانِ پوٹسڈم وغیرہ کیا ہیں، اور اسی طرح بین الاقوامی تنظیم پناہ گزینان، بین الاقوامی تعمیری بنک، بین الاقوامی تنظیم صحت وغیرہ ادارت کی حقیقت کیا ہے۔ اس قسم کی معلومات کے لئے یورپ کی ہر زبان میں نو بہ نو کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں اور مدیرانِ جرائد، مصنفین، اربابِ سیاست اور عام تعلیم یافتہ لوگ ان سے برابر استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن اردو زبان میں معلوماتی اور خصوصاً کتبِ حوالہ (BOOK OF REFERENCES) وغیرہ فراہم کرنے کا اہتمام نہیں ہے۔ خود اقوام متحدہ کے متعلق بھی کوئی جامع کتاب اب تک نہ تھی۔ لیکن پیشِ نظر اس موضوع پر خاصی جامع ہے۔ اقوام متحدہ کے تمام اداروں، تمام منشورات و اعلانات وغیرہ کی تفصیلات پیش کردی گئی ہیں۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے، قانونی دستاویزات کا ترجمہ کرنا اپنے اندر جو مشکلات رکھتا ہے، افسوس ہے کہ مترجم اُن سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہوسکے، اس وجہ سے ترجمہ نہایت جا بیانہ ہے۔ یعنی یہ بات صاف جھلکتی ہے کہ قانونی زبان اور اصطلاحات کا کوئی ماہر ترجمہ نہیں کر رہا۔

ہماری رائے میں کتاب کی قیمت ضرورت سے زیادہ ہے۔

اسلام اور اشتراکیت

مؤلفہ: پیرزادہ ابوالضیا محمد بہاء الحق صاحب قاسمی امرتسری۔

شائع کردہ: ادارۂ قاسمیہ، وزیر آباد۔

قیمت: مع محصول ڈاک دس آنے (صفحات ۸۰)

مؤلف نے اس پمفلٹ میں اشتراکی فلسفۂ نظام کے خلاف اسلام ہونے پر مختصراً ضروری معلومات جمع کی ہیں اور اس کے بالمقابل اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے۔ کتاب بہرحال غیر مفید نہیں، لیکن اس موضوع پر پہلے جو چند چیزیں شائع ہو چکی ہیں، ان پر کسی پہلو سے مؤلف نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔

امتیازِ راہ

مؤلفہ: اسرار احمد صاحب سہاروی، ایم، اے، ایل، ایل، بی (علیگ)

شائع کردہ: فتح آباد کتاب گھر، زیر دروازہ حافظ آباد۔ ضلع گجرانوالہ۔

قیمت: بارہ آنے (صفحات ۷۰)

یہ مختصر سی کتاب دراصل جرمن نومسلم محمد اسد کی مشہور تالیف "اسلام دوراہے پر" سے ماخوذ ہے۔ اسرار احمد صاحب نے اس ایمان افروز کتاب میں ایک خاص اثر محسوس کیا، اور پھر اس کے مضامین کے اقتباسات لے کر ان پر تبصرے کے طور پر ایک سلسلۂ مضامین قلمبند کیا جس کے اجزا مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ اب اسی سلسلۂ مضامین کو امتیازِ راہ کے عنوان سے موصوف نے پیش کر دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہمارے نوجوان خاصا استفادہ کر سکتے ہیں۔

کتاب کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس کی طباعت و کتابت کیوں اتنی پست رہ گئی۔ اس معاملے میں وقت کے معیارِ ذوق سے بے اعتنائی برتنا اچھی اچھی کتابوں کو صفِ اول میں جگہ پانے سے باز رکھتا ہے۔

قانونِ مکافات

مؤلفہ: جناب ضیاء الہدیٰ صاحب

شائع کردہ: مکتبۂ دین و دانش۔ کھمنا کنواں۔ بانکی پور، پٹنہ۔

قیمت: نیم مجلد مع گرد پوش ایک روپیہ (صفحات ۵۲)

اس کتاب کا نفسِ مضمون یہ واضح کرنا ہے کہ دنیا میں بھی، اور خصوصاً آخرت میں انسانی اعمال اپنے جو نتائج دکھاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کے تابع ہوتے ہیں۔ مؤلف نے قانونِ مکافات کے

ضروری پہلوؤں سے تعارف کرانے کی جو کوشش کی ہے وہ اسلامی نقطۂ نظر کی مظہر ہے۔ مؤلف کے الفاظ میں اسلام کے واضع کردہ قانونِ مکافات کی تعبیر یہ ہے کہ :-

"انسانی فطرت کا فیصلہ یہی ہے کہ جو امن کا طالب ہو، اسے امن نصیب ہو، جو توڑ پھوڑ اور انتشار میں کوشاں ہو اسے انتشار ہی کے حوالے کر دیا جائے، جو دوسروں کو دکھ پہنچائے اُسے دکھ ملنا چاہیئے، جو دوسروں کا سکون چھینے اس کا سکون سلب ہو جانا چاہیئے جو صلاحیت بہم پہنچائے اسے انتظام سونپ کر سرفراز کیا جائے، جو صلاحیت کھو دے اسے انتظام سے بے دخل کر دیا جائے، جو امانت دار ثابت ہو اسے انعام و ترقی دی جائے اور جو خیانت کرے اسے رسوا کیا جائے"

دو باتیں کتاب کے مطالعے سے محسوس ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ زبان اور اندازِ بیان جدید ذہن کے تقاضوں کے پورے پورے لحاظ پر مبنی نہیں ہے، دوسرے یہ کہ حقائقِ دین کو عقلی رنگ دینے RATIONALISE میں کچھ کچھ مبتدیانہ تفنّن جھلکتا ہے۔ اور کوئی قابلِ اعتراض چیز محسوس نہیں ہوئی۔ مقدمہ ملک نصراللہ خاں صاحب عزیز کے قلم سے ہے۔

ماہنامہ رحیل

زیرِ ادارت : آبادشاہ پوری و عاصی ... رام پوری۔
مقامِ اشاعت : یعقوب خاں روڈ۔ کراچی۔

چندہ سالانہ درج نہیں۔ فی پرچہ ۸ ر۔

یہ نیا رسالہ سلسبیل (لاہور) کا خلف ہے اور خلفِ الرشید ہے۔ رحیل کی ترتیب، اس کے مندرجات اور اس کا ظاہر سلسبیل کے مقابلے میں ترقی یافتہ ہے۔ اسلامی ادب کے محاذ پر یہ نیا سپاہی اپنے جن اسلحہ و فن کے ساتھ آیا ہے، اس کے پیشِ نظر اس سے خاصی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ترقی پسندوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے "چیک بک" یا "رسید بک" کا سا ڈھانچہ اختیار کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ یہ جدت یورپ اور امریکہ میں دورانِ جنگ کے کاغذی قحط کا لحاظ کرتے ہوئے اختیار کی گئی تھی

جس کی نقالی ہمارے بعض ترقی پسند جوانوں نے محض "برائے جدت" کی تھی لیکن رحیل کو اس ترقی پسندی کی کیا ضرورت پیش آئی —— ہمیں اس کا علم نہیں۔

اس ماہ نامے میں روس کے مشہور مفرور عہدے دار کراوت شنکو کی کتاب "میں آزادی کو پسند کرتا ہوں" کا ترجمہ بالاقساط شائع ہو رہا ہے جس سے روس کی دفتری اور عوامی زندگی کا اصل نقشہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔

عزم

مرتبین: محمد انور مسلم سرحدی، بشیر احمد ارشد، ظفر اللہ خاں۔

زیر نگرانی: اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان۔

مقام اشاعت: نزد تھانہ گوالمنڈی، لاہور۔

چندہ سالانہ: پانچ روپے۔ فی پرچہ ۲ر۔

یہ ہفتہ وار جریدہ ان پُرعزم طلباء کا جاری کردہ ہے جو پاکستان کے تخت پر اسلام کو حکمران دیکھنا چاہتے ہیں اور جن کی خواہش یہ ہے کہ انھیں ایسا نظام تعلیم میسر آئے جو انھیں اور ملتِ پاکستان کے تمام نوخیز فرزندوں کو اسلامی ذہنیت اور اسلامی سیرت سے آراستہ کر کے اس قابل بنا دے کہ وہ کل کے "اسلامی نظام" کے لئے اچھے لیڈر، اچھے کارکن، اچھے شہری اور اچھے سپاہی ثابت ہو سکیں۔

یہ صالح فطرت نوجوان اپنے جریدے کے ذریعے اپنے طرز فکر کو دوسرے طلباء تک پہنچانے اور اسلامی قدروں کو کالجوں اور اسکولوں میں ابھارنے کی کوشش کے علاوہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ طلبہ کے حقوق ان کو دلوانے میں مدد کریں، ان کے مطالبات کو کارپردازانِ تعلیم تک پہنچائیں، ان کی تعلیمی اور دوسری مشکلات کو حل کریں اور ان کی ذہانت و قابلیت میں اضافہ کرنے کی مختلف تدبیریں اختیار کریں۔

عزم کے مضامین میں تنوع اور دلچسپی کے عناصر کو بڑھانے کے لئے ابھی اس کے مرتبین کو بہت کچھ کرنا ہے، تاہم یہ جریدہ اس حیثیت سے قدر کا مستحق ہے کہ یہ خود طلباء ہی کا مرتب کردہ ہے جن کی ابتدائی کوششیں آئندہ کے لئے خاصی امیدیں دلاتی ہیں۔ طلباء کے زیر اہتمام کالجوں کے جو میگزین وغیرہ عام طور پر شائع ہوتے ہیں ان میں جس طرح مغربیت کے جراثیم پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے سطحی قسم کی

جو "کا بھی سیاسیات" ان پر اثر انداز ہوتی ہیں، عشق و محبت کی داستان طرازیوں پر مشتمل ادب اور اشتراکیت زدہ شاعری جس طرح ان پر اپنا پرتو ڈالتی ہے، عزم ان سب مفسدات سے پاک ہے اور سنجیدہ سلم طرزِ فکر پر مبنی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عزم نے فی الحقیقت ایک خلا کو پُر کیا ہے۔

دروس القرآن (تین حصے)
مؤلفہ: صوفی نذر محمد صاحب سیال، ایم، اے۔
ملنے کا پتہ: شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور۔

ضخامت ہر سہ حصہ ۲۹۷ صفحات سائز خورد۔ قیمت: ایک روپیہ بارہ آنے۔

عربی سے آشنا ہونے اور قرآن سے قریب تر آنے کے لئے یہ ایک مبارک اور مفید کوشش ہے۔ اس میں عربی قواعد ذہن نشین کرانے کے لئے قرآنی مفرد الفاظ، مرکب جملے اور آیتیں درج کی گئی ہیں۔

تعلیمی نقطۂ نظر سے اس میں کئی غلطیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے۔ مثلاً

(۱) ابتدائی اسباق ہی میں بعض، اجنبی جیسی ثقیل اصطلاحات کا استعمال اور بغیر کسی ترتیب و تدریج کا لحاظ کئے افعال سالم اور غیر سالم پر مشتمل تمرینات کی تفصیل مبتدی کے ذہن کو الجھاؤ میں ڈال سکتی ہے۔

(۲) اس قسم کی ابتدائی تعلیمی کتابوں میں نحو، صرف، لغت اور صحتِ کتابت کا پورا پورا اہتمام ہونا چاہئے تھا لیکن اس کتاب میں یہ کمی پوری طرح نمایاں ہے۔ البیت الخالیہ اور ہذا رجلان جیسی ترکیبیں اس کتاب میں ملتی ہیں۔ اسی طرح مسنون کا ترجمہ "سنت کیا گیا" بالکل مہمل ترجمہ ہے۔ نیز قرآن میں یہ اس معنیٰ میں مستعمل ہی نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حما مسنون کے معنیٰ ہیں "خمیر اٹھایا ہوا گارا"

مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی بھی قابل غور ہیں:۔

مسکونۃ، رہنے کی جگہ مغتسل، غسل کیا ہوا مغاضبا، غضب کیا ہوا۔

تیسرا لفظ لفظاً اور معناً دونوں طرح مسخ ہو گیا ہے۔ اصل میں یہ لفظ مغاضباً بمعنیٰ غضبناک، قرآن میں مستعمل ہوا ہے۔

اس قسم کی لفظی اور معنوی خامیوں کو دور کر دیا جائے تو یہ کتاب نوخیز نسل کو قرآن سے متعارف کرانے میں کافی حد تک ممد و معاون ہو سکتی ہے۔ (ع، غ۔ ح)

مسئلہ ملکیت زمین

- زمین کی شخصی ملکیت از روئے قرآن
- زمین کی شخصی ملکیت از روئے حدیث
- مزارعت کا مسئلہ
- اصطلاح کے حدود اور طریقے

★

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

اچھرہ لاہور (پاکستان)